#

Done

Cat by

OSMANIA UNIVERSITY

معاشی
تاریخ ہند

جلد دوم

سلسلۂ نصابیات علم معاشیات جامعۂ عثمانیہ

معاشی تاریخ ہند

جلد دوم

عہد ملکۂ وکٹوریہ

ملکۂ وکٹوریہ کی تخت نشینی (سنہ ١٨٣٧ عیسوی) سے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک

تالیف

رامیش دت، سی-آئی-ای

ترجمہ

محمد نصیر الدین خاں، ایم-اے (ایڈنبرا)

سنہ ١٣٥٥ھ م سنہ ١٣٤٥ف م سنہ ١٩٣٦ء

از دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدر آباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

[illegible]

عالمگیر قحط سے جیسا اس سے پہلے کبھی نہیں پڑا تھا ملک تباہ و تاراج ہو گیا تھا۔ اس طرح شاہنشاہی کا آباد ترین حصہ ہی شاہنشاہی کی خوش حالی میں شریک نہ تھا۔ انگلستان کی اس سب سے بڑی عملداری ہی میں انگلستان کے پرچم کے نیچے دولت کی فراوانی، صنعت و حرفت کی ترقی اور زراعت کا نشوونما کہیں نہیں ہوا تھا۔

۱۸۹۶ء عیسوی تک یہ قحط باقی رہا۔ ۱۸۹۹ء عیسوی میں کچھ سکون ہوا نہ تھا کہ سنہ ۱۹۰۰ء عیسوی میں پھر قحط رونما ہوا جس سے پہلے سے بھی زیادہ رقبہ متاثر ہوا اور جس کا اثر بھی پہلے سے زیادہ مدت تک باقی رہا۔ یہ بلائے مہیب تین سال تک نہ ٹلی اور لاکھوں آدمی اس سے ہلاک ہوے۔ ہزارہا لوگ ابھی امدادی قیام گاہوں ہی میں پناہ گزیں تھے اور اپنے اپنے گھروں کو واپس نہ ہوے تھے کہ جنوری ۱۹۰۳ء عیسوی میں دہلی دربار منعقد کیا گیا۔

ہندوستان اور شاہنشاہی کے دیگر اقطاع کے درمیان جو معاشی خلیج حائل ہے وہ چند سال سے اور زیادہ عریض ہو گئی ہے۔ کینیڈا اور دیگر نوآبادیات میں وہاں کی آبادی کے لحاظ سے سالانہ آمدنی فی کس (۴۸) پونڈ اور برطانیہ عظمیٰ میں فی کس (۴۲) پونڈ ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں خود سرکار نے اس کا تخمینہ فی کس (۲) پونڈ کیا ہے۔ "برطانوی انجمن" کے گزشتہ جلسے میں ایک بہت بڑے مستند برطانوی ماہر فن معاشیات مسمی سر رابرٹ گفن نے بیان کیا تھا کہ یہ صورت حال برطانوی شاہنشاہی میں ایک نہایت ہی سخت اور دائمی مشکل ہے جس پر رہنمایان قوم کو اسی قدر زیادہ توجہ مبذول کرنا چاہئے جس قدر زیادہ شاہنشاہی اتحاد کا خیال عملی قوت پیدا کر رہا ہے"۔ شاہنشاہی کی ۵/۶ آبادی کے روزافزوں افلاس وانحطاط کی بنیاد پر شاہنشاہی اتحاد کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

اگرچہ قحط بلحاظ اموات بجائے خود ہولناک ہے لیکن یہ اس سے بھی شدید تر خرابی کا پتا دیتا ہے یعنی ہندوستان کی آبادی کا دائمی افلاس جو ہر سال بے قحط سالی کے بھی موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان میں اجناس کی مقدار کبھی کم نہیں ہوئی چنانچہ ۱۸۹۶ء عیسوی اور سنہ ۱۹۰۰ء عیسوی میں بھی اجناس کی مقدار ہندوستان کی جملہ آبادی کی قوت بسری کے لئے کافی تھی۔ لیکن لوگ ایسے نادار اور بے وسیلہ ہیں اور ان کے

پاس اس قدر بھی پس انداز نہیں کہ جب ایک خاص رقبے میں فصل خراب ہو تو وہ قریب کے صوبجات سے جہاں اناج کثیر مقدار میں پیدا ہوئی ہو اپنے لئے اشیائے خوردنی خرید سکیں۔ امساک باراں سے اگرچہ بعض مقامات میں فصلیں برباد ہوجاتی ہیں لیکن شدید قحط تو لوگوں کے افلاس ہی کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔

ہندوستان کے منتظمین مملکت کو ایسے متعدد واقعات معلوم ہیں جو مثال کے طور پر اس مذکورالصدر دعوے کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک واقعے کے اظہار پر قناعت کرتا ہوں۔ تنائیس سال قبل مشرقی بنگال میں ایک شدید قحط پڑا تھا۔ ۱۸۷۶ء عیسوی میں ایک ایسی آندھی اور طوفان آیا کہ اس ملک کا ایک بہت بڑا خطہ غرقاب ہوگیا، کاشتکاروں کے مکان گر گئے اور فصلیں تلف ہوگئیں۔ مقامی نظم ونسق کی ازسرنو تنظیم اور ان خطوں میں جو قحط سے زیادہ متاثر تھے لوگوں کی امداد کی غرض سے مناسب انتظام کرنے کے لئے میں ایک نوجوان عہدہ دار کی حیثیت سے وہاں بھیجا گیا تھا۔ ان اقطاع میں کسان بہت معمولی لگان ادا کرتے تھے اور اسی بنا پر مامون زمانے میں وہ خوش حال رہتے تھے۔ ان کسانوں نے دوراندیشی اور کفایت شعاری سے جو ہندوستان کے کاشتکاروں کا خاصہ ہے سالہائے ماسبق میں کچھ نہ کچھ پس انداز کرلیا تھا۔ اب ان لوگوں نے اس مصیبت کے زمانے میں بھی اپنے ہی پس انداز سے چاول سے لدے ہوئے جہاز کے جہاز خرید لئے وہاں قحط کا اثر نہ عام طور پر پھیلا اور نہ وسیع پیمانے پر امدادی کاموں کے آغاز کی ضرورت ہوئی۔ ان کسانوں کو خوش حال و ذی مقدرت اور خود امداد دیکھکر مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ اگر عام طور پر ہندوستان کے تمام کاشتکار ایسے خوش حال ہوتے جیسے مشرقی بنگال کے کسان تھے تو پھر ہندوستان میں خرابی فصل کے باوجود قحط نادرالوقوع ہوجاتا۔ لیکن بمقابل مشرقی بنگال کے مغربی بنگال میں پیداوار کے تناسب کے لحاظ سے لگان زیادہ ہے اور بنگالے کے مقابل مدراس اور بمبئی میں نیز ملک کے دیگر اقطاع میں محصول اراضی بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے وہاں کے باشندے بھی مقابلتہً کم مقدور ہیں، وہاں قحط بھی زیادہ پڑتے ہیں اور نسبتہً زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رعایا کا افلاس قحط کی شدت میں، اور

اضافہ کر دیتا ہے۔

قومی تموّل کے ذرائع زراعت، تجارت، صنعت وحرفت اور صحیح مالیاتی نظم ونسق ہی ہے۔ برطانوی حکمرانی نے ہندوستان میں امن تو قائم کیا لیکن قومی تموّل کے ان ذرائع کو نہ ترقی دی اور نہ اُن میں وسعت ہی پیدا کی۔

تجارت اور صنعت کے متعلق مجھ کو یہاں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ میں نے اپنی دوسری کتابت میں جس کا نام "ابتدائی برطانوی حکومت ہند" ہے ہندوستان کے متعلق برطانیۂ عظمیٰ کی تجارتی حکمت عملی کا جو اٹھارھویں صدی عیسوی اور انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں رہی ہے خاکہ کھینچا ہے۔ یہ حکمت عملی وہی تھی جس کو برطانیہ عظمیٰ نے اسی زمانہ میں آئرلینڈ اور اپنی نوآبادیات کے متعلق بھی اختیار کیا تھا۔ ہندوستانی مصنوعات کو موقوف کرنے اور برطانوی مصنوعات کو فروغ دینے کی جو انتھک کوششیں کی گئیں وہ ہندوستان کی حد تک مہلک طور پر کامیاب ہوئیں۔ امتناعی محصولات سے ہندوستانی مال کی یورپ میں درآمد موقوف کر دی گئی اور برطانوی مال پر برائے نام محصول لگا کر ہندوستان میں اُس کی برآمد میں اضافہ کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی گئی۔ انگلستان کی اس ابتدائی تجارتی حکمت عملی کے دو مقصد تھے: ایک برطانوی حرفت کے لئے ہندوستان میں خام اشیا کی پیداوار میں اضافہ کرنا۔ دوسرے، ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کو رواج دینا۔ مورّخ ہاریسن ہیمین ولسن کے الفاظ میں، "برطانوی صناعوں نے ایسے حریف تجارت کو جس سے وہ مساوی شرائط پر جیت ہی نہیں سکتے تھے مغلوب کرنے اور آخر کار اُس کا گلا گھونٹ دینے میں سیاسی ناانصافی کے زور بازو سے کام لیا"۔

۱۸۳۷ء عیسوی میں جب ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئیں اس وقت بڑی حد تک تخریب ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اس حکمت عملی میں جس پر پہلے سے عمل کیا جا رہا تھا کبھی سُستی نہیں کی گئی۔ چونکہ اس زمانے میں بھی ہندوستانی ریشمی رومال یورپ میں برابر فروخت ہوتے تھے اس لئے ہندوستانی ریشمینوں پر سنگین محصول علی حالہ قائم تھا۔ پارلیمنٹ نے یہ تو دریافت کیا کہ برطانوی کارگاہوں کے لئے ہندوستان میں روئی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ دریافت نہ کیا کہ ہندوستانی

کارگاہوں کی ترقی و اصلاح کس طرح ممکن ہے۔ متعدد مجالس منتخبہ نے یہ معلوم کرنے کی پے در پے کوشش کی کہ برطانوی مصنوعات کو ہندوستان میں کس طرح رواج دیا جاسکتا ہے لیکن یہ معلوم کرنے کی زحمت نہ کی کہ ہندوستانی مصنوعات میں کیونکر پھر سے جان ڈالی جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۸ء عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم ہونے سے بہت پہلے ہی ہندوستان کوئی بڑا صنعت گر ملک نہ رہا تھا اس وقت قوم کے لئے بسر اوقات کا ذریعہ ایک زراعت ہی رہ گئی تھی۔

۱۸۵۸ء کے بعد بھی ہندوستان کا نرخنامہ محصول برطانوی تاجروں ہی کی زیر نگرانی و اثر تھا۔ محصول درآمد میں تخفیف کردی گئی تھی جس سے ہندوستان میں برطانوی مال درآمد کرنے میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی تھی۔ بمبئی کی کارگاہوں اور کارخانوں کی ترقی پر حاسدانہ نظریں پڑ رہی تھیں۔ ۱۸۷۹ء میں جس وقت کہ ہندوستان کے سر پر قحط، جنگ و جدل اور کمی محاصل کے باعث آفتوں پر آفتیں نازل ہو رہی تھیں پارلیمنٹ نے محصولات درآمد کی قربانی کا مطالبہ کیا اور ۱۸۸۲ء میں بہ استثناء محصول نمک و شراب جملہ محصولات درآمد کو یک لخت موقوف کر دیا گیا۔

ان قربانیوں کا مضر اثر ہندوستان کے محاصل پر بھی پڑا۔ کاشتکاروں پر جدید محصول لگانے اور زراعت پر اس طرح ایک سنگین بار ڈالنے کے باوجود ہندوستان اپنا خرچ آپ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں سابقہ محصولات درآمد خفیف ترمیم کے بعد پھر عائد کر دئے گئے۔ سوتی مال نیز سوت اور سوتی دھاگے کی ہندوستان میں درآمد پر (۵) فی صدی محصول لگا دیا گیا اور اس کے ساتھ توازن قایم کرنے کے لئے ایسے ہندوستانی سوتی کپڑوں پر جن کا مال درآمد کے ساتھ تجارتی مقابلہ تھا (۵) فی صدی محصول عائد کر دیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں سوت اور سوتی دھاگے کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا گیا لیکن ہندوستان میں سوتی مال کی درآمد پر ½ ۳ فی صدی محصول اور ہندوستانی گرنیوں کے بنے ہوئے سب قسم کے مال پر ½ ۳ فی صدی محصول چنگی لگا دیا گیا۔ موٹے کپڑوں پر جن کا لینکیشائر کے مال کے ساتھ کچھ مقابلہ نہ تھا اور مہین پارچوں پر بھی محصول عائد کر دیا گیا۔ شکستہ حال ہندوستانی مزدور کے معمولی لباس پر بھی (جس کی روزانہ آمدنی ڈھائی پنس سے بھی کم ہے) بدگمان حکومت نے

محصول لگا دیا۔ بمبئی کی نوخاستہ گرنیوں کی حرفت کو امداد و تقویت دینے کے عوض اُس پر بھی محصول چنگی لگایا گیا جیسا دنیا کے کسی اور متمدن حصے میں کہیں نہیں پایا جاتا ہے اور اس طرح محصول لگاکر اس حرفت کو سرے سے میٹ دیا گیا۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کی تجارتی حکمت عملی کی تشکیل ہندوستانی صناعوں کے مفاد پر نہیں بلکہ برطانوی صناعوں کے اغراض پر مبنی رہی ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں جو پرتگالی، ڈچ، عرب اور برطانوی تجّار ہندوستانی مصنوعات کثیر مقدار میں برآمد کرتے تھے اب وہ بات کہاں رہی تھی آج کل ہندوستان کی برآمد صرف خام پیداوار رہ گئی ہے اور وہ بھی زیادہ تر لوگوں کے اشیائے خوردنی ہی پر مشتمل ہے۔ قومی آمدنی کے ذرائع کی حیثیت سے صنعت و حرفت کا میدان تنگ ہو گیا ہے۔

اب ایک رہی سہی زراعت ہی ہے۔ برطانوی حکمرانی کے تحت ملک میں امن قائم ہوا اور جان و مال کی حفاظت بھی ہوتی ہے جس سے کاشت میں بہت کچھ توسیع ہو گئی ہے۔ لیکن جو شخص کاشتکاروں کی اندرونی زندگی سے واقف ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ توسیع کاشت سے رعایا بھی زیادہ خوش حال، بڑی ذی مقدرت اور قحط کے اثرات سے زیادہ محفوظ ہو گئی ہے۔

ہندوستان کے نظم و نسق کی تاریخ گہری دلچسپی رکھتی ہے کیونکہ اس کا ایک زرعی قوم کی مادّی فلاح و بہبود سے بڑا قریب کا تعلق ہے۔ برطانوی حکمرانی کے ابتدائی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو ایک بڑی جاگیر یا نخلستان تصور کرتی تھی اور مامون زمانے میں بھی کاشتکاروں اور مالکان اراضی کے لئے بقدر قوتِ لایموت کے کچھ چھوڑ کر اراضی کی تمام باقی پیداوار کا اپنے آپ ہی کو مستحق سمجھتی تھی۔ جب یہ حکمت عملی محاصل کے نقطۂ نظر سے کمپنی کے حق میں مضر ثابت ہوئی تو اُس وقت اس میں اصلاح ضروری خیال کی گئی۔ پھر کمپنی نے بھی یہ تسلیم کر لیا کہ زمینداروں کے طبقے کو یہ یقین دلانا کہ آیندہ زراعت کا متوقعہ منافع انھیں کو ملے گا بڑی دانشمندی کی بات ہے۔ اسی بناء پر ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے بنگال میں مالگزاری کا دوامی بندوبست کر دیا جس میں اگرچہ زمینداروں سے اُن کی آمدنی

مالگزاری کے (۹۰) فی صدی کا مطالبہ کیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کو اُس کا بھی یقین دلایا گیا کہ آیندہ اس مطالبے میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کا مطالبہ مذکورالصدر تناسب کے لحاظ سے بے حد سنگین تھا لیکن ۱۷۹۳ء سے کاشت اور آمدنی مالگزاری میں بہت کچھ اضافہ ہوا تھا جس سے کسان اور زمیندار دونوں مستفید ہوئے تھے۔ حالیہ زمانے میں بنگال کے زراعت پیشہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے کاشتکاروں کی بہ نسبت قحط وغیرہ کے بدترین اثرات سے زیادہ محفوظ ہیں۔

اسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمت عملی میں تغیّر ہوا۔ کمپنی کو اب دوسرے صوبوں میں دوامی بندوبست کرنا منظور نہ تھا۔ اس نے آمدنی مالگزاری کا ایک معقول حصہ اپنے لئے مقرر کر لینے کی کوشش کی جس سے یہ مطلب تھا کہ اگر آیندہ آمدنی مالگزاری میں اضافہ ہو تو ساتھ ہی ساتھ اُس کے محاصل میں بھی اضافہ ہو جائے۔ کمپنی نے شمالی ہند میں اپنا مطالبہ پہلے تو آمدنی مالگزاری کا (۸۳) فی صدی مقرر کیا بعد کو (۷۵)، فی صدی اور پھر (۶۶) فی صدی مقرر کر دیا۔ لیکن اس تخفیف کے بعد بھی اتنی زیادہ رقم ناقابل وصول ثابت ہوئی اس لئے آخر کار ۱۸۵۵ء عیسوی میں مطالبۂ سرکار آمدنی مالگزاری کے (۵۰) فی صدی تک محدود کر دیا گیا (اور یہی قاعدہ مقرر کیا گیا جس کو ۱۸۶۴ء میں جنوبی ہند میں بھی نافذ کیا گیا) کاشت منافع پر (۵۰) فی صدی محصول آمدنی کا لگا دینا ایک ایسا بار سنگین ہے کہ کسی ملک میں بھی ایک متمدن وشائستہ حکومت کے تحت ایسا نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس کے باوصف اگر اس حد سے بڑھے ہوئے مطالبے سے آیندہ تجاوز نہ کیا جائے تو ہندوستان کا اس میں بھی فائدہ ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ۱۸۵۸ء میں ختم ہوئی۔ تاج برطانیہ کے تحت پہلے پہل جو والسرائے مقرر ہوئے تھے اُن کی سچی خواہش یہی تھی کہ ہندوستان میں زرعی خوش حالی کو عروج دیا جائے اور زرعی تموّل کے ذرائع وسیع کئے جائیں۔ سر چارلس وڈ اور سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ کے سے مدبّروں اور لارڈ کیننگ اور لارڈ لارنس کے سے حکمرانوں نے اس مقصد کے حصول میں بڑی عرق ریزی کی تھی

ان کی خواہش یہی تھی کہ اراضی پر مطالبۂ سرکار کی مقدار معین کر دی جائے۔ قوم خوش حال ہو جائے۔ اور ایک ایسا طاقتور اور وفادار متوسط طبقہ پیدا کیا جائے جو اپنے اغراض و مفاد کی خاطر ہندوستان میں برطانوی حکومت سے وابستہ رہے۔ اگر ان مشاہیر کی اس صحیح حکمت عملی کو اختیار کیا جاتا تو اس سے قومی تموّل کے ایک ذریعے میں وسعت پیدا ہو جاتی۔ آج قوم بھی زیادہ ذی مقدرت اور خود اعتماد بن جاتی اور قحط بھی نادر الوقوع ہو جاتے۔ لیکن ان ملازمین تاج برطانیہ کی پہلی پشت گزر جانے کے بعد قوم کو خوش حال بنانے کی کوششیں کمزور ہو گئیں۔ شاہنشاہی کے آغاز کے ساتھ ساتھ محاصل و مصارف میں توفیر کرنے والے امور میں انہماک شروع ہو گیا۔ کیننگ اور لارنس کے تجاویز ۱۸۸۳ء میں بالکل نظر انداز ہو گئے۔

دو مختلف الخیال منتظمین مملکت کے فرقوں کے دو مہتمم اصول تو قارئین صاف طور پر بیشک سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ لارڈ کیننگ، لارڈ لارنس، لارڈ ہیلیفکس اور لارڈ اڈزلی اس فرقے کے پیرو تھے جو مالگزاری کا دوامی بندوبست کرنے کا حامی تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ (۱) ہندوستان میں تمام زمین قوم ہی کی ملک تھی نہ کہ زمینداروں یا مالکان اراضی کی (۲) ہر کاشتکار اپنی مقبوضہ اراضی کا موروثی حقدار تھا۔ (۳) مالگزاری کے دوامی تعین سے صرف زمیندار طبقے ہی کو نہیں بلکہ کل زرعی قوم کو فائدہ پہنچتا تھا۔ دوسرے فرقے کے پیرو یہی چاہتے تھے کہ متوالی بندوبست اسے جس کے سرانجام میں عہدہ داران بندوبست اپنے اختیار تمیزی سے مطالبۂ سرکار میں عموماً اضافہ کر دیتے تھے مملکت کے لئے مالگزاری میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

مارکوئیس رپن نے جو ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا ان دونوں فرقوں کے آراء کا تضاد مٹانے کے لئے باہمی رفع واد کے طور پر ایک استادانہ تجویز پیش کی۔ اس نے ایک طرف تو یہ تسلیم کر لیا کہ عام قیمتوں میں اضافہ ہونے کی مقررہ اور واجبی بناء پر مطالبۂ مالگزاری میں ہر وقت اضافہ کرنے کا سرکار کو حق حاصل ہے اور دوسری طرف اس نے کاشتکاروں کو اس بات کا بھی یقین دلایا کہ جب تک عام قیمتوں میں اضافہ نہ ہو مطالبۂ سرکار میں ہرگز اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اس نے سرکار کو یہ یاد کرایا کہ اگر ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہو

جس کا ثبوت قیمتوں میں اضافہ ہے تو اس کے ساتھ ساتھ سرکار کے محاصل میں بھی اضافہ ہوجائے گا اور کسانوں کو یہ یقین دلایا کہ مطالبۂ سرکار کی مقدار دوامًا معین رہے گی کیونکہ ہمیشہ کھیتوں کی پیداوار کا صرف ایک حصۂ متناسبہ بشکل محصول اراضی لیا جائے گا۔ لارڈ رپن کے اس منصوبہ میں بڑی خوبی کے ساتھ دونوں باتیں آگئی تھیں، ایک تو حقوق سرکار کی حفاظت دوسرے تحفظ حقوق کاشتکار، جس کے بغیر دنیا کے کسی حصے میں بھی زراعت سرسبز نہیں ہوسکتی۔ لیکن لارڈ رپن نے دسمبر ۱۸۸۴ء میں ہندوستان سے اپنے وطن کو مراجعت کی اور اس تصفیے کو وزیر ہند نے جنوری ۱۸۸۵ء میں مسترد کردیا۔ یہ رفع دادباہمی ہندوستان کے سالہاسال کے تفکر و تجسس کا نتیجہ تھی اور اس کو وائیٹ ہال (محکمۂ وزیر ہند) نے یوں مسترد کردیا۔ اس طرح ایک زراعت پیشہ قوم غیر معین مطالبۂ سرکار کا جو زراعت کی کامیابی کے لئے قطعی مہلک تھا دوبارہ شکار بن گئی۔

نصف لگان کا قاعدہ تو قائم رہا لیکن اس کی حیثیت ایک نظریے سے بڑھ کر نہ تھی اور عمل ہمیشہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے مصارف سے ہندوستان کی مالیاتی ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی تھی اور اقتضائے وقت بھی یہی تھا کہ مزید محصول لگائے جائیں۔ برطانوی تاجروں اور برطانوی اصحاب رائے کی مرضی کے خلاف تجارت پر کوئی محصول نہیں لگایا جاسکتا تھا اس لئے مزید محصول کا بار زراعت ہی پر ڈالا گیا چنانچہ ۱۸۷۱ء سے اراضی پر مالگزاری کے علاوہ متعدد جدید محصول عائد کردیئے گئے تھے۔ اگر مالگزاری اس نوعیت کی جملہ آمدنی اراضی کی (۵۰) فی صدی تھی تو اراضی پر جملہ محصول بشمول محصول جدید آمدنی مالگزاری کا (۵۶) یا (۵۸) حتیٰ کہ (۶۰) فی صدی ہوگیا تھا۔ اور اہل ہند یہی پوچھ رہے تھے کہ جب کہ زراعت پر مزید بار عائد کرکے مقررہ حد سے یوں تجاوز کیا جاتا ہے تو پھر محصول اراضی کے محدود کرنے کا منشا کیا ہے؟

۱۸۷۵ء میں مارکوئیس سالسبری وزیر ہند کے عہدے پر مامور تھا۔ اُن معاملات پر نظر کرتے ہوئے جن پر وہ توجہ مبذول کرتا تھا اُس کی ژرف نگاہی اور بصیرت کا ہر شخص معترف ہے۔ اُس نے ۱۸۷۵ء میں اپنی وہ مشہور یادداشت قلمبند کی جس میں اس نے ہندوستانی یک طرفہ مالی حکمت عملی کی کمزوریاں بتا کر اُس نے اس کی

بڑی مذمت کی تھی۔ اس یادداشت سے لوگ اکثر اقتباسات پیش کرتے رہتے ہیں۔ اُس نے لکھا تھا کہ "جہاں تک ہندوستان کے مالیاتی نظام میں تغیر ممکن ہے یہی مناسب ہوگا کہ جملہ قومی مطالبے کا کمتر حصہ کاشتکار ادا کریں۔ یہ حکمت عملی بجائے خود کفالیت شعاری پر مبنی نہیں کہ اضلاع سے جہاں اصل کم یاب ہے محاصل کثیر مقدار میں وصول کئے جائیں اور شہروں کو جہاں اصل نہ صرف بکثرت موجود ہے بلکہ تعیّش میں ضائع کی جاتی ہے یونہی چھوڑ دیا جائے۔ ہندوستان کے لئے جہاں اس قدر محاصل بے معاوضہ بیرون ملک ارسال کئے جاتے ہیں یہ صورت حال اور بھی ضرر رساں ہے۔ اگر ہندوستان کی فصد ہی کھولنا ہو تو نشتر کو جسم کے ایسے حصے پر لگانا چاہیئے جہاں بہت خون جمع ہو یا کم سے کم کافی مقدار میں موجود ہو نہ کہ ایسے حصے پر جو خون کی قلت کی وجہ سے خود کمزور ہو۔"

لارڈ سالسبری کے اس انتباہ پر کسی نے توجہ ہی نہ کی۔ جب وقت سے کہ روپیہ کی شرح مبادلہ ایک شلنگ چار پنس مقرر کی گئی ہے ہم یہی سن رہے ہیں ہر سال موازنے میں محاصل میں اضافہ اور فاضلات ہی ہو رہے ہیں لیکن اس کے باوجود اس ظاہری خوش حالی سے فائدہ اٹھا کر مزارعین کے کاندھوں کا بوجھ کبھی ہلکا نہیں کیا گیا۔ ۱۸۷۱ء سے اراضی پر مالگزاری کے علاوہ جو مختلف محصول لگائے گئے تھے اُن میں سے ایک کو بھی منسوخ نہیں کیا گیا۔

ان واقعات سے جن کو میں نے ممکنہ اختصار کے ساتھ اوپر بیان کیا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زراعت میں قومی آمدنی کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے برطانوی نظم و نسق کے تحت کوئی وسعت نہیں پیدا کی گئی تھی۔ اُن مقامات کے علاوہ جہاں مالگزاری کا دوامی تعیّن ہو چکا تھا ہر جگہ بیس یا تیس سال کے بعد ہر تجدید بندوبست کے وقت مالگزاری پر نظر ثانی کر کے اُس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ بظاہر آمدنی مالگزاری یا معاشی لگان کا (۵۰) فی صدی وصول کرنا ہی بیان کیا جاتا ہے لیکن بمبئی اور مدراس میں درحقیقت اس سے بھی بڑھ کر وصول کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اراضی پر ایسے مختلف محصول عائد کئے گئے ہیں جن میں مملکت خاطر خواہ اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اس طرح محصول اراضی کی مقدار بے انتہا سنگین اور غیر معیّن ہے خواہ کوئی ملک کیوں نہ ہو اگر وہاں ایسے

قواعد زیر عمل رہیں تو زراعت پر انحطاط کا چھا جانا لازمی ہے۔ ہندوستان کے کاشتکار بڑے کفایت شعار، جفاکش اور صلح پسند ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ مفلوک الحال، بے وسیلہ، قحط زدہ اور فاقہ کش ہی رہتے ہیں۔ یہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر انگریز از روئے انصاف فخر کر سکیں۔ یہی صورت آئرلینڈ میں بھی درپیش تھی جس کی اصلاح کے انگریز درپئے تھے۔ اگر انگریز ایک دفعہ اس صورت حال کو سمجھ جائیں تو پھر وہ ہندوستان میں اس کے ہرگز روادار نہ ہوں گے۔

اگر اب ہم ذرائع تموّل کے موضوع کو چھوڑ کر تقسیم دولت اور ہندوستان کے مالیاتی نظام کی طرف متوجہ ہوں تو ہماری نظروں کے سامنے وہی دل آزار تصویر پھر جاتی ہے۔ ملکۂ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے آخری دس سال یعنی سنہ ۹۲-۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۹۰۰-۰۱ء تک کے ہندوستان کے جملہ محاصل چھ سٹھ کروڑ ستر لاکھ پونڈ ہوئے تھے۔ اس حساب سے سالانہ اوسط محاصل بشمول آمدنی ریلوے و آبپاشی و جملہ دیگر مدّات ساڑھے چھ کروڑ پونڈ ہوتے ہیں۔ اسی دہ سالہ مدّت میں انگلستان میں پندرہ کروڑ نوّے لاکھ پونڈ ہندوستان کے خرچ ہوئے تھے جس کا سالانہ اوسط ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ ہوتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کے جملہ محاصل کا ایک ربع بشکل مطالبات وطن ہر سال انگلستان ارسال کیا جاتا تھا۔ اگر اس میں اس رقم کو بھی شامل کر لیا جائے جو ہندوستان کے یورپی عہدہ دار اپنی تنخواہوں سے پس انداز کر کے ہر سال انگلستان ارسال کرتے تھے تو پھر ہندوستان سے جو بیے سیم و زر کا سالانہ بہاؤ دو کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ تھا۔ دنیا کا سب سے زیادہ متموّل ملک دنیا کے سب سے زیادہ افلاس زدہ ملک سے ہر سال ایک ایسا خراج وصول کرتا تھا جو اس کے شایان شان نہ تھا۔ وہ ملک جس کے ہر فرد کی آمدنی (۴۲) پونڈ ہے دس شلنگ فی کس ایک ایسی قوم سے وصول کرتا ہے جس کے افراد کی آمدنی صرف (۲) پونڈ فی کس ہوتی ہے۔ برطانوی قوم جو یہ دس شلنگ فی کس ہندوستان سے وصول کرتی ہے اُس سے ہندوستانی اور زیادہ مفلس و نادار بن جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ساتھ جو برطانوی تجارت قائم ہے اس میں بھی انحطاط پیدا ہو جاتا ہے اس خراج سے برطانوی خارجی اور داخلی تجارت کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور مُفت ہی مفت میں اس سے ہندوستان کی

رگِ جاں سے خون بہا چلا جاتا ہے۔

اگر محصول اسی ملک میں خرچ کئے جائیں جہاں وہ وصول کئے جاتے ہیں تو اس سے روپیہ اہل ملک ہی میں گشت کرتا رہے گا۔ تجارت کو تقویت اور حرفت و زراعت کو ترقی ہوگی اور یہ روپیہ ایک نہ ایک شکل میں عامتہ الناس تک پہنچ جائے گا لیکن محصول جس ملک میں وصول ہوں اگر اُن کا روپیہ بیرون ملک ارسال کر دیا جائے تو پھر یہ روپیہ اس ملک سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے گا ایسی ارسال سے نہ تو ملک کی تجارت و حرفت کو ترقی ہوتی ہے اور نہ یہ روپیہ کسی شکل میں بھی عامتہ الناس تک پہنچتا ہے۔ ہندوستان کے محاصل سے دو کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ رقم ہر سال بیرون ملک ارسال کی جاتی ہے اور دراصل یہ ایک معجزہ ہوگا اگر اس طرح کا عمل جس کا تسلسل برسوں تک رہے دنیا کی متموّل سے متموّل قوم کو مفلس و نادار نہ بنا دے۔

لسنہ ۱۹۰۰ ۶ میں ہندوستان کے جملہ محاصل ایک کروڑ چھتر لاکھ پونڈ اور جملہ مطالبات وطن ایک کروڑ ستّر لاکھ پونڈ ہوئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی اراضی سے جتنی آمدنی ہوتی ہے وہ تمام و کمال بشکل مطالبات وطن ہر سال بیرون ملک ارسال کر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یورپی عہدہ دار بھی جن کی تنخواہیں ہندوستان کے محاصل سے ادا ہوتی ہیں اپنی طرف سے لکھوکھا روپیہ بیرون ملک ارسال کرتے ہیں اور جتنا جتنا یورپی عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اُتنا اُتنا اس رقم میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

مطالبات وطن کی شکل میں جو ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ انگلستان ارسال کئے گئے تھے وہ حسب ذیل مدّوں میں صرف ہوئے تھے: (۱) ہندوستانی قرض بر واجب الادا سود (۲) ریلوں کے اصل کا سود (۳) دیوانی اور فوجی مطالبات۔ منجملہ ہو خرالذکر مطالبات کے فوجی اور دیگر ساز و سامان کی سربراہی میں اس رقم کا ایک خفیف حصہ یعنی صرف دس لاکھ پونڈ صرف ہوئے تھے۔

اس ملک میں عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ ہندوستان کا جملہ قرض و بہ دوسرے الفاظ میں درحقیقت وہ برطانوی اصل ہے جو ہندوستان کے نشو و نما میں صرف کیا گیا تھا۔ لیکن اس کتاب میں یہ ثابت کر کے دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے

سرکاری قرض کی بنا یہ نہیں ہے۔ ۱۸۵۸ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی حکمراں نہیں رہی تھی تو اس وقت ہندوستان کا قرض سات کروڑ پونڈ ہو چکا تھا۔ اس اثنا میں کمپنی بھی پندرہ کروڑ پونڈ سے زیادہ رقم جس میں اُس کا سود شامل نہ تھا بطور خراج ہندوستان سے وصول کرچکی تھی جو بالکل انصاف کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ متعدد جنگوں، مثلاً جنگ افغان و جنگ چین اور دوسری اسی قبیل کی جنگ وجدل کے مصارف کا جو بیرون ملک وقوع پذیر ہوئی تھیں بارگراں ہندوستان ہی کے سر ڈالا گیا تھا۔ ان وجوہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کمپنی کی حکمرانی کے ختم پر از روئے انصاف کسی کا مقروض نہ تھا۔ اُس کا سرکاری قرض محض ایک بے بنیاد افواہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس طرح منجملہ اُس رقم کے جو ہندوستان سے وصول کرلی گئی تھی دس کروڑ پونڈ کی معتد بہ رقم دراصل خود انگلستان پر فاضل نکلتی تھی۔

تاج برطانیہ کے نظم ونسق کے ابتدائی اٹھارہ سال میں ہندوستان کا سرکاری قرض دوچند ہوگیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جب ملکۂ وکٹوریہ نے قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کیا اُس وقت یہ قرض چودہ کروڑ پونڈ تھا۔ اُس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۵۷ء کی لڑائیوں کے مصارف جو چار کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ ہوے تھے ہندوستان کے محاصل میں محسوب کردیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۶۷ء میں جو جنگ ابی سینیا ہوئی تھی اس کے مصارف کے بہت بڑے حصے کو بھی ہندوستان ہی کو ادا کرنا پڑا تھا۔

۱۸۷۷ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان سرکاری قرض تیرہ لاکھ نوّے ہزار پونڈ سے بائیس لاکھ چالیس ہزار پونڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ملک کی ضرورتوں سے زیادہ اور اُس کے مقدور سے بڑھ کر ایسی کمپنیوں کے ذریعے سے جن کے منافع کی خود سرکار کفیل تھی ریلوں کی تعمیر کرائی گئی تھی اور خود سرکار نے بھی براہ راست ان کی تعمیر کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ ۱۸۷۷ء اور ۱۸۹۷ء کی جنگ افغان تھی۔ ہندوستانی قرض کی سرگزشت مالیاتی بے دانشی اور ناانصافی کی ایک دل خراش داستان ہے۔ ہر غیر جانب دار شخص اپنے لئے اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اس ہندوستانی قرض کا کتنا حصہ ہندوستان پر واجب الادا ہے۔

مطالبات وطن کی آخری مَدین دیوانی اور فوجی مطالبات ہیں۔ ان پر

نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اگر برطانوی شاہنشاہی ہند کی تعمیر میں برطانیہ اور ہندستان دونوں کا نفع ہے تو پھر یہ عدل و انصاف کے خلاف ہوگا کہ اس عظیم الشان عمارت کو برقرار و مستحکم رکھنے کے جملہ مصارف اکیلا ہندوستان ادا کرتا رہے۔ یہ کونسا انصاف ہے کہ انگلستان میں جتنے مصارف لاحق ہوں حتیٰ کہ دفتر وزیر ہند کی مرمت وغیرہ کے اخراجات اور وائیٹ ہال کے کمرے صاف کرنے والی عورتوں کی مزدوری بھی ہندوستان ہی ادا کرے؟ چالیس سال قبل ہندوستان کے ایک بہت بڑے منتظم مملکت نے رفع داد باہمی کے طور پر ایک منصفانہ تجویز پیش کی تھی۔ سر جورج ونگیٹ نے اپنی کتاب میں جو "ہندوستان کے ساتھ ہمارے مالیاتی تعلقات" Our Financial Relations With India کے نام سے موسوم ہے اور جو ۱۸۵۹ء میں شایع ہوی تھی یہ تحریک کی تھی کہ ہندوستان کو دیوانی اور فوجی نظم و نسق کے وہ جملہ مصارف جو ہندوستان ہی میں عائد ہوں ادا کرنا چاہئے اور انگلستان کو وہ تمام اخراجات جو انگلستان میں عائد ہوں ادا کرنا چاہئے جیسا وہ اپنی نوآبادیات کیلئے کرتا ہے کیا اب اس طرح کا کوئی منصفانہ تصفیہ کرنا بعد از وقت ہوگا؟ ہندوستان کے جملہ دیوانی اور فوجی مصارف جو انگلستان میں عائد ہوتے ہیں ساٹھ لاکھ پونڈ ہیں اور اگر یہ رقم برطانوی محصول دینے والے ادا کریں تو اس میں بہت بڑی تخفیف کا امکان ہے۔ کیا انگلستان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس بار کو برداشت کرلے گا کوئی بڑی بات ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ ہندوستان وہ تمام دیوانی اور فوجی مصارف جو ہندوستان میں عائد ہوں خود ادا کرے گا؟

ہندوستان کی جو معاشی حالت ہے اُس کے سیدھے سادھے واقعات یہی ہیں۔ ان حالات میں خواہ دنیا کا کوئی کیسا ہی سرسبز، جفاکش اور صلح پسند ملک ہی کیوں نہ ہو ویسا ہی بن جائے گا جیسا آج ہندوستان نظر آرہا ہے۔ اگر مصنوعات اُٹھا پڑے ہوں، زراعت پر بے اندازہ محصول لگا دیا جائے اور محاصل کا ایک ثلث بیرون ملک ارسال ہوتا رہے تو دنیا کی خواہ کوئی قوم ہی کیوں نہو وہ دائمی افلاس اور مسلسل قحط کے مصائب سے ہرگز نہیں بچ سکتی۔ معاشی قوانین جو یوروپ میں ہیں وہی ایشیا میں بھی ہیں۔ اگر آج ہندوستان افلاس زدہ ہے تو انھیں معاشی اسباب

وعلل کی بناء پر ہے۔ اگر ان حالات کے باوجود ہندوستان سرسبز وشاداب بنے تو یہ ایک معاشی معجزہ ہوگا لیکن سائنس معجزات کو تسلیم ہی نہیں کرتا یہ معاشی قوانین اپنے عمل اور اثر میں دائمی اور بالکل غیر متغیر ہیں۔

ان خرابیوں کا علاج خود ان خرابیوں کی نوعیت سے عیاں ہے۔ ہندوستان کی گرہنیوں کے مصنوعات پر محصول چنگی موقوف کر دینا چاہئے۔ ہندوستان کی حکومت پر لازم ہے کہ وہ اہل ہند کی فلاح وبہبود کی خاطر ہمت کر کے ہندوستان کی حرفت کی پشت پناہ بنے جیسا دنیا کی ہر متمدن وشائستہ حکومت اپنے ملک کی حرفت کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ اراضی پر مالگزاری کے سوا جتنے محصول ہیں ان سب کو ایک لخت مسدود کر دے اور مالگزاری کی کارروائی بھی مبنی بر اعتدال اور بہت ہی منتظم کر دی جائے۔ سرکاری قرض جس کا آغاز ناانصافی پر مبنی تھا اب ایک امر مسلمہ ہے لیکن اگر اب اس قرض کے لئے شاہنشاہی اپنی ضمانت دے تو اس کی شرح سود میں تخفیف ہو سکتی ہے اور ذخیرۂ تادیہ سے اس کی مقدار میں بھی بتدریج کمی ہو سکتی ہے۔ جملہ دیوانی اور فوجی مصارف کو جو انگلستان میں عائد ہوں یا کم سے کم ان کے ایک جزو کو برطانیہ عظمیٰ برداشت کرے جیسا وہ اپنی نوآبادیات کے لئے کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کو زیادہ تعداد میں سرکاری خدمات دے کر ہندوستان کے دیوانی مصارف میں تخفیف کرے۔ ہندوستان میں فوجی اخراجات کو پوری قوت اور نہایت سختی کے ساتھ روکے اور ہندوستان کے محاصل سے اتنی ہی فوج کے مصارف ادا کرے جتنی فوج اس کی ضرورتوں کے لئے کافی ہے۔ سرکاری قرض سے یا سرکاری طور پر محصولات کی آمدنی سے سود کی کفالت کر کے آیندہ ریلوں میں توسیع کرنے کی ممانعت کر دے۔ حتیٰ الامکان معمولی محاصل ہی سے ذرائع آبپاشی کو توسیع دے۔ ہندوستان سے جو معاشی جوئے سیم وزر جاری ہے اس کی روانی میں مستقل طور پر کمی کر دے۔ ان مالیاتی اصلاحات پر عمل کرتے وقت اہل ہند کے نمایندوں کو بھی اپنا شریک کرے اور ان سے مشورہ لے کیوں کہ ہر ملک میں محصول دینے والوں ہی کو تخفیف مصارف سے خاص دلچسپی رہتی ہے۔

جان اسٹوارٹ مل نے لکھا ہے کہ "قوم کی حکومت بجائے خود ایک معنی اور حقیقت رکھتی ہے لیکن یہ بات کہ ایک قوم کی حکومت دوسری قوم کرے اس کا نہ کہیں وجود ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے ذاتی اغراض کے لئے رکھ سکتی ہے جیسے روپیہ پیدا کرنے کا کوئی مقام ہو یا آدمیوں کے گلوں کے لئے ایک مرغزار جو وہاں کے ساکنوں ہی کی جلب منفعت کا ذریعہ ہو"۔ یہ بیان ایک بڑی گہری صداقت پر مبنی ہے۔ لوگوں کا انبوہ کثیر اسی طینت کا ہوتا ہے کہ معمولی حالات میں وہ دوسروں کے اغراض کے خیال سے جنبش تک نہیں کرتا۔ برطانوی اصحاب رائے ایسے ہی منصف مزاج ہوتے ہیں جیسے دنیا کے کسی اور ملک کے ہو سکتے ہیں لیکن وہ برطانوی صاحب رائے انسان ہی نہ ہوگا جو اپنے مفاد اور اپنے اغراض کو پیش نظر نہ رکھے کیوں کہ اقتضائے فطرت ہی یہی ہے۔ پارلیمنٹ اپنے اہل الرائے کے احکام کی تابع ہے اور وزیر ہند جو برطانوی کابینہ کا ایک رکن ہے ارکان کابینہ کی متفقہ خواہشوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ وزیر ہند ہی اپنی کونسل کے ارکان کا تقرر کرتا ہے اور یہ ارکان کسی معنی میں بھی اہل ہند کے نمایندے نہیں ہیں۔ ہندوستان کا وائسرائے بھی وزیر ہند ہی کا تابع ہے حکومت ہند وزیر ہند کی کونسل ہی کے تفویض ہے اور بقول سر ولیم ہنٹر یہ کونسل ایک عدید یہ ہے اور رعایا کی نمایندہ نہیں ہے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان عام طور پر خرچ کرنے والے سر رشتوں ہی کے صدر ہیں اور جیسا سر ڈیوڈ باربر نے "ماموریۂ مصارف ہندوستان" کے سامنے اپنی شہادت میں بیان کیا تھا: "ہر وقت رجحان طبع اسی طرف رہتا ہے کہ مزید مصارف عائد کرنے کے لئے سر رشتۂ مالیات پر دباؤ ڈالا جائے اور یہ عملاً دباؤ ہی ہے۔ دیگر سر رشتہ جات حکومت زیادہ روپیہ خرچ کرنے ہی پر ہمیشہ زور دیتے رہتے ہیں اور ان کے مطالبات کا ایک سلسلہ قائم رہتا ہے جن پر وہ شدّ و مدّ کے ساتھ مصر رہتے ہیں"۔ حکومت ہند پر از سر تا پا نہ کسی کا اثر ہے کہ وہ تخفیف مصارف کی محرک و موید ہو اور نہ کسی کا زور چلتا ہے کہ وہ محصول دینے والوں کے اغراض کی حفاظت کرے۔ ایک ایسے دستور کے تحت جیسا

ہندوستان کا ہے نالیاتی اصلاحات تو ناممکن ہیں۔ اگر تخفیف مصارف ہی مقصود ہو تو اس دستور میں کہیں نہ کہیں اسیرانِ محصول کے اغراض کی نمایندگی کی گنجائش نکالنی ہوگی۔

شاہنشاہی ہند کے متعلق تاریخ ہی فیصلہ کرے گی کہ عصر جدید کے ادارات میں وہ سب سے زیادہ عظیم الشان ادارہ ہے۔ لیکن آنے والے مورخین کو یہ دلخراش قصہ دھرانا پڑے گا کہ اس شاہنشاہی نے ہندوستان میں امن تو قائم کیا لیکن وہ اہل ہند کو خوش حال نہ بنا سکی۔ یہ کہ صنعت اور حرفت کا نام و نشان تک باقی نہ رکھا۔ یہ کہ کاشتکار ایسے سنگین اور تغیّر پزیر محصول سے پس گئے جنھیں ادا کرنے کے بعد آمدنی سے پس انداز کرنے کے لئے کچھ نہیں بچتا تھا۔ یہ کہ محاصل کا بیشتر حصہ ایک طفل گم شدہ کی طرح انگلستان چلا جاتا تھا۔ اور یہ کہ تباہ کن مسلسل قحط سے لکھوکھا نفوس کا صفایا ہوگیا تھا۔ برخلاف اس کے انگریزوں کے لئے اس قصے کا بیان کرنا باعث امتنان ہوگا کہ انگلستان نے بیسویں صدی عیسوی میں آئرلنڈ کی طرح ہندوستان میں بھی اپنی تمام گزشتہ غلطیوں کی تلافی کردی یہ کہ محصول اراضی میں تخفیف کردی۔ حرفتوں میں نئی روح پھونک دی رعایا کی نمایندگی کی ترویج کی اور اہل ہند ہی کے مفاد میں ہندوستان پر حکومت کی۔ اور یہ کہ اہل ہند کے دل و دماغ بھی یہی محسوس کرنے لگے تھے کہ اب ان کا شمار بھی ایک عظیم الشان متحدہ شاہنشاہی کے شہریوں میں ہوچلا تھا۔

رامیش دت۔

لندن۔ دسمبر ۱۹۰۳ء عیسوی۔

دیباچہ طبع ثانی

اس کتاب کی اشاعت کو ابھی تین سال نہ ہوئے تھے کہ طبع ثانی کا مطالبہ ہونے لگا جو مؤلف کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ہوا۔ اور مؤلف کو یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ امریکہ میں یہ کتاب ایک حد تک مقبول ہوئی اور اس کے ان ابواب کا جن میں تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں ہالینڈ کے پروفیسر زیمن نے ایک یورپی زبان میں ترجمہ کیا۔

موجودہ زمانے میں آثار بہت امید افزا نظر آرہے ہیں۔ سنہ رواں میں ہندوستان کی جدید حکومت نے اراضی پر جو بعض سنگین الواب عائد کئے تھے ان کو موقوف کر دیا اور انگلستان کی جدید پارلیمنٹ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ وہ مجالس وضع قوانین میں نمایندگی کے عنصر میں عنقریب اضافہ کرنے والی ہے۔

رایش دت۔

لندن۔ اگست ۱۹۰۶ء عیسوی

فہرست مضامین

معاشی تاریخ ہند جلد دوم

پہلی کتاب

عہدِ کمپنی بہادر

سنہ ۱۸۳۰ء تا سنہ ۱۸۵۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

آکلینڈ اور النبرو

۱۸۳۵ئہ میں لارڈ ولیم بنٹنک نے ہندوستان کو خیرباد کہا۔ اس کی ہفت سالہ حکومت کا زمانہ امن، تخفیف مصارف اور اصلاح کا زمانہ تھا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں امن قائم کیا اور ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ صلح پسندی کے ساتھ گزاری۔ اس نے "سرکاری قرضے" میں تخفیف کی اور سالانہ مصارف میں نہ صرف کمی کی بلکہ محاصل میں اخراجات کے بمقابل فاضلات بھی کر کے دکھائے۔ اسی نے شمالی ہند میں اس مرتمہ بندوبست کی ابتدا کی جس سے زمیندار اور کاشتکار دونوں کو فائدہ پہنچا۔ اس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سررشتہ جات عدالت و مالگزاری کی اعلیٰ خدمتیں بھی دیں۔ ستی کی رسم بند کر دی اور ٹھگی کے جرائم کا انسداد کیا۔ انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس نے ان اصول پر کاربند رہنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے نظم ونسق میں ہندوستانیوں کے اغراض سب پر مقدم ہونے چاہئیں۔ اس کے جانشین سر چارلز مٹکاف نے بھی انھیں تجربوں اور روایات سے فائدہ اٹھا کر وہی طریقہ اختیار کیا اور انھیں اصول کا پابند رہا جن کی بنٹنک نے پابندی کی تھی چنانچہ مٹکاف نے اخباروں کو آزادی بھی بخشی اور

ایک قابل و نیک نیت حاکم ہونے کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

لارڈ ولیم بنٹنک کا استعفا جب اگست ۱۸۳۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظماء تک پہنچا تو اس وقت ہنری جورج ٹکر انکا میر مجلس تھا۔ ٹکر نے ہندوستان میں ممتاز خدمتیں انجام دی تھیں اور ویلزلی اور منٹو کے تحت مالی انتظامات میں بھی خاص قابلیت دکھائی تھی۔ خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اور انگلستان کی طرف مراجعت کرنے پر بھی اس نے ہندوستان کے اغراض کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ بنٹنک کا استعفا پیش ہوئے پر ٹکر کو فکر ہوئی کہ اس کا جانشین کوئی اسی کا ہم پلہ شخص مقرر ہونا چاہیئے۔ ماونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن اور چارلس مٹکاف یہ دونوں اس کے پیش نظر تھے۔ مقدم الذکر حال ہی میں بمبئی سے انگلستان واپس آیا تھا اور موخر الذکر بنگالے میں ہنوز اپنی مفوضہ خدمت انجام دے رہا تھا۔ الفنسٹن نے جو اس زمانے میں انگلستان میں آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا دوبارہ ہندوستان کے شور و شر میں مبتلا ہونے سے انکار کر دیا۔ اس پر نظما کے میر مجلس نے گورنر جنرل ہند کے عہدۂ جلیلہ پر سر چارلس مٹکاف کے تقرر کی تجویز پیش کی جس کو نظما نے کثیر غلبۂ آراء کے ساتھ منظور کر لیا۔ مگر وزرائے سرکار برطانیہ نے اس میں تامل ظاہر کیا۔ جب مجلس نظماء کی یہ تجویز مجلس نظم میں پہنچی تو مجلس نظم نے کمپنی کے انتخاب کو اس عہدہ کیلئے نامناسب قرار دیا کیونکہ دراصل ارکان کی خفیہ خواہش یہ تھی کہ یہ سب سے بڑی خدمت اپنے گروہ کے کسی طرفدار کو مل جائے۔

انگلستان کے نظم و نسق میں بڑے بڑے تغیرات متواتر وقوع میں آئے "جدت پسند گروہ" کی وزارت جس نے سر چارلس مٹکاف کے تقرر کو نامنظور کیا تھا ۱۸۳۴ء کے آخر میں مستعفی ہو گئی۔ اس کے بعد سر رابرٹ پیل نے "قدامت پسند" حکومت قائم کی جس نے سر چارلس مٹکاف کے بجائے ایک "قدامت پسند" امیر کا انتخاب کیا۔ یہ امیر لارڈ ہیٹسبری تھا جس کا تقرر جنوری ۱۸۳۵ء میں اس خدمت پر ہوا اور فروری میں تاج برطانیہ نے اسکی منظوری بھی دیدی۔ مارچ میں ہیٹسبری کو وداعی ضیافت بھی دی گئی۔ سر رابرٹ پیل۔ ڈیوک ولنگٹن

اور دیگر "قدامت پسند" معززین شریک جلسہ تھے۔ لیکن اپریل میں لارڈ ہیٹسبری کے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے "قدامت پسند" حکومت کا عزل ہو گیا اور جدت پسند وزارت نے جو اس کے بعد ہی قائم ہوئی اس قدامت پسند امیر کے تقرر کو منسوخ کر کے اسکے بجائے اپنے گروہ کے ایک امیر کو گورنر جنرل ہند کے عہدہ پر مامور کیا۔ سر چارلز مٹکاف سے جو بنٹنک کی روانگی کے بعد گورنر جنرل کی خدمت ایک قائم مقام کی حیثیت سے انجام دیرہا تھا عنان حکومت لینے کے لیے لارڈ آکلینڈ مقرر ہوا یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ معاملات قدامت پسند گروہ کے لئے زیادہ باعث ذلت تھے یا جدت پسند گروہ کے لئے لیکن اتنا تو ضرور معلوم ہوتا تھا کہ دونوں گروہ مساوی طور پر اپنے اغراض کو ہندوستان کے نظم و نسق کی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے۔

لیکن گورنر جنرل ہند کے عہدہ پر لارڈ آکلینڈ کا تقرر بہت گہرے معنی رکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی خارجی حکمت عملی کی تشکیل انگلستان کی خارجی حکمت عملی کے مماثل ہونی چاہئے۔ انگلستان میں "جدت پسند گروہ" نے ۱۸۳۰ء کے انتخاب میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنی وزارت قائم کی اور ایک تھوڑے سے وقفے کے سوا جو ۱۸۳۴ء اور ۱۸۳۵ء کے درمیانی موسم سرما میں واقع ہوا تھا گیارہ سال تک انہیں کی حکومت قائم رہی۔ اس "جدت پسند حکومت" میں اسوقت سب سے زبردست شخص لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ تھا اور اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ روس کو مشرق میں کسی طرح بڑھنے نہ دے۔ چنانچہ اس نے اسی غرض سے ۱۸۳۳ء میں ترکی حکومت کی تائید اور امداد بھی کی۔ ۱۸۴۰ء میں اس نے یورپ کی تین طاقتوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ ترکوں کو افواج و عساکر سے کمک دیں اور ۱۸۴۱ء میں اس نے مصر کو دوبارہ ترکی طاقت کے زیر نگیں کر دیا۔ ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان پر لارڈ آکلینڈ کے تقرر کا اصلی منشا روس کے خلاف انگلستان کی حکمت عملی کو تکمیل پر پہنچانا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ الحاق و فتح کی خاطر لڑائیاں مول لیتی تھی مگر پہلی جنگ افغان کا جرم اس پر عائد نہیں کیا جاسکتا۔

کیونکہ یہ جنگ اس کی منظوری یا رضامندی کے بغیر اس کے سر پڑی تھی۔
سنہ ۱۸۳۵ء ہی میں مجلس نظماء کے میر مجلس وقت ہنری سینٹ جورج ٹکر نے مجلس نظم کو ان اصول کے تسلیم کرنے پر راضی کر لیا تھا کہ روس کو نہ بڑھنے دینے کے لیے انگلستان جو چالیں چل رہا تھا اور جو معاملات ایران سے طے ہو رہے تھے ان سے ہندوستان کو کوئی سروکار نہ ہوگا بلکہ وہ سب خاص یورپ ہی سے متعلق ہونگے۔ اس "افسوسناک نسبت" کے ساتھ جو ہندوستان کے اکثر مالی معاملات میں انگلستان کا خاصہ رہی ہے یہ انتظام کیا گیا کہ سفارت ایران کے لیے ہندوستان سالانہ بارہ ہزار پونڈ دیتا رہے لیکن انگریزی سفیر مقیم طہران اور ایران کے تمام سیاسی امور پر تمام اقتدار و نہ دائے دولت برطانیہ ہی کے ہاتھ میں رہے جب روس و ایران سے متعلق مسئلے کو خاص یورپ کا مسئلہ تسلیم کر لیا گیا تھا اس وقت یہ گمان تک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جبکہ اس مسئلے کے حل کرنے میں ہندوستانیوں کا خون اور خزانہ پانی ہو کر بہے گا۔

ڈاکٹر مکنیل شاہ ایران کے دربار میں سفیر مقرر ہوا اور اس نے لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ کے ساتھ براہ راست مراسلت شروع کر دی۔ فروری ۱۸۳۷ء میں اس نے لارڈ پامرسٹن سے شکایت کی کہ قندھار کے گماشتے نے روسی ایلچی سے ملاقات کی مگر سفیر انگلستان سے ملا تک نہیں۔ اور اسی مہینے میں پامرسٹن کو ایک اور مراسلہ لکھا جس میں شاہ ایران کی ہرات پر ممکنہ فوج کشی کو جائز قرار دیتے ہوئے حسب ذیل امور پیش کیے:-

"ہرات پر ایران کے دعوئے اقتدار سے قطع نظر کر کے اگر اس مسئلہ کو محض دو خود مختار فرماں رواؤں کے مابین تصفیہ طلب امر تصور کیا جائے تو میری دانست میں ہرات کی حکومت ہی کی اس میں زیادتی پائی جائے گی۔"

"ایران نے افغانیوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کی تھی لیکن شاہ سابق کی وفات پر حکومت ہرات نے ترکمان اور ہزارہ قبائل کو ساتھ لیکر عملداری ایران میں خوب تاخت و تاراج کی اور ایرانی رعایا کو غلاموں کی طرح بیچنے

کی غرض سے گرفتار کر لیا"

"ان حالات کے لحاظ سے اگر شاہ ایران شاہزادہ کامران کے خلاف اعلان جنگ کرے بھی تو شاہ ایران کے حق بجانب ہونے میں میرے نزدیک کوئی شبہ نہیں ہے"

الغرض ایرانیوں نے ہرات پر حملہ کر دیا۔ دوست محمد امیر افغانستان بھی شاہ ایران کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ ایک زمانے میں اسی دوست محمد نے رنجیت سنگھ والی پنجاب سے پشاور واپس لینے کی کوشش کی تھی اور کابل میں روسی سفارت کا قیام بھی منظور کر لیا تھا۔ بادی النظر میں یہی وجوہ تھے جن کی بناء پر لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل وقت نے افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

اب قارئین کو بڑے تجسس کے بعد بھی پتا نہیں چلتا کہ آخر اس جنگ کا جس میں ہندوستان بلاوجہ گرفتار ہو گیا۔ کوئی معقول سبب بھی تھا کہ نہ تھا اگر یہ کوشش اس لیے تھی کہ رنجیت سنگھ سے پشاور واپس لے لیا جائے تو یہ کوشش رائگاں تھی کیونکہ رنجیت سنگھ اپنے مال کی آپ بخوبی حفاظت کرنے کے قابل تھا یا یہ بھی فرض کیا جائے کہ یہ جنگ محض اس غرض سے شروع کی گئی تھی کہ دوست محمد خاں نے ہرات پر حملہ کرنے میں شاہ ایران کی مدد کی تھی اس لیے اس سے انتقام لیا جائے تو بھی یہ مفروضہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ گورنر ہرات کے طرز عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوست محمد خان کا شاہ ایران کی کمک کرنا "بالکل جائز و حق بجانب" تھا جیسا خود ڈاکٹر میکنیل نے اپنے ۱۸۴۳ء کے مذکورہ الصدر مراسلے میں اعتراف کیا سچ پوچھیئے تو اس جنگ کی اصل غرض یہ تھی کہ دوست محمد جیسے قابل اور زبردست حکمراں کو باوجود دوستانہ ہونے کے معزول کر کے انگریزوں کے کسی آلۂ دست کو اس کی جگہ تخت نشین کیا جائے۔ اسطرح دراصل لارڈ پامرسٹن انگلستان کے ایک زبردست حریف کا مشرق میں مقابلہ کر رہا تھا باایں ہمہ لارڈ آکلینڈ نے اس جنگ کے مصارف ہندوستان کے محاصل سے ادا کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ سنیٹ جورج ٹکر نے لکھا کہ "ملکۂ معظمہ کی حکومت کے لئے سہولت اسی میں تھی کہ روس کے مقابلے کے لیے اپنا بیڑہ بحیرۂ بالٹک یا بحیرۂ اسود روانہ کرنے کے بجائے اس مہم کے جملہ مصارف کا بوجھ ہندوستان ہی

پر ڈال دے۔ لیکن ہم ایسی کوششوں کی جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی دولت ملک کے باہر اور امور پر صرف کی جارہی ہے بقیناً مدافعت کریں گے۔"

بالآخر ہرات کا محاصرہ ایرانی فوجوں نے اٹھا لیا۔ اب افغانی معاملات میں لارڈ آکلینڈ کی مداخلت کی ظاہری وجہ جو تھی وہ بھی غائب ہوگئی۔ افغانستان کے ساتھ جنگ کا ارادہ ترک کرنے کے لئے ابھی کافی مہلت تھی۔ اگرچہ ڈیوک ولنگٹن ایسا شخص نہ تھا کہ اس کو "بہر صورت صلح پسند" کہا جاسکتا تاہم خود اس کی بھی رائے یہی تھی کہ اس مہم سے اب دست بردار ہو جانا چاہئے چنانچہ اس نے سینٹ جورج ٹکر کو یہ لکھا کہ "میں تو یہ سمجھتا تھا کہ ہرات کا محاصرہ اٹھانا خود دریائے سندھ کی مہم سے دست بردار ہونے کی علامت تھی۔ اگر اب ارادہ بدل گیا ہے تو یہ بڑی بدنصیبی ہے۔ اس مسئلے کے تصفیئے کے لئے کہ افغانستان میں کون حکمراں رہے کون نہ رہے دریائے سندھ کو عبور کرکے افغانستان میں ہمارا داخل ہونا ہمیشہ کے لئے ہماری فوج کو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں کوچ کرتے رہنے پر مجبور رکھے گا۔"

لیکن لارڈ آکلینڈ اپنی دانست میں اس معاملے کو ولنگٹن سے بھی بہتر سمجھتا تھا چنانچہ اس نے مجلس نظماء کی مجلس معاملات رازکو لکھا کہ "شاہ ایران کے محاصرۂ ہرات اٹھا دینے کی صحیح اطلاع ملنے پر میں نے اس مفید مطلب صورت حال پیدا ہوجانے کے باوجود ان تدابیر پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ بالاعلان ظاہر کیا جنکی تکمیل ہندوستان کی مغربی سرحد پر ہمیشہ امن قائم رکھنے اور اس سمت سے حملہ آوری کے منصوبوں کا دوامی سدباب کرنے کے لئے کی گئی تھی"۔ اب شصت سالہ تجربے کی بنا پر ہم خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ڈیوک ولنگٹن اور لارڈ آکلینڈ ان دونوں میں کون حق پر تھا اور افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے کیا ہم نے ایسے حملوں کا دوامی سدباب کردیا جو کچھ رکاوٹیں موجود تھیں ان تک کو باقی نہیں رکھا اور اب اس ملک میں ہماری فوج یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں کوچ پر لگی ہوئی ہے۔"

بہرحال یہ جنگ جاری رہی۔ انگریزوں کی فوج سندھ سے ہوکر افغانستان گئی کیونکہ رنجیت سنگھ نے اپنی پنجاب کی عملداری سے ہوکر گزرنے کی اس کو اجازت

نہیں دی تھی ۱۸۳۹ء میں قندھار فتح ہو گیا۔ جولائی میں غزنی پر چڑھائی کی گئی اور اگست میں فوج کابل پہنچ گئی۔ دوست محمد دریائے جیحون کو عبور کر کے بخارا میں روپوش ہو گیا اور اس کی جگہ شاہ شجاع تخت نشین کیا گیا۔ اس پر نہ صرف انگلستان کے لوگ پھول گئے بلکہ جو کارکن اشخاص موقع پر موجود تھے انھوں نے بھی وہ لاف زنی کی کہ کسی انگریز مدبر یا نبرد آزما نے ابھی آج تک نہیں کی۔ غزنی کی فتح کے بعد سر جان کین نے لارڈ آکلینڈ کو لکھا کہ "اپنی پینتالیس سال کی ملازمت میں میں نے جس آب و تاب کے کارنامے چار دانگ عالم میں دیکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ فتحیابی بھی ہے جو انگریزی فوج نے میرے تحت یہاں حاصل کی" اس کے علاوہ "سردار دوست محمد خان کے فرار ہو جانے اور ملک معظم شاہ شجاع الملک کے کابل میں اپنی رعایا کی تہنیت اور مبارکباد کے ساتھ داخل ہونے" سے متعلق لارڈ آکلینڈ نے بھی نظار کی مجلس معاملات راز کو لکھا۔ اور خود ملک معظم شاہ شجاع الملک نے ملکۂ وکٹوریہ کو لکھا "میری خواہر شاہانہ کے دوست نواز احساسات سے مجھ کو اعتماد کلی ہے کہ میری دلی خواہشات پر ہر وقت نظر التفات یونہیں مبذول رہے گی"۔ شجاع الملک کی خواہش یہ تھی کہ دُرّانی شاہنشہی کا ایک خاص تمغۂ اعزاز بنایا جائے اور درجۂ اوّل کا تمغہ لارڈ آکلینڈ، سر جان کین اور چند دیگر اشخاص کو عطا کیا جائے۔

پہلی جنگ افغانستان کے تاریخی واقعات کی تفصیل موجودہ کتاب کے مقصد سے باہر ہے۔ مدارس کی تاریخ ہند سے متعلق ہر نصابی کتاب میں اس جنگ کا بیان موجود ہے اور ایک صاف گو انگلو انڈین مورخ نے بھی زیادہ تفصیل اور صداقت کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ افغانیوں نے اپنے معاملات میں پردیسیوں کی مداخلت گوارا نہیں کی۔ شاہ شجاع کو جو حال حال میں امیر ہوا تھا اپنے کاروبار پر انگریزی سفیر کی نگرانی تلخ تھی۔ کابل کے ملّاؤں نے شاہ شجاع کا خطبہ پڑھنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ وہ ان کا خود مختار بادشاہ نہ تھا رفتہ رفتہ جب ہندوستانی خزانے کی بہتی گنگا میں وہ پہلی سی طغیانی نہ رہی تو قبائل کے سردار و سرخیل بھی کھلی دشمنی کرنے لگے۔ ۱۸۴۱ء میں ۲ر نومبر کو کابل میں بغاوت شروع ہو گئی جس میں سر الگزانڈر برنس مارا گیا۔ ۲۳ر دسمبر کو مکناٹن

نامی انگریز سفیر کو دوست محمد خاں کے بیٹے اکبر خاں نے ایک عام بھری مجلس میں مار ڈالا۔ جنوری سنہ ۱۸۴۲ء میں انگریزوں کا لشکر جس میں چار ہزار سپاہی اور بارہ ہزار ہمراہیان لشکر تھے کابل سے پسپا ہونا شروع ہو گیا۔ اس پر مصائب پسپائی کے دوران میں کبھی مجادلہ و محاربہ ہوا۔ اور کبھی صلح کے نامہ و پیام ہوتے رہے۔ اکبر خاں نے اور انگریزوں کو ان کے اہل و عیال کے ساتھ بطور یرغمال طلب کیا اور ہزیمت خوردہ افواج پر گولہ بارود برسانے کے لئے اس کی فوجیں غلزائی قبیلے کے ساتھ مل گئیں۔ انگریزوں کا سارا لشکر سپاہیوں اور ہمراہیوں کو ملا کر سولہ ہزار کی تعداد میں افغانیوں کی گولہ باری سے جانبر نہ ہو سکا۔ اور ان میں سے زخمی ہو کر جو لوگ بچ گئے وہ افغانستان کی برفباریوں میں سردی سے اکڑ کر مر گئے یا فاقہ کشی سے جانبر نہ ہو سکے۔ سارے لشکر میں ڈاکٹر برائیڈن اکیلا شخص تھا جو اپنی جان سلامت لے گیا۔ لارڈ آکلینڈ کے بعد لارڈ النبرو ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل ہند مقرر ہوا۔ اس اثنا میں انگلستان میں "جدت پسند گروہ" کے زوال پر "قدامت پسند حکومت" قائم ہو چکی تھی اور نئے وزرائے سلطنت اس پر مصائب اور ناعاقبت اندیش جنگ کے ذمہ دار نہ تھے اس لئے اگر وہ اس جنگ کا سب الزام اپنے پیشروؤں کے سر لگا دیتے تو بالکل حق بجانب ہوتے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے حق میں یہ انصاف کرنے کی ان سے توقع بھی تھی کہ وہ اس جنگ کے مصارف سے ہندوستان کو بالکل بری الذمہ کر دیں گے لیکن وزرائے برطانیہ کو خواہ وہ "جدت پسند گروہ" سے ہوں یا "قدامت پسند گروہ" سے۔ ایک ناکامیاب جنگ کے مصارف کے لیے اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخاب کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پسارنا پسند نہ آیا۔ ادھر مجلس نظما نے اپنے دعاوی نہایت شد و مد کے ساتھ پیش کیے اور ادھر مجلس مالکان کمپنی نے بھی اسی شد و مد کے ساتھ ان کی تائید کی۔ اگرچہ اہل ہند کو یہ بڑی ناانصافی معلوم ہوتی تھی کہ ہندوستان کی سرحد سے باہر کی جنگ کے مصارف کے لیے ہندوستان پر مالی بار ڈالا جائے بااین ہمہ سب انکار و اعتراض بے سود ثابت ہوئے۔ پہلی جنگ میں افغانستان کے مصارف ڈیڑھ کروڑ پونڈ ہوئے تھے اس تمام رقم کا بار ہندوستان کے محاصل پر ڈالا گیا اور برطانیہ عظمیٰ نے ایک حبہ بھی اس کا ادا نہیں کیا۔

فروری ۱۸۴۲ء لارڈ النبرو کلکتہ پہنچ گئے۔ النبرو میں ہندوستان کے نظم و نسق کا کام انجام دینے کی قابلیت تھی کیونکہ وہ ہندوستان کی مجلس نظم کی پیریذیڈنسی کا کام کر چکا تھا۔ اس نے زمانہ سابق میں ان تمام محصولات راہداری کے اٹھا دینے میں مدد دی تھی جو ہندوستان کی تجارت داخلہ کے سنگ راہ تھے اور اس مجلس منتخبہ کی میر مجلسی بھی کی تھی جس کو دارالامرا نے ہندوستان کی عام پیداوار اور مصنوعات کے مسئلے پر تحقیقات کرنے کی غرض سے مقرر کیا تھا لیکن ایسے شخص کے لیے ہندوستان پہنچنے کے ساتھ ہی دوسرے سب کام چھوڑ کر صرف افغانی معاملات پر فوری توجہ کرنا اس وقت بالکل ناگزیر بن گیا تھا۔

جون ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ وفات پا چکا تھا اور اس وقت پنجاب سے ہو کر انگریزی فوج کے کوچ کرنے کا کوئی مزاحم نہیں رہا تھا۔ کمک کے لئے جنرل پولک پنجاب ہو کر گزرا اور جلال آباد سے غنیم نے محاصرہ اٹھا لیا۔ پولک نے اکبر خان کو شکست دی اور ستمبر ۱۸۴۲ء میں کابل پر قابض ہو گیا۔ کابل کا بڑا بازار جس کا ایشیا کی شاندار سے شاندار عمارتوں میں شمار ہے باروت سے اڑا دیا گیا اور فتح کے جوش میں فوج نے رعایا پر بطور یادداشت طرح طرح کی زیادتیاں بھی کیں۔

یکم اکتوبر ۱۸۴۲ء میں یعنے لارڈ آکلینڈ کے اعلان جنگ سے ٹھیک چار سال کے بعد آکلینڈ کے جانشین نے اعلان کیا کہ افغانستان سے افواج فاتح واپس طلب کر لیجائیں گی اس اعلان میں چند فقرے ایسے بھی ہیں جن کو کوئی ڈیوک ولنگٹن سا شخص ہی لکھ سکتا تھا اور جن کی کوئی لارڈ لارنس جیسا آدمی ہی تعمیل کرا سکتا تھا۔ یہ جملے ایسے ہیں جن کی صداقت ابد الآباد تک قایم رہے گی۔

"کسی فرماں روا کو ایسے لوگوں پر مسلط کرنا جو اس سے بالکل ناراض ہیں انگریزوں کی حکمت عملی اور اغراض کے خلاف ہے ورنہ اس کے یہ معنی ہوے کہ رعایا کا جنگی ساز و سامان اور راس المال نہ صرف ہر حملہ آور کی خدمت بجالانے کے لئے وقف ہے بلکہ ایک ایسے فرماں روا کے تمام مصارف برداشت کرنے کے لئے بھی جس سے رشتۂ اتحاد پیدا کرنے میں رعایا کو کسی فائدے کی توقع ہی نہیں۔

"گورنر جنرل ہند ہر ایسی حکومت کو تسلیم کرلے گا جو خود افغانیوں کی پسند کی

ہوئی ہو اور جو اطراف کی مملکتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی نہ صرف خواہشمند ہو بلکہ قابل بھی ہو۔

(۲) حکومت ہند اپنے حدود شاہنشاہی پر جو فطرت کے قائم کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں قانع رہے گی اور اپنی تمام کوشش عام طور پر امن قائم رکھنے میں اور خود مختار فرماں رواؤں یعنے اپنے حلیف کی حفاظت اور خود اپنی وفادار عقیدت کیش رعایا کی فلاح و بہبود و خوش حالی میں صرف کرے گی۔"

یہ دانشمندانہ اور مدبرانہ الفاظ تھے لیکن لارڈ ایلنبرو کے نظم و نسق پر یہ داغ لگ گیا کہ اس نے اتنا لکھنے کے بعد ہی ایک کمزور اور ہمسایہ ریاست کے ساتھ ان اصول کے منافی دوسری قسم کی حکمت عملی اختیار کی۔ یاد ہوگا کہ امیران سندھ نے ۱۸۳۸ء میں انگریزوں کی فوج کو کابل جاتے ہوئے اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دی تھی بس اس تاریخ سے سندھ کو بحیثیت مغربی ایشیا کے رہ گزر ہونے کے ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ انگریزوں کی فوج جب تک افغانستان پر قابض رہی اس وقت تک امیران سندھ نے حکومت ہند کی خوب مدد کی مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے باوجود جنگ افغانستان کے ختم ہوتے ہی حکومت ہند نے فوری اس ملک کا الحاق کر لیا۔

ایک زمانے سے میجر اوٹرم سندھ میں انگریزوں کا سیاسی وکیل رہا تھا اور اس کے خاصہ طبیعت کے موافق امیران سندھ کے ساتھ اس کا برتاؤ لطف آمیز و مشفقانہ اور اس کے ساتھ ساتھ موقع و ضرورت کے لحاظ سے قوت و استقلال سے کام لینے میں بھی وہ کبھی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء میں اعلیٰ اختیارات اوٹرم سے چھین کر سر چارلس نیپیر کو تفویض کیے گئے تھے۔ نیپیر ایک بہادر اور ممتاز سپاہی تو تھا مگر ساتھ ہی ساتھ مغرور، خود رائے اور تند مزاج واقع ہوا تھا اور اسی وجہ سے ہندوستان کے والیان ریاست کے ساتھ سیاسی روابط قائم رکھنے کی غرض سے اس کا انتخاب بہت ہی ناموزوں تھا۔ ؎۱

؎۱ سنہ ۱۸۲۲ عیسوی میں نیپیر کیفیلونیہ کا گورنر مقرر ہوا تھا لیکن ہر ایک سے اس کا جھگڑا رہا (بقیہ آئندہ)

نے پیرے آیسی سُنی سنائی باتوں کو باور کرلیا کہ بعض امیران سندھ انگریزوں کی حکومت سے بدظن اور بددل ہیں اور اس بنا پر اس نے امیران سندھ کے خلاف اعلان جنگ کردیا جنگ میانی اور جنگ حیدرآباد ان دونوں لڑائیوں میں ۱۸۴۳ء کے فروری اور مارچ میں امیران سندھ کو شکست ہوئی اور لارڈ النبرو نے جسکو مشرق میں صلح و اتحاد پیدا کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا سندھ کے الحاق کا حکم صادر کردیا۔

ایک دوستانہ ریاست پر ایسے الزام لگا کر جو کبھی ثابت ہی نہ ہوسکے اس ملک کے الحاق کو جائز بنانے کی کوشش میں آج تک کسی جانبدار مورخ نے اپنی تضییع اوقات نہیں کی۔ مجلس نظما کی یقیناً تعریف کی بات ہے کہ اگست ۱۸۴۳ء میں اس نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ امیران سندھ کے خلاف جو کارروائی کی گئی تھی وہ نہ صرف انصاف اور زمانہ شناسی بلکہ حکومت ہند کے اعراض قبل اور نیک نامی کے بھی خلاف تھی۔ اغلب یہ ہے کہ سندھ کے متعلق لارڈ النبرو کا یہ اقدامات ٹوری گروہ کی وزارت کے ایما سے ہوا ہو جیسا افغانستان کے معاملے میں وہگ وزار کے ایما سے لارڈ آکلینڈ نے کیا تھا۔ مجلس نظما ہر شخص کو واپس طلب کر لینے کی مجاز تھی چنانچہ اس نے ٹوری وزرا کے علانیہ اعتراضات کے باوجود ۱۸۴۴ء میں جب لارڈ النبرو کے دو ہی سال نظم ونسق میں گزرے تھے اُسے واپس طلب کرلیا۔

سندھ کے الحاق کے متعلق ایک اور واقعہ تاریخی نقطۂ نظر سے نہ سہی تو ادبی نقطۂ نظر سے ضرور دلچسپ ہے۔ سر چارلس نے پیر فاتح سندھ کا ایک چھوٹا بھائی ولیم نے پیر نامی تھا جو صاحب سیف وقلم ہونے کی حیثیت سے ایک خاص امتیاز رکھتا تھا یہ ڈیوک ولنگٹن کی سرکردگی میں پینینسولر جنگ میں شریک رہا تھا چنانچہ اس جنگ کی تاریخ بھی اس نے لکھی تھی جو انگریزی زبان میں تاحال ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسا بہادر سپاہی اور ممتاز مورخ اپنے بھائی اور میجر اوٹرم کے جھگڑوں میں پھنس گیا۔ اس پینینسولر جنگ کی تاریخ کے مولف نے ۱۸۴۵ء میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ) اس کی طینت میں داخل تھا اسی بنا پر حکام وطن کے ساتھ اس نے لڑائی مول لی۔ سندھ کی فتح کے بعد برطانوی حکام سے سخت لڑائی شروع کردی۔ زمانہ مابعد میں یہ پیر ہندوستان آیا اور سپہ سالار مقرر ہوا لیکن اس وقت بھی لارڈ ڈلہوزی سے جھگڑا کرلیا اور بالآخر ۱۸۵۱ء میں ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے رخصت ہوا۔

"فتح سندھ" پر اسی نام کی ایک کتاب شائع کی۔ اس اشاعت میں صرف اپنے بھائی کو بری الذمہ ثابت کرنے پر قناعت نہ کی بلکہ اس نے نیپئیر اوٹرم پر یہ الزام لگایا کہ وہ جنگی قابلیت نہ رکھتا تھا اور یہ کہ اوٹرم نے اُس حکمت عملی کی بھی مخالفت کی تھی جس سے ہندوستان کی تمدنی ترقی مقصود تھی مزید یہ کہ اس نے ایسی تدابیر اختیار کرنے کی رائے دی تھی جو اگر اختیار کر لی جاتیں تو انگریزوں کی افواج کا قلع قمع ہی ہو جاتا۔ ان دونوں بھائیوں نے جن کے جنگی اور ادبی کارناموں کی شہرت عام تھی اس بات کی کوشش کی کہ اپنی اپنی شخصیت کے متحدہ اثر سے ایک گمنام سپاہی پیشہ نوجوان آدمی کو دبوچ لیں، مگر آنے والی نسلوں کی انصاف پسندی کی یہ بھی ایک مثال ہے جو وہ کبھی کبھی سچے اور باعزت اشخاص کے حق میں دکھاتی ہیں کہ جیمز اوٹرم کو ان بار بار حملوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس زمانے میں بھی بہ مقابل فاتح سندھ کے اوٹرم کی شہرت ہندوستان میں زیادہ بلند پایہ ہے۔ اس نے ولیم نے پیئر کی تالیف کا اپنے ہی سادہ طرز تحریر میں جو جواب دیا ہے اس کو اب بھی اکثر لوگ پڑھتے ہیں درانحالیکہ ولیم نے پیئر کی جانبدارانہ کتاب کسی کو یاد بھی نہیں اوٹرم کی کارگزاری کی ابھی ابتدا ہی تھی کہ اس نے غربا پروری سے اور بیکسوں کے ساتھ ہمدردی دکھا کر اپنے اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا اور اسی وقت سے "بیرڈ ہند" کہلانے لگا۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس نے خاص امتیاز حاصل کیا اور اس کے بعد کے سال میں اس کو "بیارونٹ" کا خطاب عطا ہوا اور جب ہندوستان کا نظم و نسق ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ پر منتقل ہوا تو اوٹرم کو لارڈ کیننگ کی کونسل میں جو پہلا وائسرائے مقرر ہوا تھا جگہ دی گئی۔

سندھ کے الحاق پر جو فیصلہ جیمز اوٹرم نے کیا ہے وہی فیصلہ مجلس نظما اور غیر جانبدار مورخوں کا بھی ہے۔ "اہم معاہدوں کی جن کو قبول کرنے پر امیران سندھ کو مجبور کیا گیا تھا رسمی کاغذ سے بڑھ کر وقعت نہ دی گئی۔ جب ہمارے لئے بہت نازک زمانہ تھا تو اس وقت امیران سندھ نے ہم پر شفقت و مہربانی کا اظہار اور ہمارے ساتھ دوستی کا اقرار کیا تھا مگر یہ سب کچھ اب نظرانداز کر دیا گیا مزید براں متعدد جھوٹے الزام ان پر عائد کئے گئے حتیٰ کہ ان کے لئے بہر صورت

اپنا بچاؤ کرنا ناگزیر ہوگیا۔ پھر کیا تھا ایک نامہربان اور بے وفا حلیف کی ناخداترس اور بے رحم تلواروں نے بالآخران کا خاتمہ ہی کردیا۔"

دوسرا باب

ہارڈنگ اور ڈلہوزی

موجودہ کتاب کا مشا فتوح والحاقات کی سرگزشت بیان کرنا نہیں ہے
آکلینڈ اور ڈلہوزی کے جنگ وجدل اور الحاقات جن پر ایسے شدید مباحث پیدا ہوتے رہے
ہیں اس مولف کے لئے جس کا مقصد لوگوں کے صرف معاشی حالات کے بارے
میں کچھ لکھنا ہو ایسے دلچسپ نہیں کہ ان کے متعلق خامہ فرسای کی جائے لیکن ہندوستان
کی معاشی تاریخ نامکمل رہ جائے گی اگر جنگ وجدل کے مصارف کثیرا اور الحاقات
سے جو شاہنشہی کی توسیع حدود ہوی ہے اس کا کچھ نہ کچھ حوالہ نہ دیا جائے۔ اس لئے
جیسا پچھلے باب میں آکلینڈ اور ایلنبرو کے عہد حکومت کے اہم واقعات ہم نے بیان
کئے ہیں۔ اسی طرح اس باب میں ہارڈنگ اور ڈلہوزی کے نظم ونسق کے واقعات
بھی ہم مختصراً بیان کیے دیتے ہیں۔

سنہ ۱۸۴۴ء میں جب لارڈ ایلنبرو ہندوستان سے واپس طلب کر لیا گیا تو اس
کا قایم مقام سر ہنری ہارڈنگ مقرر ہوا اور اس خدمت کے لئے اس سے بہتر انتخاب
نہیں ہوسکتا تھا۔ ہارڈنگ ایک سپاہی پیشہ بہادر آدمی تھا اور سچے جانبازوں
کی طرح صلح پسند طبیعت رکھتا تھا۔ پینینسولر جنگ میں نپولین کے لشکر کے مقابلے
میں اس نے وہ داد شجاعت دی تھی کہ اپنے لیے خاص امتیاز پیدا کر لیا تھا کرنا
کے میدان جنگ میں جہاں سر جان مور کو کاری زخم لگا تھا یہ بھی مور کے ساتھ

شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ جنگ آلبیویرا میں جہاں گھمسان کا رن پڑا تھا یہ بھی شریک تھا اور وٹوریہ کے معرکے میں زخمی ہوا تھا۔ میدان واٹرلو میں بھی موجود تھا اور جنگ لینی میں مارشل بلوشر کے ہمراہیان خاص میں تھا موخر الذکر جنگ میں اُس کا بایاں ہاتھ گولہ لگ کر ایسا چور چور ہو گیا تھا کہ آخر اس کو قطع کر دینا پڑا تھا۔

نپولین کی لڑائیوں کے اختتام پر یہ ہارڈنگ پارلیمنٹ کا رکن چو منتخب ہوا تو بیس سال تک رہا۔ ۱۸۲۱ء میں لارڈ کاسلری کی بہن سے اُس نے شادی کی اور ۱۸۲۸ء میں لارڈ پامرسٹن کی جگہ وزیر جنگ کی حیثیت سے کابینہ کا بھی رکن مقرر ہوا۔ وہ ہمیشہ "ٹوری" ہی رہا اور جب سر رابرٹ پیل وزیر اعظم دولت برطانیہ مقرر ہوا تو ۱۸۴۱ء میں یہ دوبارہ وزیر جنگ مقرر ہوا اور ۱۸۴۴ء تک اسی عہدہ پر متمکن رہا۔ لارڈ النبرو کی قائمقامی کے لیے ہارڈنگ کا اس وقت انتخاب کیا گیا جب کہ اس کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ ہارڈنگ کی سی حیثیت کے ایک ممتاز وزیر سلطنت کے لئے یہ تقرر کچھ باعثِ امتیاز نہ تھا اور جب سر رابرٹ پیل نے اس کے دو سال بعد کسی موقع پر یہ کہا کہ "سر ہنری ہارڈنگ نے گورنر جنرل ہند کی خدمت قبول کرنے میں "خدمت عامہ بجالانے کی خاطر بڑے ایثار نفس سے کام لیا ہے" تو اس میں سر مو مبالغہ نہ تھا۔

کلکتہ آکر ہارڈنگ کو بمشکل اٹھارہ مہینے ہوئے تھے کہ خواہ مخواہ ایک جنگ اس کے سر پڑی۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ والی پنجاب نے وفات پائی۔ رنجیت سنگھ نے جو سکھوں کی فوج باشکوہ فراہم کی تھی وہ اس کے قابو سے نکلنے کے بعد آپے سے باہر ہو گئی۔ روما‌ئے قدیم کے "پریٹورین گارڈز" کی طرح یہ فوج موقع پاکر چھا گئی ہر دستے میں پنچایتیں قائم کی گئیں اور ان پنچایتوں کے سوا کسی اور کو یہ فوج مانتی ہی نہ تھی۔ حالت یہ تھی کہ سکھوں کی فوج جسکو چاہتی حاکم بنا لیتی اور جسکو چاہتی معزول کر دیتی تھی۔ انقلاب پر انقلاب ہو رہے تھے اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا خود رنجیت سنگھ کے سالے پر الزام لگائے گئے جس کی ان پنچایتوں نے تحقیقات کی اور ان کے فیصلے میں یہ الزام ثابت تھے۔ اس سپاہیوں کی ٹولی نے اس کو گولی مار دی۔ نومبر ۱۸۴۵ء میں سکھوں کی اس فوج باشکوہ نے جو ساٹھ ہزار سپاہیوں اور چالیس ہزار

ہمراہیان لشکر پر مشتمل تھی اور جس کے ساتھ ۱۵۰ ضرب توپیں تھیں بغیر سوچے سمجھے دریائے ستلج عبور کرکے انگریزوں کی عملداری پر دھاوا کردیا۔

سکھوں کا سپہ سالار لال سنگھ ایک غدار شخص تھا اور شاید وہ اپنی فوج کا قلع قمع ہونا ہی چاہتا تھا۔ مدکی پر انگریزوں کے ساتھ جو پہلا مقابلہ ہوا تو یہ معرکہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ لال سنگھ نے فرار پر کمر باندھی جس کے بعد ہی سکھوں کو شکست ہوی دوسرا معرکہ فیروز پور شہر میں ہوا جہاں گھمسان کا رن پڑا اس لڑائی کا ایک عینی شاہد کہتا ہے کہ انگریزوں کی توپیں ارابوں سے نیچے اتار دیگئی تھیں اور ساتھ کے گولہ باروت کو آگ بناکر ہوامیں اڑا دیا گیا تھا۔ انگریزوں کے سواروں کے دستے حملہ کرکے آدھی دور نہ بڑھے تھے کہ روک دیئے گئے۔ پلٹنوں پر پلٹنیں تاب مقاومت نہ لاکر پیچھے ہٹ گئیں اور ان کی صفوں کا صفایا ہوگیا۔ دن ڈھلنے تک کچھ نہ ہوا البتہ غروب آفتاب کے بعد سکھوں کے پڑاؤ کا کچھ حصہ یورش کرکے اُن سے چھین لیا گیا۔ صبح ہوئی تو لڑائی پھر شروع ہوگئی لیکن لال سنگھ کی بزدلی تھی یا غداری کہ اس کی فوج پسپا ہونا شروع ہوی۔ تیسری جنگ الیوال کے مقام پر ہوی جس میں انگریزوں کا لشکر فتحیاب ہوا لیکن قطعی فیصلہ کن جنگ جس کو کہہ سکتے ہیں وہ جنگ سابرایان ہے جو ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ اس لڑائی میں سکھوں نے غازیوں کی طرح ثابت قدمی اور مجاہدین کی طرح شجاعت دکھائی۔ لیکن تیج سنگھ جو سکھوں پر کمان کررہا تھا پہلے ہی حملے پر فرار ہوگیا اور کہا جاتا تھا کہ سکھوں کو جان سلامت لیکر بھاگ جانے کا موقع نہ دینے کے لیئے تیج سنگھ نے ستلج کا پل بھی گرادیا۔ انگریزوں کو پوری فتح تو حاصل ہوئی مگر بہت جانوں کے نقصان کے ساتھ کیونکہ اس جنگ میں دو ہزار سپاہیوں سے زیادہ قتل اور زخمی ہوئے۔ لارڈ ہارڈنگ کا بیٹا جو اس جنگ میں شریک تھا کہتا ہے کہ فوج کی کثرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا ان بہروآندآؤں سے گویا پاٹ دیا گیا ہے۔ دریا کے بالکل کنارہ پر توپ خانہ لگادیا گیا جہاں سے وہ گولہ باری ہوی کہ خون کے نالے بہہ گئے۔ چند ہی جان بچاکر بھاگے ہوں تو ہوں ورنہ کسی نے ہتھیار ڈالے نہیں۔ سکھوں نے اسی طور سے راضی برضا اپنے نوشتۂ تقدیر کو تسلیم کرلیا جو ہمیشہ سے ان کی قوم کا خاصہ رہا ہے۔

فاتحین نے ایسے شرائط ان مفتوح سکھوں پر عاید کیئے جن سے فاتحین کی اعتدال پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ سکھوں کی ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے اس لیے کر دیے گئے کہ برطانوی شاہنشہی کے مقابلے کے لیے آیندہ کوئی بڑی طاقتور سلطنت باقی نہ رہے۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ نے (جس کو اب امارت کا خطاب عطا ہوا تھا) ان شرائط کے باوجود پنجاب کی خودمختاری کو ہر طرح ملحوظ رکھا۔ مارچ ۱۸۴۶ء کے صلحنامے کی رو سے سکھوں نے پنجاب کے مغربی حصے سے جو بیاس اور ستلج کے دوآبے میں واقع تھا دست برداری اختیار کر لی۔ پندرہ لاکھ پونڈ انگلسیہ یا اس کے مساوی المحاصل اراضی دینے کا وعدہ کر لیا اور فوج میں تخفیف کر کے صرف پیادوں کی پچیس پلٹنیں اور بارہ ہزار سواروں کا رسالہ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ سب توپیں انگریزوں کو دینا قبول کر لیا جن سے انگریزوں کے لشکر پر گولہ باری کی گئی تھی جب سکھوں نے مقررہ رقم ادا نہیں کی تو ان بقیہ مقبوضات کا ایک اور حصہ انگریزوں کو تفویض کرنا پڑا۔ اس طرح کشمیر کی ریاست پنجاب سے علیحدہ کر لی گئی اور گلاب سنگھ کو ساڑے ساتھ لاکھ پونڈ معاوضے پر دیدی گئی۔

اس صلح سے بھی جو مارچ ۱۸۴۶ء میں کی گئی پنجاب میں امن قائم نہ رہ سکا۔ سکھوں کی خواہش یہ تھی کہ تحفظ حکومت کے لیے انگریزوں کی فوج لاہور میں مقیم رہے اس لیے دسمبر ۱۸۴۶ء میں ایک اور صلح نامہ ہوا جس کو صلح نامہ لاہور کہتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ کو جو ایک لائق مگر سازشی عورت تھی سب اختیارات سے بے دخل کر کے پندرہ ہزار پونڈ وظیفہ اس کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کی کمسنی میں سکھوں کے آٹھ سرداروں کی ایک نیابتی مجلس وزرا مقرر کی گئی اور ریاست کی رہنمائی اور نگرانی کے لیے ایک انگریز رزیڈنٹ کا تقرر عمل میں آیا جس کو غیر محدود اور مکمل اختیارات دے دیے گئے۔ مہاراجہ کے بلوغ تک پنجاب کے قلعوں میں انگریزی فوج مقرر کی گئی اور یہ طے پایا کہ انگریزوں کی حکومت کو اس فوج کے مصارف کے لیے دو لاکھ بیس ہزار پونڈ سالانہ سکھوں کو دینا ہوگا۔

صلح نامہ ہونے کے پانچ دن کے بعد گورنر جنرل نے مجلس معاملات راز کو لکھا کہ "ان شرائط سے مہاراجہ کی کمسنی میں انگریز رزیڈنٹ کو اندرونی نظم ونسق

اور بیرونی تعلقات میں غیر محدود اقتدار مل گیا ہے"۔ لارڈ ہارڈنگ نے ۲۰ اگست ۱۸۴۷ء میں ایک عام اعلان شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ "نوجوان راج کمار کی تعلیم و تربیت اور تحفظ جان و مال میں اس کو (لارڈ ہارڈنگ کو) ایسی ہی دلچسپی ہے جیسی ایک باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے"۔

میجر ہنری لارنس پہلا رزیڈنٹ مقرر ہوا یہ ایک دلیر ملنسار اور با اخلاق شخص تھا۔ ممکن تھا کہ اگر لارڈ ہارڈنگ اور پانچ سال ہندوستان میں رہتا اور ہنری لارنس بھی اسی مدت کے لیے اپنی خدمت پر بحال رہتا تو پنجاب بھی ایک طاقتور متمدن اور اور روشنانہ خیالات رکھنے والی ریاست بنی رہتی لیکن اعلان عام سے چھ ماہ کے اندر اندر زمام حکومت لارڈ ہارڈنگ سے لارڈ ڈلہوزی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ میجر ہنری لارنس بھی اپنی صحت کی خاطر ہندوستان کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا اور اس کا قائم مقام سر فریڈرک کری مقرر ہوا۔

لارڈ ڈلہوزی امرائے اسکاٹلینڈ کے طبقے کا ایک نوجوان شخص تھا جس کو ۱۸۳۸ء میں "ارل" کا اعزاز ملا تھا۔ ملبرن کی قائم کردہ وزارت کی میعاد جب ختم ہوئی تو سر رابرٹ پیل وزیر اعظم ہوا اور اس نے ۱۸۴۳ء میں لارڈ ڈلہوزی کو مجلس تجارت کا نائب میر مجلس مقرر کیا۔ اس وقت گلیڈسٹن اس کا میر مجلس تھا۔ اس کے دو سال بعد یہ نوجوان "ارل"، گلیڈسٹن کی جگہ میر مجلس ہو گیا۔ اس حیثیت سے لارڈ ڈلہوزی کو نئی ریلوں کے مسئلہ کا تصفیہ کرنا تھا۔ یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ڈلہوزی ہی نے وزیر اعظم کے پاس ان ریلوں کو قوم کی ملک بنا دینے اور اور ان کو بالکل مملکت کی زیر نگرانی رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ سر رابرٹ پیل نے انگلستان کے لیے ان ریلوں کے زیر انتظام مملکت ہونے کو نامنظور کیا اور بجا کیا۔

لارڈ جان رسل اس نوجوان محنتی اور جفاکش امیر کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ جب جدت پسند گروہ کی وزارت قائم ہوئی تو لارڈ جان نے شرافت و فیاضی سے گورنر جنرل ہند کی خدمت اس "ٹوری" امیر کے لیے تجویز کی۔ لارڈ ڈلہوزی نے اسے قبول کر لیا اور اپنی نوجوانی ہی میں جبکہ اس کی عمر پینتیس ۳۵ سال کی تھی ۱۸۴۸ء میں لارڈ ہارڈنگ جیسے جہاندیدہ و تجربہ کار شخص سے جائزۂ خدمت حاصل کیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے پنجاب میں امن اور اچھا انتظام مملکت قائم رکھنے کے لیے ہر ممکنہ احتیاط سے کام لیا تھا۔ ایک انگریز رزیڈنٹ کو "کامل اختیارات کے ساتھ اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہر محکمے کے فرائض پر نگرانی رکھے اور ان کی رہبری کرے۔" انگریزوں کی کچھ فوج لاہور میں متعین تھی کہ "وہ مہاراجہ کی حفاظت جان و مال کرے اور ملک میں امن قایم رکھے۔" انگریزی حکومت اس کی مجاز تھی کہ "وہ پایہ تخت کی حفاظت اور امن و امان قائم رکھنے کے لیے جس قلعہ یا جنگ کے کارآمد موقع اور مقام پر چاہے قابض ہو۔ لاہور کی ریاست انگریزی حکومت کو سالانہ دو لاکھ بیس ہزار پونڈ اس غرض سے دینے پر مجبور تھی کہ اس رقم سے "اس فوج کے مصارف اور انگریزی حکومت کے سابقہ مصارف ادا ہوتے رہیں۔" یہ انتظام مہاراجہ کی صغر سنی میں جاری رکھا گیا تھا اور "جب ہز ہائینس ۱۶ سال کی عمر کو پہنچ جائیں یعنے ۴ ستمبر ۱۸۵۴ء میں یہ انتظام مسدود و موقوف ہو جائیگا۔"

مہاراجہ دلیپ سنگھ درحقیقت انگریزی حکومت کی ولایت و سرپرستی میں تھا اور انگریزی حکومت نے اس کا تحفظ جان و مال اس کے ملک کے نظم و نسق پر نگرانی اور وہاں امن کا قائم رکھنا اپنے ذمّے لے لیا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے انگریزی حکومت کے ان مشکل فرائض کی انجام دہی کے لیے مناسب تدابیر اختیار کی تھیں پچاس ہزار کا لشکر ساٹھ ضرب توپ کے ساتھ ستلج کے رخ پر نگاہ رکھنے پر مامور تھا۔ نو ہزار سپاہیوں کی لشکر گاہ لاہور کی حفاظت کے لیے وہاں قائم تھی۔ اسی قدر تعداد میں ایک اور لشکر نے جس میں پیدل۔ رسالے اور توپ خانہ بھی تھا فیروز پور میں اپنی لشکر گاہ بنالی تھی۔ غرض ناگہانی حادثات سے نبٹنے کا تمام سامان تیار تھا۔

ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ کی مراجعت سے کچھ دنوں بعد جب ہنگامے کی صورت پیدا ہوئی تو اس کے انسداد کے لئے بر وقت کچھ نہ کیا گیا۔ دیوان ملراج کے باپ نے تیس سال تک ملتان پر ایک طرح کی خود مختارانہ حکومت کی تھی اور جب انگریز رزیڈنٹ نے ملراج سے حسابات طلب کیے تو اس نے مختلف طریقوں سے اس میں تعویق پیدا کی اور خدمت سے مستعفی ہونے کے

کے حیلے حوالے کرتا رہا۔ ختم حجت کے لیے اس کا استعفا قبول کر کے ایک شخص اس کا جانشین مقرر کیا گیا جس کو دو انگریزوں یعنے وینس اگینو اور کرنل ہنڈرسن کی حفاظت میں ملتان پہنچنے پر پہلے تو قلعۂ ملتان انگریزوں کے قبضے میں دیدیا گیا لیکن اس کے بعد ہی اگینو اور ہنڈرسن کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ پھر ملراج نے دوبارہ قلعہ حاصل کر کے اس پر اپنا قبضہ جما لیا۔ انگریزی رزیڈنٹ سر فریڈرک کری نے سپہ سالار ہند لارڈ گوف کو طلب کیا کہ وہ انگریزوں کا لشکر لے کر اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے فیروز پور پر چڑھائی کرے لیکن لارڈ گوف نے صاف انکار کر دیا۔ اور لارڈ ڈلہوزی نے لارڈ گوف کی تائید کی۔ اس طرح باغیوں کو بغاوت پھیلانے کی مہلت مل گئی۔

ایک انگریز افسر نے اپنا فریضہ بروقت اور بہت عمدگی کے ساتھ انجام دیا۔ اس کا نام ایڈورڈ تھا اور یہ فوج میں لفٹینٹ تھا۔ لفٹینٹ ایڈورڈ دریائے سندھ کے کنارے اپنے خیمے میں بیٹھا ہوا تھا کہ انگریز افسروں کے قتل ہونے اور ملراج کی بغاوت کی اس کو خبر پہنچی۔ اپنے چار سو سپاہیوں کے ساتھ اس نے ملتان پر دھاوا کیا لیکن ملراج کے چار ہزار سپاہیوں اور آٹھ بڑی بڑی توپوں کے مقابلے میں جو قلعے میں مدافعت غنیم کے لیے بالکل تیار تھی اڈورڈ سے کچھ نہ ہو سکا۔ گرما کی تپش کے باوجود اس نے وہیں اپنے قدم گاڑ دیے اور ایک انگریز افسر سے جو بھی ممکن تھا اس نے وہ سب کچھ کیا۔ بھاولپور کی ریاست سے فوجیں جمع کیں جون اور جولائی میں ملراج کو دو دفعہ شکست دی حتیٰ کہ ملراج کو قلعے میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اگر حکام صدر اس وقت لاہور اور فیروزپور سے کمک بھیج دیتے جیسا دسمبر ۱۸۴۶ء کے صلح نامے کی رو سے ان پر لازم تھا تو پھر ملتان کی شورش فرو ہو سکتی تھی اور خود لفٹینٹ اڈورڈ کے الفاظ میں "اگر ملتان کی شورش فرو ہوتی تو پھر سکھوں کی بغاوت کا یہ پیش خیمہ نہیں بن سکتی تھی۔"

اس مقامی شورش کو فرو کرنے کے لیے بروقت کچھ بھی نہیں کیا گیا برخلاف اس کے انگریز رزیڈنٹ نے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے سکھوں میں ایک عام بے چینی پھیل گئی۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ جو مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حقیقی ماں ہوتی تھی ایک

سازشی عورت تھی لیکن اس سے اب کچھ خطرہ نہ تھا کیونکہ اس کو حکومت میں کسی قسم کا حصہ لینے سے محروم کر کے شیخ پور بھیجدیا گیا تھا لفٹیننٹ اڈورڈ کے قول کے مطابق رانی جھانڈا جس میں اپنی قوم کے مردوں سے بھی زیادہ جراءت و ذکاوت تھی مبہم آوازے کسنے اور لوگوں کو برانگیختہ کرنے والے خطوط لکھنے سے اکتا گئی تھی ...... اور اس وقت پنجاب میں کوئی ایسا سورما نہ تھا جو اس کے حکم پر تلوار لیکر اٹھ کھڑا ہوتا ''

ان حالات میں پنجاب سے بنارس کو اس رانی کی جلا وطنی کا جو حکم رزیڈنٹ نے دیا اس کی کچھ ایسی ضرورت تو نہیں تھی لیکن سکھوں پر اس حکم کا فوری برا اثر ہوا۔ ۲۵ مئی کو رزیڈنٹ نے یہ لکھا کہ '' راجہ شیر سنگھ کے پڑاؤ سے خبریں آ رہی ہیں کہ مہارانی کے نقل مکان کی کیفیت سن کر سپاہیان خالصہ نے بالکل ہمت ہار دی اور یہ کہنے لگے کہ مہارانی خالصہ سکھوں کی ماں کی جگہ تھی اور جب وہ خود چلی گئی اور صغیر سن دلیپ سنگھ ہمارے (یعنی انگریزوں کے) ہاتھ میں ہے تو پھر وہ اب کس کے لیے لڑیں یا کس کی حمایت کریں ''

مہاراجہ کے بیاہ میں التوا کرنے کی جو تدبیر اختیار کی گئی اس کا بھی اچھا اثر نہ ہوا لفٹیننٹ اڈورڈ نے اس کو اچھی طرح محسوس کیا اور ۲۰ جولائی کو اس نے رزیڈنٹ کو یہ لکھا کہ '' یہ خبر عام طور پر پھیلی ہوئی ہے اور بدخواہوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سکھوں کی فوج کی سرکشی اور حال حال کے فتنہ و فساد کے الزام لگا کر انگریز پنجاب کی ریاست ہی ضبط کر لینا چاہتے ہیں .... میری دانست میں اس وقت فوراً انگریزوں کے سابقہ عہد و پیمان اور صلح نامے کے شرائط کی پابندی کی بالا علان اس طرح تجدید کرنا نہایت دانشمندانہ اور بر وقت ہوگا کہ سرکاری طور پر مہاراجہ کے بیاہ کی تیاریاں شروع کر دی جائیں۔ اس سے لوگوں کو بہت کچھ اطمینان قلب حاصل ہو جائے گا '' افسوس ہے کہ اس عاقلانہ مشورے پر کسی نے دھیان نہیں کیا۔

اس کے علاوہ سردار چتر سنگھ کے ساتھ جس کی بیٹی مہاراجہ دلیپ سنگھ سے منسوب تھی ایسا برتاؤ کیا گیا کہ اس پر لوگ اور برانگیختہ خاطر ہو گئے۔ چتر سنگھ صوبہ ہزارہ کا صوبہ دار تھا اور اس صوبے کی سب آبادی مسلمان تھی ان لوگوں کا پیشہ سپہگری تھا اور سب کے پاس ہتھیار موجود تھے اور ان پر نگرانی رکھنا بہت مشکل تھا۔

کپتان ایبٹ کو جو رزیڈنٹ کا ایک مددگار تھا چترا سنگھ کو صلاح و مشورہ اور مدد دینے پر مقرر کیا گیا لیکن شروع ہی سے یہ شخص اس سردار کی علانیہ مخالفت کرنے لگا تھا۔ اگست ۱۸۴۸ء میں ہزارہ قبیلے کے کوہی باشندوں نے ایبٹ سے برگشتہ خاطر ہو کر سب دروں کی راہیں بند کر دیں اور شہر کا محاصرہ کر لیا جہاں چترا سنگھ مقیم تھا۔ سردار نے احشام قلعہ کو جو شہر کی حفاظت پر مامور تھے حکم دیا کہ قلعے سے نکل کر اپنی توپوں کی زد کے اندر ہی خیمے ڈالیں لیکن کرنل کنورا نے فصیل شہر سے باہر قدم رکھنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ دھمکی دی کہ پہلا جو شخص اس کے نزدیک آئے گا، گولیوں سے اڑا دیا جائے گا۔ چترا سنگھ نے سکھ پیادوں کے دو دستے توپوں پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجے۔ کنورا نے توپ کو فتیلہ دکھایا مگر توپ چلی نہیں اور اسی وقت غنیم کی گولیوں سے وہ مارا گیا۔ کپتان ایبٹ نے اس واقعے کو کنورا کا قتل عمد اور چترا سنگھ کو اس کا محرک و بانی قرار دیا۔ اس پر رزیڈنٹ نے ایبٹ کی سرزنش کی اور لکھا کہ "میں نے آپ کو فوجیں جمع کرنے اور جمعیت کو نوکر رکھنے کا مجاز نہیں کیا تھا...... میری دانست میں یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے ہمیشہ صوبہ دار (چترا سنگھ) کو اپنے سے دور ہی رکھا اور اس نے جب کبھی آپ کے قرب وجوار میں سکونت اختیار کرنے کی خواہش یا ارادہ ظاہر کیا تو آپ اس سے انکار ہی کرتے رہے...... جتنی کیفیتیں اب تک پیش ہوئی ہیں ان سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کنڈان کنورا کی موت کو قتل عمد سے آپ کا تعبیر کرنا درست ہے یا یہ کہ چترا سنگھ نے پیش از پیش اس کا تہیہ کر لیا تھا جیسا آپ کا غلط دعوےٰ ہے۔" باوجود ان تمام باتوں کے اگست میں کپتان ایبٹ کی سزا کے احکام صادر نہیں کیے گئے بلکہ الٹا یہ حکم ہوا کہ سردار چترا سنگھ صوبہ داری سے معزول کر دیے جائیں اور ان کی جاگیر خالصہ کر لی جائے۔ اس طرح سکھوں کی تمام قوم کے سامنے اس شخص کی تذلیل کی گئی جس کی بیٹی سکھوں کے فرماں روا کے ساتھ منسوب تھی اور جو قریب میں سکھوں کی مہارانی ہونے والی تھی۔ ان تمام کوتاہ عاقبت اندیشانہ وخلاف مصلحت حرکتوں پر سکھوں کی قوم کو طیش آ گیا ملتان میں بغاوت پھیلنے لگی۔ چترا سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ پانچ ہزار کے لشکر کے ساتھ ملراج سے جا کر مل گیا۔ اس پر انگریزوں کے لیے ملتان کا محاصرہ اٹھا لینا ناگزیر ہو گیا۔ سکھوں کے تقریباً سب سردار

بغاوت میں شریک ہو گئے اور آبادی کے باہر سب کھلے میدان جنگل پہاڑ وغیرہ باغیوں ہی کے زیر قبضہ تھے۔

بغاوت ملتان شروع ہونے کے کہیں سات ماہ کے بعد نومبر ۱۸۴۸ء میں لارڈ گوف اپنے لشکر کو لیکر بڑھا۔ پہلا معرکہ چناب کے کنارے رام نگر میں ہوا جس میں انگریزوں کے لشکر کو ہزیمت اٹھانی پڑی دوسرا معرکہ سعد اللہ پور میں ہوا جس کو بمشکل انگریزوں کی فتح کہا جا سکتا ہے تیسرا معرکہ چلین والا کے مقام پر ہوا اور یہ انگریزوں کے حق میں بہت بُرا ثابت ہوا۔ انگریزوں کی پیادہ جمعیت نے اس وقت دھاوا کیا جبکہ وہ بے دم سی تھی اور سب کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس لیے حملہ کارگر نہ ہوا۔ اور ان کو پسپا ہونا پڑا۔ انگریزی کا رسالہ اپنی توپوں کی مدد کے بغیر ان کی زد سے باہر آگے بڑھا چلا گیا پھر اس رسالے کو ایسی ہزیمت اٹھانی پڑی کہ لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سکھوں نے تین رجمنٹوں کے علم اور چار توپیں چھین لیں۔ اس طرح بغیر سوچے سمجھے حملے کر دینے سے ۸۹ افسر اور ۲۳۵۰ سپاہی کام آئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اپنے سرکاری مراسلوں میں اس معرکے کو بھی انگریزوں کی فتح بتایا ہے لیکن اپنے غیر سرکاری خطوط میں اس نے یکے بعد دیگرے "ان تین ناکام معرکوں پر اظہار افسوس کیا ہے جو رام نگر سعد اللہ پورا اور چلین والا کے مقام پر ہوئے تھے"۔

چلین والا کے معرکے کی خبر جب انگلستان پہنچی تو وہاں لوگوں کے طیش کی انتہا نہ رہی۔ لارڈ گوف فوراً واپس طلب کر لیا گیا اور اس کی جگہ سر چارلس نے پیپر کو سپہ سالار ہند مقرر کر کے بھیجا گیا۔ نے پیپر کے ہندوستان آنے سے پہلے ۲۰ رفروری ۱۸۴۹ء میں لارڈ گوف نے گجرات میں ایک فیصلہ کن فتح سے اپنے دامن کا دھبہ دھونے کی کوشش کی۔ جنوری میں ملتان پر انگریزوں کا قبضہ تو ہو ہی چکا تھا۔ گجرات کی اس فتح کے بعد گلبرٹ نے جس کو "ہندوستان بھر میں بہترین سوار" کہا جاتا تھا مفرور سکھوں کی فوج کا پنجاب کے میدانوں میں تعاقب کیا اور ۱۲ مارچ کو راولپنڈی میں جاکر سکھوں نے ہار مان لی اور ہتیار ڈال دیے۔ ملتان میں اس ہنگامے کے شروع ہونے کے ایک سال بعد پھر امن قائم ہوا۔

دسمبر ۱۸۴۶ء کے صلحنامے کی رو سے انگریزی حکومت نے پنجاب میں بغاوتوں

کے فرو کرنے اور کمسن مہاراجہ دلیپ سنگھ کے تحفظ جان و مال کا ذمہ لیا تھا اور نومبر سنہ ۱۸۴۸ء
کے اعلان عام میں جو لارڈ ڈلہوزی کی منظوری سے ہوا تھا یہ ظاہر کیا تھا کہ "انگریزوں
کی فوج کا لاہور میں داخلہ موجودہ حکومت کی بیخ کنی اور مخاصمت کے لیے نہیں بلکہ
محض امن قایم کرنے اور لوگوں کو حکومت کا مطیع و منقاد بنانے کی غرض سے ہوا تھا"
باایں ہمہ جب فتنہ و فساد فرو ہو گیا تو سکھوں کی حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔
مہاراجہ کو معزول کر کے پنجاب کا الحاق انگریزوں کی قلمرو کے ساتھ کر لیا گیا سر ہنری لارنس
نے جس کو دسمبر ۱۸۴۶ء کے صلح نامے کے بعد پہلا رزیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا اس
الحاق پر سخت اعتراضات کیے اور اپنا استعفیٰ بھی پیش کر دیا لیکن لارڈ ڈلہوزی
لارنس کی قدر و قیمت سے بحیثیت ایک اچھے صلح کار ہونے کے خوب واقف تھا اس
نے منت سماجت کر کے لارنس کو اپنا استعفیٰ واپس لے لینے پر آمادہ کیا اسی لارنس کی
خداداد قابلیت اور پیش بندی کے جوہر ہم پنجاب کے نظم و نسق کے سلسلے میں آیندہ اور
بھی بیان کریں گے۔

اس کے تین سال بعد لارڈ ڈلہوزی نے شاہنشاہی ہند کی مشرقی سرحد پر ایک
اور جنگ شروع کر دی۔ برما میں یاندوبو کے صلح نامے کے خلاف پردیسی
تاجروں پر مختلف محصولات لگائے گئے تھے اور اہل برما کے ساتھ بیوپار کرنے
میں بڑے بڑے خطرات اور مشکلات کا سامنا تھا۔ اس لیے سنہ ۱۸۴۱ء سے
انگریزی حکومت نے اپنی طرف سے کسی مختار عام کا دربار آوا کو بھیجنا موقوف کر دیا
تھا۔ ۲ ستمبر ۱۸۵۱ء میں رنگون کے انگریز تاجروں نے چند شکایتیں لارڈ ڈلہوزی
کے پاس کیں لارڈ ڈلہوزی تو ایسی شکایتوں کو کان لگا کر سننے کے لیے پہلے ہی سے
تیار بیٹھا تھا۔ اس نے فوراً ایک بحری افسر کو ان شکایتوں کی تحقیقات پر مامور
کر دیا۔ اس کے بعد ان تاجروں کے نقصان کی تلافی کے لیے اس نے ۹۰۰ پونڈ
بطور تاوان مانگے اور رنگون کے برمی گورنر کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اس کے ایک
سال قبل اسی قسم کے مطالبات پامرسٹن نے حکومت یونان کے سامنے پیش کیے تھے
کہ جزیرۂ مالٹا میں رہنے والے ایک یہودی کے نقصان کی تلافی ہو۔ مگر لارڈ ڈلہوزی
کے مطالبات کی تعمیل نہیں کی گئی اس لیے اس نے اعلان جنگ کر دیا۔ انگریزوں نے

رنگون ۔ پروم اور پیگو فتح کر لیا اور ۲۰ دسمبر ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی نے جنوبی برما کے انگریزی علداری کے ساتھ الحاق کا اعلان کر کے اس جنگ کو ختم کر دیا ۔

لارڈ ڈلہوزی کے نظم و نسق میں دیسی ریاستوں کے کسی رئیس کے لاولد فوت ہو جانے پر اس ریاست کے الحاق کر لینے کا قصہ اس کے فتوحات سے زیادہ حیرت انگیز ہے ۔ ہندوؤں کا قدیم رواج اور قانون یہ ہے کہ کسی ہندو کے اگر اولاد نہ ہو تو اپنی جائداد و املاک اپنا کسی شخص کو دینے کے لیے وہ کسی کو بھی اپنا متبنیٰ بنا سکتا ہے اور حقیقی اولاد اور ایسے ورثاء میں قانون کی نظر میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا جاتا ہے ۔ پانچ صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت شمالی ہند میں رہی مگر اس طویل مدت میں مسلمان بادشاہوں اور سلاطین میں سے ایک نے بھی ہندوؤں کے قانون تبنیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا ۔ کسی ہندو رئیس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کا حقیقی فرزند یا لے پالک بیٹا شاہنشاہ سے نئی سند حاصل کر کے اس کا قائم مقام ہو جاتا تھا ۔ البتہ یہ بھی تھا کہ اگر شاہنشاہ کا فتوح کی طرف رجحان ہوتا تھا تو وہ بغیر کسی پس و پیش کے ریاستوں کا الحاق کر لیتا تھا خواہ ایسی ریاستوں کا والی اس وقت زندہ ہو یا مر چکا ہو اور خواہ وہاں کے رئیس کا صلبی بیٹا موجود ہو یا صرف متبنیٰ مگر انگریزی راج میں کسی ہندو رئیس کے لڑکے کو فرزندی میں لینے پر انگریزی سرکار سے منظوری حاصل کرنے کا قاعدہ جاری کیا گیا ۔ جب یہ رواج قائم ہو گیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھانپ لیا کہ تبنیت کی منظوری نہ دینے سے کمپنی کی علداری میں اور وسعت پیدا کرنی ممکن ہے ۔ اسی بنا پر مجلس نظماء نے ۱۸۳۴ء میں یہ اعلان کیا کہ کسی کے تبنی کرنے پر جو منظوریاں صادر ہوتی ہیں ان کو تحت قاعدہ نہیں بلکہ مستثنیات سمجھنا چاہیے ۔ ۱۸۴۱ء میں حکومت ہند نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ کسی ریاست یا محاصل کی توریث کے وقت عزت اور انصاف کی رو سے جو صاف و صریح طریق عمل ہوگا اس کے اختیار کرنے میں پس و پیش نہ کیا جائے گا بلکہ استقلال سے کام لیا جائے گا ۔" یہ بات لارڈ ڈلہوزی کے لیے مختص تھی کہ " عزت اور انصاف کی رو سے " جو اصول معین کیے گئے تھے ان کو وہ عملی جامہ پہنائے ۔ دو ایک غیر اہم ریاستوں کے سوا جن کا خاص حالات میں سابق میں الحاق کر لیا گیا تھا لارڈ ڈلہوزی کے عہد سے پہلے تو ان اصول پر کبھی عمل ہی نہیں کیا گیا تھا ۔

اس حکمت عملی کا پہلا شکار والئی ستارا ہوا۔ یہ راجہ مرہٹہ طاقت کے بانی سیواجی کے خاندان کی یادگار تھا۔ ۱۸۱۸ء میں مارکوئیس ہیسٹنگز نے جب آخری پیشوا کی دکنی ریاست کا الحاق کر لیا تو اس وقت ستارے کی ریاست قائم کی جس کو ایک پشت گزر چکی تھی۔ ستارے کے راجہ نے اپنے ملک و قوم کے رسم و رواج کے موافق ایک لڑکے کو اپنی فرزندی میں لیا تھا جس کا وہ مجاز تھا۔ ۱۸۴۸ء میں اس راجہ نے انتقال کیا تو بمبئی کے گورنر وقت سر جورج کلارک نے اس تبنّیٰ ولیعہد کو ریاست ستارا کی گدی پر بٹھانے کی سفارش کی۔ گورنر کے ارکان کونسل نے اس پر گورنر کی مخالفت کی۔ اور کلارک کے جانشین کو تو اس رائے سے بالکل اتفاق ہی نہ تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے موقع پا کر یہ غیر فیاضانہ حرکت کی کہ اس ریاست کا الحاق کر لیا۔ یہ معاملہ مجلس نظماء کے سامنے پیش ہوا۔ ہنری سینٹ جورج ٹکر جس کا ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے اور ان صفحات میں بھی پھر آئے گا بڑا تجربہ کار شخص تھا اس نے ستارے کے الحاق کی مخالفت کی لیکن بحث کا نتیجہ پہلے ہی صاف ظاہر تھا اور مجلس نے ایک کثیر غلبۂ آراء سے الحاق کو منظور کر لیا۔

اس کے بعد ریاست کراولی کا مسئلہ غور طلب تھا۔ راجہ ستارے کے سال وفات کراولی کا راجہ بھی فوت ہوا اور راجہ ستارا کی طرح اس نے بھی انتقال سے پہلے ایک لڑکے کو اپنا متبنّیٰ کر لیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کی نظروں میں ستارا اور کراولی میں کچھ فرق نہ تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کراولی کی ریاست بھی حکومت ہند کو ملنی چاہیئے۔ مگر مجلس نظماء نے یہ تصفیہ کیا کہ کراولی انگریزوں کی دست نگر ریاست نہ تھی بلکہ حلیف تھی جس کی حفاظت انگریزوں کے ذمے تھی اس لیے اس ریاست کا الحاق نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ۲۶ جنوری ۱۸۵۳ء کے مراسلے میں وہ سب دلائل لکھے ہوئے ہیں جو مجلس نظماء اور لارڈ ڈلہوزی میں مابہ الاختلاف تھے۔

"کرنل لو نے متبنّیٰ کو تسلیم کر لینے کی رائے دی تھی اور سر فریڈرک کری نے اس تجویز کی تائید کی تھی مگر گورنر جنرل کا رجحان اس طرف تھا کہ یہ ریاست حکومت کو پھیر دی جائے جس سے مسٹر لوئس کو بھی بالکل اتفاق تھا۔

"گورنر جنرل نے اس اہم مسئلے پر موافق و مخالف دلائل کو غیر جانبدارانہ اور صحیح صحیح بیان کر دیا ہے۔ اس مقدمے کے تمام حالات پر خوب غور و خوض کرنے کے

بعد ہم یہ تصفیہ پسند کرتے ہیں کہ نرسنگھ پال کے متبنیٰ بھرت پال کو کراولی کا راجہ ہونے کی منظوری دینا چاہیئے۔

"اس نتیجے پر پہنچنے میں ہم ان اصول سے انحراف کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ جن کو ہم نے ستارا کے مقدمے میں اپنے ۲۴ر جنوری ۱۸۴۹ء کے مراسلے میں ضبط تحریر میں لایا ہے ...... لیکن ہماری نظروں میں ستارا اور کراولی کے حالات میں ایک بین فرق ہے جس پر گورنر جنرل نے اپنی یادداشت میں کافی توجہ اور لحاظ نہیں کیا۔ ریاست ستارا انگریزی حکومت کے عطیہ اور ایما کی بنا پر حال ہی میں قائم کی گئی تھی لیکن کراولی راجپوتوں کی ایک قدیم ریاست ہے جو اس وقت سے اپنے رئیس کے زیر نگیں ہے جب ہندوستان میں انگریزوں کا نام ونشان تک نہ تھا"

نظماء کے اس مراسلے سے کمپنی کی اعتدال پسندی کے وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔ ستارا مرہٹوں کی ایک بہت معمولی ریاست تھی اور اس کے الحاق میں کوئی سیاسی خطرہ نہ تھا۔ کراولی راجپوتوں کی ریاست تھی اور اس کے الحاق پر ممکن تھا کہ تمام راجپوتانہ بدظن ہو جاتا۔ "انجمن اصلاح اہل ہند نے مسٹر ڈکنسن کی رہنمائی میں جو ہندوستان کا مخلص اور سچا دوست تھا کراولی کے الحاق کی ناواجبیت پر عوام کی توجہ منعطف کرائی اور یہ کہہ کر دھمکی بھی دی کہ دارالعوام میں مسٹر بلیکٹ اس مسئلے پر ایک تحریک بھی پیش کرنے والے ہیں۔ غرض انگلستان کی حکومت وقت نے بدنامی سے بچنے کے لیئے گورنر جنرل کو اس معاملے سے دست کش ہو جانے کا حکم دیا۔

صوبۂ متوسط میں ریاست سنبھالپور کا راجہ لاولد تھا اور کسی کو متبنیٰ کیے بغیر فوت ہو گیا۔ اس پر سنبھالپور کا بھی الحاق کر لیا گیا۔ مگر ایک اور نہایت ہی اہم اور تاریخی مقدمہ تصفیئے کے لیے پیش ہوا۔ جھانسی کا راجہ گنگا دھر راؤ نامی نومبر ۱۸۵۳ء میں ایک لڑکے کو جس کا نام بعد میں دمودھر گنگا راؤ رکھا گیا تھا اپنا متبنیٰ کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔ راجہ نے مرتے وقت دو انگریزوں یعنی سیاسی وکیل اور سپہ سالار کے سامنے جو جھانسی میں مقیم تھے۔ اس تبنیت کو تسلیم کر لیا اور صدر حکام کے موسومہ خطوط ان تک پہنچا دینے کے لیے ان دو انگریزوں کو دیئے تھے اور اپنی بیوی اور متبنیٰ کو ان کے برے بھلے کی خبر رکھنے کے لیے حکومت ہند کے حوالے کیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کی رائے ہوی کہ

"اگرچہ یہ تبنیت خانگی املاک کے انتقال حقِ وراثت کے لیے کافی تھی مگر ریاست کے انتقالِ حکومت کے لیے نہیں" اس پر اس نے اس ریاست کا الحاق کر لیا۔

انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں جھانسی کی ریاست نے انگریزوں کے نمایاں خدمات انجام دیے تھے۔ راجہ جھانسی نے ۱۸۲۵ء میں کلپی کو بچا لیا تھا جس پر لارڈ ولیم بنٹنک نے ۱۸۳۲ء میں سر دربار نہایت ہی اچھے لفظوں میں اس کی تعریف کی اور شکریہ ادا کیا تھا۔ راجہ نے اپنے خطابوں میں "فدوی بادشاہ جم جاہ انگلستان" کا اضافہ بھی قبول کر لیا تھا۔

الحاق کے بعد بیوہ رانی نے حکومت ہند کے پاس اپنے خاندان کی وفاداری کا حوالہ دیتے ہوئے نظر ثانی کی التجا پیش کی اور جھانسی کے وکیل سیاسی میجر میلکم نے اس بیان کی تائید ان لفظوں میں کی کہ "میرے خیال میں بائی صاحبہ نے ریاست جھانسی کی وفاداری اور عقیدت بیان کرنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کیا کیونکہ یہ ریاست اس وقت سے ہماری حکومت کا ساتھ دے رہی ہے جبکہ موقع بڑا نازک تھا ایک طرف تو اس کے ورغلانے کے لیے ہر طرح کا سامان ہو رہا تھا اور دوسری طرف ہماری حکومت کو وہ عروج نہ تھا جو اب اسے حاصل ہے" میجر میلکم نے بیوہ رانی کی تعریف میں یہ لکھا کہ "اس خاتون کی کردار نہایت ارفع و اعلیٰ ہے اور جھانسی میں ہر شخص اس کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے" لیکن لارڈ ڈلہوزی نے نہ تو ریاست کی تاریخ گزشتہ سے اپنے دل پر کچھ اثر لیا اور نہ موجودہ رانی کی حیثیت اور اخلاق سے برخلاف اس تجویزات دل میں ٹھانی تھی اسی پر اڑا رہا اور کسی کی ایک نہ سنی۔

اس الحاق سے پہلے جھانسی کی جو وفادار اور دوستانہ ریاست تھی اب وہی انگریزوں کی دشمن جانی بن گئی اور ایک اعلیٰ اخلاق رکھنے والی خاتون کی یوں قلب ماہیت ہوی کہ وہ بھی رفتہ رفتہ ایک سنگدل اور انتقام جو عورت بن گئی۔ جھانسی کی یہی رانی تھی جس نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو اکسایا اور اس میں شریک ہو کر باغیوں کو ہر طرح کی مدد بھی دی۔ اسی نے جھانسی میں ایسی خونریزی ہونے دی جو اس ہنگامے میں سب مقامات سے زیادہ ہوی تھی اس نے مردانہ لباس زیب تن کیے انگریزوں کی فوج کا مقابلہ کیا اور اپنی قوم کے سب بہادروں میں ایسی بہادر ثابت ہوی کہ تلوار ہاتھ میں لیے جان پر کھیل گئی اگر جھانسی کی اس رانی کو موقع ملتا تو وہ اپنی چھوٹی سی ریاست میں ایک نہایت قابلہ اور نیک نہاد منتظمہ ثابت ہوتی جیسی اور بہت سی ہندو عورتیں ہوی ہیں جن کا ذکر موجودہ زمانے کی تاریخ میں آیا ہے لیکن اس طرح کا دردناک انجام اس کی تقدیر کا لکھا ہو گیا۔ اور موجودہ زمانے کے ہندوستان کی داستانوں میں اسے ہندوستان کی "جون اوف آرک" کہکے لوگ یاد کیا کرتے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا یکے بعد دیگرے الحاق کر لیا گیا لیکن "قانون بازگشت" کے تحت جتنے الحاقات عمل میں آئے ان میں سب سے اخیر مگر سب سے زیادہ اہم ریاست ناگپور کا الحاق تھا۔ راگوجی بھونسلہ راجہ ناگپور نے ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۳ء میں انتقال کیا۔ اس کی بیواؤں میں سے ایک نے اپنے ایک نوجوان رشتہ دار کو جو اپا صاحب کے نام سے مشہور تھا اپنا متبنیٰ اقرار دیا۔ یہ تبنیت ہندوؤں کے قانون کی رو سے بالکل جائز تھی مسٹر مینسل نامی رزیڈنٹ نے اس کے ذمہ کے نام جو نافذ العمل ہدایات صادر کی تھیں ان پر عمل کر کے یہ تو اس تبنیت کی ممانعت کی اور نہ تبنیت کے رسوم کی تکمیل میں خاص طور پر کوئی مدد دی البتہ تبنیت کو تسلیم کرنے کی سفارش اس نے کی ۲۸ر جنوری ۱۸۵۴ء میں لارڈ ڈلہوزی نے ایک یادداشت قلمبند کی تھی جس میں اس وسیع و آباد ریاست کے الحاق کا بھی ذکر ہے۔

براڑ کا وسیع اور زرخیز ملک جس میں روئی کی پیداوار کثرت سے ہوتی تھی ایک دوسرے حیلے سے انگریزوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ عہد معاونت کے بعد جو فوج سرکار نظام کے خرچ پر ممالک محروسہ سرکار عالی میں رکھی گئی تھی وہ بہت ہی بیش مصارف تھی اس لیے سرکار عالی پر ۵۰۰۰۰۰ پونڈ بقایا ہو گیا تھا۔ گورنر جنرل کا ایما یہ تھا کہ وہ براڑ کے علاوہ کرشنا اور تبھدرا کے دوآبے کا زرخیز خطہ اس قرض کی ادائی اور فوج کے آیندہ مصارف کی کفالت میں لینے آمادہ ہے جب اس عہد نامہ کا مسودہ نظام وقت کے سامنے پیش ہوا تو نظام نے اس پر اعتراض بھی کیا مگر سننے والا کون تھا۔ نظام نے پوچھا کہ کیا شصت سالہ اتحاد کا یہی انجام ہے اور یہ بھی کہا کہ اس قلمرو کا ایک ثلث حصہ یوں چھین لینے سے رعایائے ملک کی نظروں میں رئیس کی سبکی ہوتی ہے نظام کی سب ردّ و کد بے سود ہوی اور عہد نامے پر بالآخر دستخط کرنے ہی پڑے۔ اس کے بعد ہی نظام وقت نے رحلت کی۔[1]

لارڈ ڈلہوزی کے ایک اور الحاق کا بیان باقی ہے یعنے سلطنت اودھ کا۔ اودھ کی خرابی حکومت اس کے الحاق کا باعث ہوی اور کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اس مضمون پر سرکاری کاغذات پڑھنے اور ان لوگوں کی شہادت جانچنے کے بعد جن پر انگشت نمائی ہو نہیں سکتی اور جو اودھ سے ہمدردی بھی رکھتے تھے جیسے سلیمن اور اوٹرم یہ کہہ سکے کہ اودھ میں بدنظمی اور اندھیر نہ تھا۔ پھر بھی یہ ممکن نہ تھا کہ اس بدنظمی کی اصلاح کی جائے جنرل سر ولیم سلیمن نے جو ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۴ء تک لکھنؤ میں رزیڈنٹ تھا حکومت ہند کے پاس اودھ کی اصلاح نظم و نسق کے منصوبے بہ اصرار پیش کر رہا تھا اور اس کو ان تجاویز

[1] اس کے بعد نظام نے جملہ واجب الادا قرض کے ادا کر دینے کی شرط پر براڑ کی واپسی کے لئے جتنی تحریکات پیش کیں وہ سب بے سود ثابت ہوئیں اور حال ہی میں برطانوی حکومت ہند کو براڑ دوامی پٹے پر دیدیا گیا۔

کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ وہ اپنی نیک نامی تک معرض خطر میں ڈالنے کے لیے تیار تھا لیکن لارڈ ڈلہوزی کے سر پر اصلاح کے بجائے الحاق کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ایک یادداشت میں جو اس موضوع پر مشورہ لینے کی شکل میں پیش کی گئی تھی یہ لکھا کہ انگریزی حکومت دیسی ریاست میں اصلاح کرنے کی ذمہ داری عرق ریزی اور لاحقہ خطرات کو اپنے سر لینے کے لیے تیار ہے تو ایسی ریاست کے محاصل کے فاضلات اپنے زیر تصرف لانے کی بھی وہ مستحق ہے۔ لارڈ ڈلہوزی کا الحاق ممالک کا یہی جوش تھا جس کی وجہ سے لارڈ ڈلہوزی کسی جگہ فوری کوئی چارہ کار اختیار نہیں کر سکا اور جب کہیں خرابی بڑھ چلی تو یہ گویا اسی انتظار میں رہتا تھا کہ بے دست و پا ریاست پر فوراً لپکے اور اس کو بھی کمپنی کی عملداری میں شامل کرلے۔

لارڈ ڈلہوزی نے نظماء کے سامنے اودھ کے متعلق تین[۲] منصوبے پیش کیے تھے۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ (۱) یا تو شاہ اودھ ایک مدت معینہ کے لیے اپنی سلطنت انگریزوں کے زیر انتظام کر دے (۲) یا بادشاہ کا شاہی تزک و احتشام برقرار رکھ کر انتظام مملکت ہمیشہ کے لیے کمپنی کو تفویض کر دیا جائے (۳) یا اس ریاست کا حسب ضابطہ کلیتاً انگریزوں کی قلمرو سے الحاق کر لیا جائے۔ اسی وقت بنٹنک کا سا حکمراں اگر کوئی ہوتا تو پہلے منصوبے پر کاربند ہوتا۔ خود لارڈ ڈلہوزی نے دوسری تدبیر اختیار کرنے کی تائید کی تھی لیکن مجلس نظما نے تیسری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۱ نومبر ۱۸۵۵ء کے مراسلے میں جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "یہ ایک ایسی طرز تحریر کا نمونہ ہے جس میں نہایت ہی اہم ہدایات تو دی جائیں مگر اس طرح کہ لکھنے والے پر کوئی ذمہ داری ہی عاید نہ ہو سکے"، نظماء نے اودھ کے الحاق کے لیے احکام صادر کر دیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ لارڈ ڈلہوزی ہندوستان میں اپنی خدمت کا جائزہ دینے سے پہلے ان احکام کی تعمیل کروا دے۔ ہندوستان میں آٹھ سال تک مسلسل کام کرنے سے لارڈ ڈلہوزی کی صحت بالکل خراب ہو گئی تھی۔ اس کی عمر تینتالیس (۴۳) سال سے زیادہ نہ تھی مگر یہ قبل از وقت بوڑھا ہو گیا تھا اور اس وقت اس قدر بیمار تھا کہ چل پھر نہیں سکتا تھا با ایں ہمہ اس نے مجلس نظماء کے احکام کی فوری تعمیل کا وعدہ کر لیا جس کو اس نے ایفا بھی کیا۔ صوبۂ اودھ کا الحاق ۱۳۔ فروری ۱۸۵۶ء کے اعلان عام کی رو سے انگریزی عملداری کے ساتھ ہو گیا۔ اسی مہینے کی آخری تاریخ

لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کی خدمت سے سبکدوش ہوگیا۔ اس نے اپنے طبیب سے کہا کہ "اس مہینے میں صرف انتیس دن کا ہونا بھی کیا ہی اچھا ہوا ورنہ میں تو اور دو دن تک بھی نہیں ٹھیر سکتا تھا۔"

ہم نے پچھلے صفحات میں لارڈ ڈلہوزی کے فتوح والحاقات کو مختصراً بیان کردیا ہے۔ اس نے اپنے ہشت سالہ نظم ونسق کے اثنا میں آٹھ بڑی بڑی ریاستوں کا الحاق کرلیا تھا۔ ان الحاقات کے مختلف وجوہ بیان کیے گئے تھے۔ مثلاً پنجاب کا اس لیے الحاق کرلیا گیا تھا کہ اس ملک میں بغاوت پھیل گئی تھی اگرچہ انگریزی حکومت نے چھوٹے چھوٹے فرماں رواؤں کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے ان میں ایسی بغاوتوں کے فرو کرنے کا بھی ذمہ لیا تھا۔ جنوبی برما سے محض ان انگریز تاجروں کی شکایتوں کے پیش ہونے پر جو اس ملک سے تجارت کرتے تھے اس ملک کا الحاق کرلیا گیا تھا۔ براڑ اس غرض سے چھین لیا گیا تھا کہ نظام اپنا قرض بیباق نہیں کرسکتے تھے سلطنت اودھ کا اس لیے الحاق کرلیا گیا تھا کہ وہاں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ سنبھالپور کا الحاق اس بناء پر کرلیا گیا تھا کہ آخری راجہ کا کوئی حقیقی وارث نہ رہا تھا۔ ستارا جھانسی اور ناگپور کا الحاق اس وجہ سے کرلیا گیا تھا کہ لارڈ ڈلہوزی نے ان والیان ریاست کے متبنیٰ ورثاء کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔

ہم ان مباحث میں پڑنا نہیں چاہتے جو ان تجاویز کے جواز وعدم جواز پر ہوتے رہے ہیں۔ آج تک کسی غیر جانبدار مورخ نے از روئے انصاف لارڈ ڈلہوزی کی حکمت عملی اور افعال کے جواز کی صورت پیش نہیں کی عہد وکٹوریہ کے ایک پرمغز صاحب قلم مسمیٰ سیلی نے ڈلہوزی کے جرائم کا تقابل پروشیا کے فریڈرک اعظم کے جرائم کے ساتھ کرکے ان کو قابل معافی قرار دیا ہے لیکن یہ تقابل کسی قدر غلط ہے۔ فریڈرک کی لڑائیاں اپنے ہم طاقت وہم پلہ دشمنوں کے ساتھ تھیں اور اس کے جرائم کا کفارہ اس کا وہ مقصد اعلیٰ سمجھنا چاہیئے جس سے وہ اپنے وطن کو بھی یورپ کی بڑی بڑی اقوام کے پہلو بہ پہلو کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ ڈلہوزی نے ان لوگوں پر پنجہ مارا جن کو اس کی مقاومت کی تاب نہ تھی۔ اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وسیع شاہنشہی اور کثیر محاصل میں اضافہ کرنے کی خاطر ایک قدیم قانون میں اپنے مطلب کے

موافق غلط معنی پیدا کرکے خود کو ذلیل بھی کیا۔

قدیم شہنشاہی پسند حکمرانوں میں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی نجات اور ترقی اسی میں ہے کہ سوا راج اور حکومت خود اختیاری ان سے چھین لی جائے لارڈ ڈلہوزی آخری شخص گزرا ہے۔ ہندوستان سے مراجعت کے بعد آخری چند سال اس کی زندگی کے ایسے گزرے جس میں اس نے وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جبکہ شہنشاہی پسند خیالات اس وقت قابل قبول نہیں رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی برخاست کردی گئی اور "اصول بازگشت" خود اس کی فرماں روا ملکہ نے منسوخ کر دیئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہندوستانیوں کی خود اپنی کوششوں سے ترقی کرنے پر زیادہ بھروسہ کیا جانے لگا۔ اسی زمانے میں ایک "قدامت پسند" وزیر ہند سر اسٹفورڈ انارتھ کوٹ نے ریاست میسور پر ایک دیسی رئیس کو دوبارہ مسلط کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ ایک اور "قدامت پسند" وزیر ہند لارڈ سالسبری نے صرف بدنظمی اور جرائم کی بنا پر ریاست بڑودہ کا الحاق کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میسور کی ریاست کا وہاں کے قدیم شاہی خاندان کو واپس دیدینا اور بڑودہ پر حکمرانی کے لیے ایک نئے اور موزوں شخص کا انتخاب کرنا ان تمام سیاسی امور میں جو وزرائے دولت برطانیہ نے ہندوستان کے لیے آج تک انجام دیے ہیں سب سے زیادہ دانائی اور فیاضی کا کام تھا چنانچہ آج ان دونوں ریاستوں سے جن پر دیسی روسا حکمرانی کر رہے ہیں ہندوستان کے کسی اور حصے کا انتظام بہتر نہیں ہے۔

تیسرا باب

شمالی ہند میں بندوبست ارضی

انگریزوں کے صوبۂ بنگالہ (جس کا بانی لارڈ کلائیو تھا) کے حدود میں وارن ہیسٹنگز اور مارکوئیس ولزلی کے عہد حکومت میں آناً فاناً توسیع ہوی۔ ۱۷۷۵ء میں نواب اودھ کے انتقال پر اس کے جانشین کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کی رو سے وارن ہیسٹنگز نے بنارس اور اس کے چند ملحقہ اضلاع کا الحاق کر لیا۔ ۱۸۰۱ء میں لارڈ ویلزلی کے دباؤ میں آکر نواب اودہ نے الہ آباد اور اس پاس کے چند اضلاع بھی انگریزوں کے تفویض کر دیے اور یہی "ممالک مفوضہ" کہلاتے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی آگرہ اور گنگا کا دوآبہ انگریزوں نے مرہٹوں سے فتح کر لیا تھا مگر لارڈ ویلزلی کے عہد حکومت میں اس کو دوبارہ فتح کرنا پڑا اور اب یہی ممالک "مفتوحہ" کہلاتے ہیں۔

بنارس میں اراضی پر مطالبہ سرکار ۱۷۹۵ء میں جس طرح دوامًا مقرر کر دیا گیا تھا اسی طرح کا دوامی بندوبست ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۵ء میں ممالک مفوضہ اور مفتوحہ میں بھی کرنے کا وعدہ تو کیا گیا مگر یہ کبھی ایفا ہی نہیں ہوا کیونکہ ۱۸۰۸ء میں آر ڈبلیو کاکس اور ہنری سینٹ جورج ٹکر دونوں نے جو کمشنران خاص تھے ان ممالک میں فوراً دوامی بندوبست کرنے کی مخالفت کی تھی [1]۔

---

[1] ہنری سینٹ جورج ٹکر جس کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے ہندوستان میں مالگزاری کا دوامی بندوبست

بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آیندہ

طول طویل مباحثوں کے بعد مجلس نظما نے آخر کار ۱۸۲۱ء میں شمالی ہند میں دوامی بندوبست کرنے کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ ۱۸۲۳ء کا دستور العمل (۷) منظور کر لیا گیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ جاگیری خام لگان ۸۳ فیصدی تک لینے کا سرکار کو حق حاصل ہے اور یہ کہ وقتاً فوقتاً بندوبست پر نظر ثانی کرنے کی بھی سرکار مجاز ہے۔

بیشک لارڈ ولیم بنٹنک مستحق شکریہ ہے کہ اسی نے جو بے انتہا لگان پہلے سے تھا اس میں تخفیف اور طویل المیعاد بندوبست کی ترویج کی۔ ۱۸۳۳ء میں ایک کانفرنس بھی الہ آباد میں منعقد کی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۸۳۳ء کا دستور العمل (۱۱) منظور ہوا اور یہی شمالی ہند کے بندوبست اراضی کا اساسی اصول متصور ہوتا ہے۔ سرکاری مطالبے میں تخفیف کرکے وہ لگان کا ۶۶ فی صدی مقرر کیا گیا اور بندوبست سی ۳۰ سالہ کر دیے گئے۔

یہ اہم کام رابرٹ مارٹنز برڈ کے ذمے کیا گیا اور اس نے ایسی ہی ہمدردی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا جیسی لارڈ ولیم بنٹنک نے اس حکمت عملی کی تشکیل میں دکھائی تھی۔ اس بارے میں جو طریق عمل برڈ نے اختیار کیا تھا اس کو کئی سال کے بعد اس نے دار العوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے

کرنے کا بہت بڑا حامی تھا۔ ۱۸۰۸ عیسوی میں اس نے اس بندوبست کے التوا کی تحریک کی تھی نہ کہ اس سے بالکل دست بردار ہو جانے کی۔ اس واقعے کے کئی سال بعد اس نے لکھا تھا کہ ”۱۸۰۸ عیسوی میں اس تجویز کی جس کو متعدد منتظمین مملکت نے یکے بعد دیگرے ملک کی خوشحالی کے لیے نہایت ضروری تصور کیا تھا قوۃ سے فعل میں لانے کے لیے مامور ہوا تھا۔ اگرچہ مجھکو اس سے بالکل اتفاق تھا کہ یہ تجویز بجائے خود نہایت دانشمندانہ اور مفید تھی اور ایسے اصول پر مشتمل تھی جن سے انجام کار فائدہ کی بہت کچھ توقع تھی لیکن میں نے محض اس بنا پر اس کے التوا کا مشورہ دیا تھا کہ ہم اس وقت بلحاظ حالات اتنے بڑے کام کے سرانجام کے لیے بالکل تیار نہ تھے لیکن مجھکو کبھی یہ خیال تک نہ ہوا کہ اس تجویز کے اصل اصول سے یوں دست بردار ہو جانا چاہیے یا یہ کہ قابضان اراضی کو جن سے ہم نے بڑے وثوق کے ساتھ اور نہایت ہی باقاعدہ طریقے پر عہد و پیمان کیے تھے ان فوائد سے محروم کر دیا جائے جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا اور یہ کہ آخر کار اس مفروضے پر کہ ان کا وجود خارج کار اور اراضی پر ایک بار گراں ہے اُن کو بالکل نظر انداز ہی کر دیا جائے۔ وعدہ محو نہیں ہو سکتا خواہ اس کا ایفا نہ ہوا ہو“

(سوانح عمری ہنری سینٹ جورج ٹکر مولفہ کے۔ ص ۲۲۲)

یہ ہوتا تھا کہ ایک مقررہ رقبے یعنے پرگنے کے اندرون حدود جس قدر اراضی ہوتی تھی اس کا ایک سرسری تخمینہ قائم کر لیا جاتا تھا۔ پھر یہ ہوتا تھا کہ ہر کھیت کو شامل کر کے زمین کا ایک نقشہ تیار کیا جاتا تھا اس کے بعد فنی پیمایش کی جاتی تھی جس میں مزروعہ اور غیر مزروعہ دونوں قسم کی اراضی بتائی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس تمام و کمال رقبے پر محصول اراضی لگایا جاتا تھا اور آخر میں محصول کی جملہ رقم اس رقبے میں جتنے گاؤں ہوتے تھے ان پر تقسیم کر دی جاتی تھی۔

یہ خیال کرنا بہت آسان ہے کہ پرگنے پر محصول اراضی کا تعین اور اس پرگنے کے قصبات پر اس کی تقسیم یہی دو باتیں ایسی تھیں جن پر زراعت پیشہ سخت تردد کے ساتھ نظریں لگائے رہتے تھے۔ اس نظام میں جو کمزوری تھی وہ درحقیقت تعین محصول ہی تھی۔ اگرچہ لگان کے ۶۶ فی صدی حصے کا مطالبہ کرنا ہی ایک اصول قائم کر دیا گیا تھا لیکن خود اس لگان کا تعین قیاس پر مبنی تھا بالخصوص ان اراضی پر جو یہی جماعتوں کے زیر قبضہ تھیں مارٹنر برڈ کا بیان ہے کہ "اس کے بعد ہم اس خطے پر کیا مالگزاری لگائی جاتی ہے اس کے متعلق ہم حسب ذیل امور کی تحقیقات شروع کر دیتے تھے کہ سابق میں یہاں مالگزاری کی رقم کتنی وصول ہوتی تھی۔ خود رعایا کا بیان کیا ہے اور فصل اور مٹی کی نوعیت کیا ہے اس کے علاوہ ان تمام مختلف ذرائع سے بھی جن کو تجربے سے ہم نے حاصل کیا ہے اس بات کی دریافت مکمل کرتے تھے کہ اب اس اراضی پر سرکاری مطالبہ کیا ہونا چاہیے جو از روئے انصاف درست سمجھا جائے گا"۔

اس طریقے پر عمل کرنے میں بندوبست کے عہدہ داروں کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی اور اسی لیے ہمیشہ یہ غیر متیقن رہتا تھا کہ بندوبست کے بعد زراعت پیشہ لوگوں پر کتنی رقم واجب الادا نکلتی ہے۔ متعلقہ مواد اس درجہ موہوم اور ناقابل اعتماد ہوتا تھا کہ اس پر خود بندوبست ہی کے دو عہدہ دار متفق الرائے نہیں ہو سکتے تھے اور ایک بندوبست کے وقت جو مالگزاری مقرر کی جاتی تھی وہ دوسرے بندوبست کے وقت بدل دی جاتی اور عموماً بڑھا دی جاتی تھی۔ جب زراعت پر محصول اس طرح غیر معین رہے تو پھر زرعی ترقی اور سرسبزی ناممکن ہے۔ دوامی بندوبست کے مویدوں کا مقصد یہ تھا کہ اجتماع دولت ہو گر یہ اس لئے ممکن الوقوع نہیں معلوم ہوتا تھا کہ

دولت اور خوش حالی کی علامتوں کے ظاہر ہوتے ہی تجدید بندوبست کے وقت اراضی پر پہلے سے زیادہ سنگین محصول لگا دیا جاتا تھا۔

اس نقص کے باوجود جس بندوبست کی ابتدا ۱۸۳۳ء میں ہوئی تھی اس کی تکمیل ہمدردانہ طریقہ پر کی گئی جس سے شمالی ہند کے کسانوں کو جن پر انگریزی حکومت کے ابتدائی تیس سالہ دور میں سنگین محصول لگائے گئے تھے اور جن کے ساتھ مختصر المیعاد بندوبست کیے گئے تھے آیندہ کی پریشانیوں سے نجات حاصل ہوئی۔ مارٹنز برڈ مسلسل نو سال تک عرق ریزی کرتا رہا اور ۱۸۴۲ء میں ہندوستان کو خیرباد کہنے سے پہلے اپنے بندوبست کے جو قریب الختم تھا نتائج پر اس نے ایک مکمل رپورٹ پیش کی۔

دوامی بندوبست کا خیال ترک کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی برڈ کا ارادہ اور خواہش یہی تھی کہ ان اضلاع میں جہاں بہت سی قابل زراعت زمین زیر کاشت آ چکی تھی اس کے مقررہ بندوبست کو دوامی سمجھا جائے۔ اس کی نہایت ہی واضح رپورٹ سے ہم ذیل کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

پرگنہ دہلی

اس پرگنے کا کچھ حصہ جسکی آبپاشی نہروں سے ہوتی تھی نہایت آباد اور خوشحال تھا سابق میں یہاں اراضی پر بے انتہا مالگزاری لگا دی گئی تھی لیکن اب وہ بات نہیں ہی سرکار نے جو مالگزاری اب مقرر کی تھی وہ بالکل انصاف پر مبنی اور واجبی تھی۔ اس پرگنے کے باقی حصے میں جہاں ذرائع آبپاشی مفقود تھے کسانوں کو اپنی محنت کا بہت ہی قلیل معاوضہ ملتا تھا۔

"اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ آئندہ بندوبست پر نظر ثانی کرنے کے وقت دہلی کی عملداری میں اضافۂ رقم کی توقع نہیں ہے الّا اس کے کہ سرکار وہاں بھی ایک نہر کھول دے۔"

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ½ ۳۶ سیر ملتا تھا۔

پرگنہ میرٹھ

ضلع سہارنپور۔ "اس ضلع کے بعض حصوں میں اراضی پر بے انتہا محصول لگا دیا گیا

تھا اور محاصل وصول کرنے کے طریقے بھی بہت سخت اور بالکل خلاف قانون اختیار کیے گئے تھے۔

بعض ایسی جماعتوں میں جو لوگ نہایت جفاکش اور محنت کی روٹی کھانے والے تھے وہی سخت پریشان حال تھے۔ سرکاری مطالبہ سب پر مساوی مقداروں میں کرنے کی ہر طرح کوشش کی گئی لیکن پھر بھی بہت کچھ غیر مساوات اب بھی باقی ہے"۔ اس ضلع کے بعض مواضع میں موجودہ بندوبست کے ختم میعاد پر سرکاری محاصل میں اضافہ ہوسکتا تھا مگر "قابلِ زراعت زمین کا ایک خمس حصہ بلا محصول چھوڑ دینا ضروری تھا تاکہ مویشیوں کے لیے وہاں گھانس اور دوسری قسم کا چارہ وغیرہ پیدا ہو یا اتنا حصہ یونہی افتادہ رہے کیونکہ بعض دفعہ اراضی چھوڑ کر لوگ چلے بھی جاتے ہیں"۔ ہردوار سے الہ آباد تک آبپاشی کی جو نہر گئی ہے اور جو ابھی زیر تعمیر ہے اسکی تکمیل پر سرکاری محاصل میں متوسط اضافے کی توقع ہے۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۴۰ سیر ملتا تھا۔

ضلع مظفر نگر جہاں شرح محصول اس وقت بہت کم ہے اس حصے میں آیندہ بندوبست پر محاصل میں کچھ اضافے کی امید ہے لیکن "ایسے مواضع میں جہاں قابل زراعت زمین کی آدھی بھی زیر کاشت نہیں اس کے باوجود وہاں اسی معیار نرخ پر محصول وصول ہوتا رہا ہے جو کاشت کی زمینوں کے لیے مقرر ہے تو پھر مطالبۂ سرکاری میں بھی اضافہ نہیں ہونا چاہیئے"۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ½ ۳۷ سیر ملتا تھا۔

ضلع بلند شہر - یہ ضلع بہت پست و زبون حالت میں تھا اور یہاں لگان بھی بہت کم مقدار میں لگایا گیا تھا سرکاری محاصل میں تین طرح سے اضافے کی توقع کیجاسکتی ہے ایک تو آبپاشی کی نہر کی تعمیر تکمیل کو پہنچنے پر دوسرے زیادہ کاشت ہونے پر تیسرے شرح محصول اراضی بڑھنے کے اعتقاد پر۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۳۳ سیر ملتا تھا۔

ضلع میرٹھ - یہ ضلع بہت اچھا تھا۔ آیندہ بندوبست پر سرکاری محاصل میں اضافے کی توقع کیجاسکتی ہے بشرطیکہ کاشت بھی زیادہ کی جائے"۔ "لیکن نہروں کے ذریعہ آبپاشی کرنے سے محاصل

میں جو اضافہ ہو سکتا ہے اس کے سوا صرف شرح محصول میں اضافہ کرنے سے محاصل سرکار میں یہاں اضافے کی کوئی امید نہیں"۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۳۲ سیر ملتا تھا۔

ضلع علیگڈھ۔ یہ ضلع نہایت خوش حال تھا اور یہاں کاشت بھی خوب ہوتی تھی۔ محاصل میں آیندہ اضافے کی توقع صرف مذکورالصدر چھ پرگنوں میں کی جاسکتی تھی مگر دوسرے پرگنوں میں نہروں کے ذریعہ آبپاشی کیے بغیر کسی اضافہ کی گنجائش نہ تھی اس ضلع کی دیہی جماعتوں کو نیل کے تخلبند مارٹن اور مکلینٹک نیز دیسی مہاجنوں نے بڑے بڑے رقوم پیشگی دیے تھے جس پر ان لوگوں کو بعد میں تکلیف اٹھانی پڑی اور ان رقوم کے لیے جو زمینیں مکفول تھیں وہ سب فروخت کرنی پڑیں۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۳۹ سیر بکتا تھا۔

پرگنۂ آگرہ

ضلع آگرہ۔ اس ضلع کی تمام زمین زیر کاشت تھی اور لگان کا تعین بھی ہو چکا تھا۔ "آیندہ کسی زمانے میں بھی اس ضلع کے محاصل میں اضافے کی توقع نہیں اس لیے جمع یا مالگزاری کی موجودہ رقم کو دواماً مقرر کر دینا چاہیے، یہاں کی پیداوار میں ترقی یا کاشت کے طریقے میں اصلاح یا آبپاشی میں اضافے کی امید اسی وقت کی جاسکتی ہے جب کہ مزارعین کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ اگر وہ اپنی محنت اور دولت ان پر صرف کر دیں تو اس کا تمام فائدہ بلا شرکت غیرے انھیں کو ملے گا۔

ضلع متھرا۔ اس ضلع کی سب زمین بھی زیر کاشت تھی" موجودہ دھارے پر جو محاصل وصول ہوتے ہیں وہی رقم دواماً مقرر کر دینی چاہیئے آیندہ بھی کسی اصلاح و ترقی کی امید نہیں بجز اس کے کہ لوگوں کو بلا شرکت غیرے اپنی اصلاح و ترقی سے مستفید ہونے کا یقین کلی ہو جائے"۔

ضلع فرخ آباد۔ اس ضلع کے بعض حصوں میں تمام زمین زیر کاشت تھی آیندہ بندوبست پر اس ضلع کے اور حصوں کے محاصل میں دو طرح سے اضافہ ممکن تھا ایک یہ کہ وہاں زیادہ کاشت ہونے لگے دوسرے دھارے میں بھی اضافہ کیا جائے۔

اگر نہروں کے ذریعہ آبپاشی بھی یہاں کی جائے تو اور اضافہ ہو سکتا ہے۔

ضلع مینپوری۔ اس ضلع کے بعض حصوں میں پوری کاشت ہوتی تھی اور اس پر مالگزاری بھی مقرر ہو چکی تھی مگر باقی حصے ایسے نہ تھے۔

ضلع اٹاوہ۔ یہاں پوری زمین زیر کاشت تھی اور اس کے لگان کا بھی تعین ہو چکا تھا۔ "آئندہ اضافے کی کوئی توقع نہیں بجز اس کے کہ نہروں کے ذریعہ آبپاشی کی جائے ورنہ موجودہ دھارا دوامی متصور ہونا چاہئے۔"

پرگنہ روہیلکھنڈ

ضلع بجنور۔ اس ضلع سے سابق میں لگان بہت زیادہ لیا گیا تھا اور حصول محاصل کے لیے جو ذرائع اختیار کیے گئے وہ بھی بہت سخت تھے۔ "مثلاً گروبداروں اور خریداروں کے نام ان کی مرضی کے خلاف جبراً انتقال املاک کر دینا۔ مہاجنوں سے ان کے کسی عذر کو سنے بغیر زبردستی قرض لینا اور ان مواضعات میں جو رعایا کے فرار ہو جانے کی تاریخ سے سرکاری عہدہ داران کے زیر انتظام تھے کاشت کا کام بیگاروں سے لینا وغیرہ۔" ان خرابیوں کی بعد کو اصلاح کر دی گئی۔ اور مالگزاری کی ایک واجبی رقم مقرر کی گئی لیکن اس کے تعین میں مساوات حاصل نہیں ہوئی۔

ضلع مرادآباد۔ اس ضلع کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں کیے گئے۔

ضلع بریلی۔ اس ضلع پر سابق میں بے انتہا محصول لگا دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعض حصوں پر ۱۸۳۷ء کے قحط کے شدید اثرات پڑے تھے۔ یہاں کے اکثر باشندوں نے بھوکوں مرنے کی تاب نہ لا کر لوٹ مار کرنے کے لیے ٹولیاں قائم کی تھیں۔ اکثر کاشتکار اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے حال کے بندوبست میں جو لگان مقرر کیا گیا ہے وہ مبنی بر اعتدال ہے۔

ضلع بدایون۔ بندوبست کے زمانے میں ضلع بھر میں بڑی تکلیف اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ بندوبست ایسے زمانے میں کیا جا رہا تھا جب کہ "بے اندازہ مالگزاری لگانے کی طرف عام رجحان تھا"۔ اسی لیے اس کے تعین کے بعد متواتر اس پر نظر ثانی ہوتی رہی اور رعایا کو اب بھی اس زیادہ ستانی سے پوری نجات حاصل نہیں ہوئی تھی۔

"اگر سرکار اور سرکاری عہدہ داران کو اس بات کا یقین ہو جائے (جس کی مجھکو امید ہے کہ اب تک ہو گیا ہو گا) کہ حد سے زیادہ مالگزاری وصول کرنے سے یقیناً نقصان ہوتا ہے اور دونوں تہیہ کریں کہ وہ انھیں مبنی بر اعتدال اصول پر کاربند رہیں گے جو سب سے پہلی دفعہ اب زیر عمل آئے ہیں تو بیشک طرفین کو بڑا فائدہ ہوگا۔"

ضلع شاہجہاں پور۔ سابقہ بندوبست میں یہ ضلع کثیر مالگزاری کی آفت سے بچ گیا تھا اور موجودہ بندوبست میں بھی اس پر لگان کا زیادہ بار نہیں ڈالا گیا تھا۔ یہ ضلع نہایت سرسبز حالت میں تھا۔

ضلع پیلی بھیت۔ سابق میں اس ضلع کے آدھے حصے پر بے انتہا لگان عائد کیا گیا تھا لیکن اب اس میں معقول تخفیف کر دی گئی تھی اور باقی آدھے حصے میں تعین لگان راجہ گیر نام سنگھ کے ساتھ کر لیا گیا تھا۔ اس ضلع کی آب و ہوا نہایت خراب تھی۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۲۰ ½ سیر بکتا تھا۔

پرگنۂ الہ آباد

ضلع کانپور۔ پہلے اس ضلع سے بے اندازہ مالگزاری وصول کی جاتی تھی مگر اب اس میں کمی کر دی گئی تھی۔ اس ضلع کے اکثر حصوں میں تمام زمین زیر کاشت تھی اور اس کے لگان کا بھی تعین ہو چکا تھا۔ نہروں سے آبپاشی ہونے کے سوا کانپور میں مطالبۂ سرکار میں اضافے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے موجودہ معیار دوامی متصور ہونا چاہیئے۔"

ضلع فتح پور۔ ضلع فتح پور پر بھی مذکور الصدر بیان صادق آتا ہے "نہروں کے ذریعہ آبپاشی ہونے پر جو اضافہ ممکن ہے اس کے سوا موجودہ لگان دوامی متصور ہونا چاہیئے۔"

ضلع الہ آباد۔ گزشتہ زمانے میں یہ ضلع بے اندازہ مالگزاری کی آفت سے بچ گیا تھا نہروں کے ذریعہ آبپاشی ہونے سے جو اضافہ ہو سکتا ہے اس کے سوا "موجودہ بندوبست کو دوامی ہی سمجھنا چاہیئے۔"

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۲۷ سیر ملتا تھا۔

پرگنۂ بنارس

ضلع اعظم گڈھ۔ یہ ضلع نہایت زرخیز تھا۔ یہاں ذرائع آبپاشی بھی اچھے تھے اور کاشت بھی خوب ہوتی تھی۔ بعض حصوں کی مالگزاری کا کاملاً تعین ہو چکا تھا اور اس میں آئندہ اضافہ نہیں ہونا چاہئے۔ باقی حصوں میں ”موجودہ میعاد کے ختم پر کاشت میں اضافہ کے تناسب ایک واجبی اضافہ ہو سکتا ہے لیکن دھارا نہیں بڑھانا چاہئے۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۲۹ ½ سیر تھا۔

ضلع گورکھپور۔ یہ ضلع نہایت زرخیز تھا اور اس کی عام حالت بھی بہت اچھی تھی۔ آئندہ کاشت نیز دھارے میں اضافہ ہونے پر سرکاری محاصل میں اضافے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی گیہوں روپے کو ۳۱ سیر تھا۔

برڈ کے بندوبست کے نتائج ذیل کے اعداد سے جو اس کی رپورٹ کے ضمیمہ نقشوں سے لیے گئے ہیں تفصیلی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس نقشے میں دس روپے ایک پونڈ انگلیشیہ کے مساوی قرار دیے گئے ہیں:

پرگنہ	ضلع	مجموعی رقبہ (ایکر)	زیر کاشت زمین (ایکر)	برڈ کا مشخصہ محصول اراضی (پونڈ)
دھلی	دھلی	۳۶۴۵۳۴	۱۷۴۶۰۵	۳۶۲۳۷
	رہتک	۸۴۴۶۶۶	۴۷۴۴۶۵	۶۲۸۳۱
	گرگاؤں	۱۱۶۰۴۳۷	۶۴۷۳۵۳	۱۰۱۴۲۴
	حصار	۱۶۵۷۹۷۵	۶۹۶۱۴۷	۳۸۰۳۰

میرٹھ	سہارنپور	۱۰۱۸۷۰۵	۶۰۶۸۴۷	۱۰۰۵۵۸
	مظفرنگر	۱۹۱۷۰۶	۳۹۲۳۷۷	۶۷۲۷۴
	میرٹھ	۱۷۷۶۴۳۰	۱۰۳۴۰۱۶	۲۸۱۵۶۱
	بلندشہر	۱۰۲۵۰۹۶	۵۹۲۶۳۰	۹۵۱۶۸
	علی گڈھ	۱۱۱۹۲۳۸	۹۰۰۵۶۲	۱۹۶۴۴۸
روہیلکھنڈ	بجنور	۱۰۲۷۵۳۳	۴۵۹۴۰۹	۱۱۲۲۳۷
	مرادآباد	—	—	۶۶۸۷۰
	بدایون	۱۴۵۰۴۱۸	۷۵۲۱۰۳	۱۱۰۳۰۶
	پیلی بھیت	—	—	۳۹۰۴۹
	بریلی	۱۱۱۶۱۷۴	۶۳۹۵۷۹	۱۲۶۳۴۵
	شاہجہانپور	۱۳۰۹۲۱۱	۶۵۱۵۴۹	۱۰۲۷۰۷
آگرہ	متھرا	۱۰۱۶۱۵۳	—	۱۵۲۷۲۸
	آگرہ	۹۳۵۸۲۵	۶۴۶۸۰۸	۱۳۹۲۹۷
	فرخ آباد	۱۲۴۷۲۸۸	۶۱۴۲۵۳	۱۴۹۵۷۵
	مینپوری	۱۲۸۰۹۲۷	۶۱۳۴۲۲	۱۳۸۲۳۸
	اٹاوہ	۱۰۷۱۷۵۶	۴۷۷۹۰۱	۱۳۱۰۹۳
الہ آباد	کانپور	۱۴۹۷۷۹۵	۷۸۲۲۷۶	۲۱۸۱۵۴
	فتح پور	۹۹۰۵۸۴	۵۰۶۹۰۵	۱۴۱۸۹۳
	الہ آباد	۱۷۹۰۲۴۴	۹۹۷۵۰۸	۲۱۵۶۵۰
بنارس	گورکھپور	۴۵۶۰۰۴۹	۱۹۲۷۲۳۴	۲۰۸۳۵۴
	اعظم گڈھ	۱۶۵۲۲۹۳	۷۷۳۶,۱۶	۱۵۱۷۸۸

مارٹنز برڈ نے نہ سالہ عرق ریزی کے بعد جس کام کو اس طرح اتمام کے قریب پہنچا دیا تھا وہ اُس صوبے کے لفٹننٹ گورنر کے ملاحظے میں پیش ہوا تو ۱۵ اپریل ۱۸۴۲ء میں اس سربرآوردہ عہدہ دار نے ایک پرمغز یادداشت اس پر قلمبند کی۔ اس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ بندوبست نہایت غور و خوض اور چھان بین کے ساتھ کیا گیا تھا اور اس کا مقصد صرف محاصل میں اضافے کی صورت پیدا کرنا نہ تھا اس نے سالانہ چار اقساط میں مالگزاری وصول کرنے کے طریقے کو منظور کر لیا اور حدود بندی اور تصحیح حسابات کے طریقے کو بھی بہت پسند کیا۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ تنخواہ دے کر ہر موضع میں جو کیداروں کو رکھنا گاؤں والوں کو اچھا نہیں معلوم ہوگا۔ اُس نے سخت سے سخت الفاظ میں ان ذیلی عہدہ داروں کو زجر و توبیخ کی جنھوں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے جوش میں زیادتی یہ کی کہ ان پٹوں کو بھی بازگشت کرا لیا جن پر لگان معاف تھا۔

"بغیر دریافت کیے بندوبست کے عہدہ داروں نے چپہ چپہ زمین جس پر لگان تک معاف تھا اور جس کی دیہی کتابوں میں کھتاونی بھی نہیں ہوئی تھی چھین لی حتیٰ کہ دس بیگوں کے اندر جو زمین بعد کے حکم سے بھی لگان سے مستثنیٰ کی گئی تھی اور جو $\frac{5}{6}$ اراضی کے زیر کاشت آنے تک کسی صورت قابل محصول نہیں سمجھی جاتی تھی وہ بھی لے لی گئی۔ ضلع فرخ آباد میں تو نہ عہد نامے کے شرائط کی اور نہ ان احکام کی جو سرکار نے براہ راست صادر کیے تھے کچھ پروا کی گئی اور وارن ہیسٹنگز اور لارڈ لیک جیسی ممتاز ہستیوں نے جن کارہائے نمایاں کا سرانجام کیا تھا ان کا بھی مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔"

جس طریقے سے موروثی مالکانِ اراضی کے حقوق میں مداخلت کی گئی تھی اس کی اور زیادہ پُرزور الفاظ میں لفٹننٹ گورنر نے مخالفت کی۔ ذیل میں اُس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

"راجۂ مینپوری کو جس کے پیشرو کی غیر متزلزل وفاداری کا جبکہ ہلکر کا لشکر ۱۸۰۴ء میں اُس ضلع کو تاخت و تاراج کر چکا تھا انگریزی سرکار نے اعلیٰ سے اعلیٰ لفظوں میں اعتراف کیا تھا بغیر حکم سرکار حاصل کیے محض اس مفروضے پر کہ

تعلقدار کے کیا حقوق ہونے چاہئیں ہمیشہ کے لئے نسلاً بعد نسل اس کے ۸۰۵ مواضعات میں سے ۱۱۶ مواضعات میں جو اس کے تعلقہ میں شامل اور انگریزی حکومت قائم ہونے سے کہیں پہلے اس کو ارثاً ملے تھے کسی قسم کی مداخلت کرنے سے محروم کر دیا گیا ہے۔"

ہر موضع کے معاملات میں ہمیشہ مداخلت کرنے کو لفٹننٹ گورنر پسند نہیں کرتا تھا۔ "ہر کھیت کی حالت وقتاً فوقتاً قلمبند کرتے رہنے میں ہر موضع یا یوں کہیے کہ موضع کے ہر باشندے کے معاملات میں ہمیشہ عاملانہ مداخلت ضروری ہوتی ہوگی اور لازمی بات ہے کہ کہیں کی رعایا کیوں نہ ہو اس قدر مداخلت جب اس کو ناگوار گزرتی ہے تو اسی طرح ہندوستان کے باشندوں کے لیے بھی یہ بات قابل برداشت نہ ہوگی۔" لفٹننٹ گورنر کی نظروں میں یہ طریق کار سب کو بالکل مساوی الحیثیت اور یکساں بنا دینے والا تھا اور اس سے آگے چل کر معاشرتی سطح اس قدر ہموار بن جاتی تھی کہ کسانوں اور حکمران طبقے میں مابہ الامتیاز کوئی بات باقی نہیں رہتی تھی کسی دیسی ذریعہ وتوسط کے بغیر حکومت کرنا ایک خطرناک تجربہ کرنا ہے اور میری نظروں میں بھی وہ بات ہے جو ہمارے زیر عمل تدابیر میں مضمر ہے۔"

اوپر جو کچھ اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ ہر زمانے میں قابل قدر سمجھا جائے گا۔ برڈ کے بندوبست کی بہت کچھ تعریف کی گئی ہے اور بجا کی گئی ہے کیونکہ اس سے شمالی ہند کی زرعی آبادی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی تیس سال تک محصول اراضی جو حد سے زیادہ اور شدید زحمت کا باعث تھا اس میں ایک اعتدال پیدا ہو گیا اور طویل المیعاد بندوبست عمل میں آنے سے رعایا کو مسلسل پریشانیوں سے نجات ملی مگر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جہاں کہیں تمام زمین کی کاشت ہوتی تھی اور لگان کا پورا تعین ہو چکا تھا۔ وہاں اسی لگان کو برڈ کا ارادہ یہ تھا کہ دوامی کر دیا جائے لیکن اس بات کو بعد کے منتظمین مملکت نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ برڈ کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ دوسرے اضلاع میں بھی جب وہاں کاشت خوب ہونے لگے تو آیندہ یہی عمل ہونا چاہئے مگر یہ

آرزو بھی کبھی پوری نہ ہوئی۔ برخلاف اس کے سب کو "مساوی الحیثیت اور یکساں کر دینے والی" تدبیریں جن پر ۱۸۴۲ء میں ٹی۔ سی رابرٹسن نے اظہار افسوس کیا تھا ساٹھ سال گزرنے کے بعد اب زیادہ نمایاں بن گئی ہیں۔ شمالی ہند میں موضع کا پٹواری جس کو سرکار کی طرف سے تنخواہ مقرر ہے موقع پاکر آج گویا الک سیاہ و سفید بن گیا ہے اور اس کو وہ اقتدار حاصل ہے جو جائز طور پر درحقیقت رعایا کے نمایندہ مثلاً موضع کے زمینداروں یا دیہی جماعتوں کو ملنا چاہئے۔ "سب کو بالکل مساوی الحیثیت اور یکساں بنا دینا جس سے آگے چل کر معاشرتی سطح ایسی ہموار ہو جائے کہ کسانوں اور حکمران طبقے میں مابہ الامتیاز کوئی بات باقی نہ رہے" ہندوستان کے لیے دانائی کی حکمت عملی نہیں۔

رابرٹسن کے بعد ۱۸۴۳ء میں جیمز ٹامسن شمالی ہند کا لفٹننٹ گورنر مقرر ہوا اور یہ ایک فیاض منش اور رحمدل آدمی تھا۔ اس نے دس سال اس صوبے پر حکمرانی کی۔ اس کے تحت متعدد منتظمین مملکت نے نظم ونسق کا کام سیکھا اور تجربہ حاصل کیا جیسے جان لارنس۔ رابرٹ منٹگمری اور ولیم میور جنھوں نے تاریخ ہند میں نہ صرف انتظامی قابلیت بلکہ رعایا کے ساتھ اپنی گہری ہمدردی کا نقش اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ خود ٹامسن ممتاز ترین منتظمین مالگزاری میں سے تھا۔ اس نے ایک طرف تو ان خرابیوں کی اصلاح کی جنکی نشاندہی اس کے پیشرو نے کی تھی اور دوسری طرف مارٹنز برڈ کے کام کی تکمیل کی اور ۱۸۴۹ء میں اس بندوبست عظیم کو بھی ختم کر دیا۔ اس کے چار سال بعد جس روز ملکہ کے فرمان سے ٹامسن کو گورنر مدراس کی اعلیٰ تر خدمت پر سرفرازی کے احکام صادر ہوئے اسی روز ۲۷ ستمبر ۱۸۵۳ء میں اس نیک نفس جلیل القدر شخص نے انتقال کیا۔ ایسے ہمدرد عہدہ دار کی مدراس میں جس قدر ضرورت تھی ویسی کہیں نہیں تھی مگر افسوس ہے کہ مدراس کی قسمت میں ٹامسن کی حکمرانی نہ تھی۔

لفٹننٹ گورنری کی خدمت پر مامور ہونے کے بعد ٹامسن نے جو سب سے پہلا اہم کام کیا وہ یہ تھا کہ اس نے ۱۸۴۴ء میں "عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات" مرتب کیے اور یہی ہندوستان کا سب سے پہلا مکمل "قانون بندوبست" ہے

یہ قانون ۱۹۵ فقروں پر مشتمل ہے اور اس میں وہ سب اصول اور طریق کار مقرر کر دیے گئے ہیں جن کے موافق شمالی ہند میں بند وبست کیا گیا تھا۔ اس کے چند شرائط ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔

"۵۲۔ یہ مناسب ہو گا کہ بند وبست کے اندرون میعاد مالک اراضی کی جو کچھ خالص پیداوار سمجھی جاتی ہے اس میں سے دو ثلث سے زیادہ حصے کا سرکار کو مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ باقی ایک ثلث مالک اراضی کے لیے بطور منافع چھوڑ دینا چاہیے جس سے وہ جمع کے مصارف بھی ادا کر سکے۔ خالص پیداوار کے یہ معنی ہیں کہ مصارف کاشت کی (جس میں سرمایہ پر منافع اور محنت کی اجرت بھی شامل ہے) منہائی کے بعد محاصل جاگیر میں جو فاضلات ہوں۔ اگر جاگیر کلیتاً ان لوگوں کے زیر قبضہ ہے جو اس کے مالک بھی ہیں اور کاشت بھی کرتے ہیں تو خالص پیداوار سے مطلب ان کے سیر یات کی کاشت کا منافع ہے اور اگر یہ جاگیر ان لوگوں کے زیر قبضہ ہے جو اس کے محض مالک ہیں اور کاشت نہیں کرتے بلکہ انھوں نے ایک مقررہ دھارے پر اسامیوں کے نام زمین کا پٹہ کر دیا ہے تو خالص پیداوار سے مطلب جاگیر کا خام لگان ہو گا۔"

"۱۲۸۔ لگان مقررہ پر کاشتکاروں نے جو بعض زمینیں لی ہیں ان پر قبضہ قائم رکھنے کا کاشتکاروں کو حق حاصل ہے اور جب تک یہ لوگ اپنے ذمے کی رقم ادا کرتے رہیں اپنے کھیتوں سے بے دخل نہیں کیے جا سکتے۔ اگر یہ کاشتکار لگان کی وہ رقم ادا ہی نہیں کرتے جس کا مطالبہ قانوناً جائز ہے تو مالک اراضی ادائے بقایا کے لیے ان پر نالش کر سکتا ہے اور اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنے کے بعد بھی اگر اپنی واجب الوصول رقم وصول نہیں کر سکتا تو پھر ان کاشتکاروں کو کھیتوں سے بے دخل کر کے زمین پر خود قبضہ حاصل کرنے کی کلکٹر کے پاس درخواست پیش کر سکتا ہے۔"

"۱۲۹۔ اسامی غیر دخیل کار کو جس سال انھوں نے کھیتوں کی کاشت کی ہے اس مدت سے متجاوز اراضی پر کوئی حق حاصل نہیں ہو گا۔

"۱۵۴۔ جہاں متعدد و مشترکہ اسامیاں ہوتی ہیں جیسی کہ بھی جماعتیں تو

معمول یہ ہے کہ ان میں سے دو ایک کا انتخاب کرلیا جاتا ہے اور یہ انتظام کردیا جاتا ہے کہ باقی رعیت انھیں منتخبہ اسامیوں کے توسط سے سرکار کو مالگزاری ادا کرتی رہے یہ مشترکہ اسامیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک تو "مالگزار" (مالگزاری اداکرنے والی) اور دوسری "پٹی دار" (بلا اشتراک غیرے قابض زمین) لیکن صرف صدر "مالگزاروں" کے ساتھ سرکار محاصل کا قرار داد کرتی ہے اور یہی لوگ براہ راست سرکار کو مالگزاری ادا کرتے ہیں۔ ان کو عام طور پر "نمبردار" بھی کہا جاتا ہے"۔

"۱۵۹۔ سیاہۂ حقوق کی ترتیب کا طریقہ اب بیان کرنا باقی ہے۔ .... یہ سیاہۂ دوامی ہونا چاہیئے۔ گویا یہ ایک حقوق کی سند ہوگی جس کو دیکھ کر ان اشخاص کے حق میں جن کو اراضی سے کچھ بھی تعلق ہے یا جو اس طرح کی دلچسپی پیدا کرنے کی فکر میں ہیں قطعی تصفیہ کیا جاسکے گا۔ سب سرکاری عہدہ دار مثلاً کلکٹر مجسٹریٹ اور بالخصوص جج رعیت کے معاملات کے تصفیہ کے وقت اسی سیاہۂ حقوق کو پیش نظر رکھیں گے"۔

آج کل کے ہندوستان کے منتظمین مملکت نے ان قواعد میں ان چند اصول کو تاڑ لیا ہوگا جو بعد میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے "قوانین لگان" میں شریک کیے گئے تھے۔

شمالی ہند کا بندوبست ۱۸۴۹ء میں مکمل ہونے کے بعد آخر کار مجلس نظماء کے پاس پیش ہوا۔ نظماء نے اپنے ۱۲ ؍اگست ۱۸۵۱ء کے اہم مراسلے میں اس عظیم الشان کارنامے پر تبصرہ کیا۔ مارٹنز برڈ کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد جن زمینوں پر اس نے محصول لگایا تھا ان پر نظر ثانی اور جمع میں اس طرح تخفیف کی گئی کہ بہت سی حقیقت اراضی جس پر محصول معاف تھا محصول سے مستثنےٰ ہی رکھی گئی تھی چنانچہ نظماء کے مراسلے میں جو اعداد درج ہیں ان میں اور برڈ کی رپورٹ کے اعداد میں جن کی تفصیل قبل ازیں کردی گئی ہے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔

ذیل میں مجلس نظماء کے مراسلے کے اعداد کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جس میں دس روپے ایک پونڈ انگلیسیہ کے مساوی قرار دیے گئے ہیں :

ضلع	جملہ محصول اراضی پونڈ	ضلع	جملہ محصول اراضی پونڈ
سہارنپور	۹۰۴۴۳	فتح پور	۱۳۹۷۶۷
مظفرنگر	۶۷۲۷۴	الہ آباد	۲۱۸۹۹۵
آگرہ	۱۵۵۴۰۱	اعظم گڈھ	۱۳۵۷۴۱
فرخ آباد	۹۲۱۷۳	جونپور	۱۲۳۱۳۳
مینپوری	۱۳۸۲۱۳	بنارس	۸۱۷۰۶
اٹاوہ	۱۳۱۱۰۳	مرزاپور	۶۷۰۶۸
بجنور	۸۲۷۵۵	دھلی	۳۵۷۹۴
مرادآباد	۱۳۳۴۶۳	پانی پت	۸۰۷۷۸
پیلی بھیت	۳۷۵۸۹	حصار	۳۸۰۲۰
بریلی	۱۰۰۷۰۶	روہتک	۶۲۸۳۱
شاہجہاں پور	۱۰۲۷۰۷	گرگاؤں	۱۰۸۸۴۸
کانپور	۲۱۸۱۵۴	....	....

بعض اضلاع مثلاً آگرہ ۔ مرادآباد ۔ الہ آباد اور گرگاؤں کے اعداد میں بمقابل برڈ کے اعداد کے بہت کچھ بیشی نظر آتی ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ اس لیے ہو کہ جب برڈ نے اپنی رپورٹ پیش کی تھی اس وقت بندوبست مکمل نہیں ہوا تھا ۔ دوسرے اضلاع مثلاً سہارنپور ۔ فرخ آباد ۔ بجنور ۔ پیلی بھیت ۔ بریلی اور فتح پور میں معتدبہ تخفیف و توسیع ہیں آئی ہے ۔

بندوبست کے تحت دہ سالہ مدت میں شمالی ہند میں سرکار کا مطالبہ کیا رہا ہے اور جمعبندی کی رقم کتنی وصول ہوی ہے ۔ وہ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا :

سال	مطالبۂ سرکار	مقدار جمع
سنہ ۱۸۳۸ء سے سنہ ۱۸۳۹ء تک	۴۵۵۴۸۹۹	۳۶۳۰۲۱۵

۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۰ء تک	۴۱۲۰۶۶۸	۳۵۶۵۲۸۱
۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۱ء تک	۳۷۶۴۲۶۱	۳۴۷۰۴۰۲
۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۲ء تک	۴۱۶۱۹۰۳	۳۸۸۳۳۵۷
۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۳ء تک	۴۳۹۱۸۹۰	۴۰۴۸۸۱۲
۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۴ء تک	۴۳۴۹۴۱۵	۴۱۱۰۵۱۴
۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۵ء تک	۴۳۴۵۸۸۲	۴۱۲۸۷۴۴
۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۶ء تک	۴۳۰۱۸۳۷	۴۲۰۰۳۴۱
۱۸۴۶ء سے ۱۸۴۷ء تک	۴۳۰۷۷۰۰	۴۲۳۲۱۲۲
۱۸۴۷ء سے ۱۸۴۸ء تک	۴۲۹۲۱۶۶	۴۲۴۸۵۸۲

اس بندوبست کے سب مفید نتائج اس نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اس دہ سالہ مدت کی ابتدا میں مطالبۂ سرکار بہت بڑا تھا لیکن تقریباً دس لاکھ پونڈ انگلیشیہ کا بقایا رہ گیا تھا۔ جب ختم مدت پر مطالبے میں تخفیف کر دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطالبے کی تقریباً کل رقم وصول ہوگئی۔

ان واقعات اور اعداد پر تبصرہ کرتے ہوئے نظماء نے ہندوستان کے ملازمین دیوانی کو اس کار عظیم کے سرانجام پر مبارکباد دی اور رابرٹ مارٹنز برڈ کی کارگزاری پر بطور خاص اظہار پسندیدگی فرمایا۔

اس میں شک نہیں کہ ملازمین دیوانی اور مارٹنز برڈ دونوں نظماء کی اس قسم کی تعریف ہی کے مستحق تھے مگر پھر بھی ان کا کام ابھی تک ادھورا رہی ہے۔ درحقیقت اس تمام تعمیر کا سنگ بنیاد ہی متزلزل ہے۔ کیونکہ تمام پرگنے پر محصول اراضی کا مقرر کر دینا محض قیاسات پر مبنی تھا اور اس کے علاوہ محصول اراضی صرف غیر متیقن ہی نہ تھا بلکہ بہت زیادہ بھی تھا۔ ٹامسن کے "ہدایات" کے (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) قاعدہ (۵۲) کی رو سے مطالبۂ سرکار خالص پیداوار کے دو ثلث حصے تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پھر بھی یہ قاعدہ رحمدلی پر مبنی تھا کیونکہ انگریزی سرکار نے ۱۸۲۲ء میں ۸۳ فی صدی اور ۱۸۳۳ء میں ۷۵ فی صدی کا مطالبہ کیا تھا۔

پھر بھی اس قاعدے کے تحت پورا مطالبہ کرنے سے شمالی ہند کے مالکان اراضی اور کاشتکاروں کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا تھا اور یہ مطالبہ ان کے لیے درحقیقت سخت تباہ کن تھا۔ ۱۸۵۵ء کے مراسلے پر نظام کے دستخط کرنے کے چند ہی سال بعد یہ دردناک حقیقت آشکارا ہوئی۔

جدید بندوبست شروع کرنے کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اس مسئلے پر کہ زمین کی خالص پیداوار میں سرکار اور مالکان اراضی کو کیا حصہ تناسبہ ملنا چاہیئے ازسرنو غور وخوص کرنے کا پھر موقع آپہنچا۔ تجربے سے یہ ثابت ہوا تھا کہ ۶۶ فی صدی محصول جس کا سرکار نے اب اب تک مطالبہ کیا تھا بہت زیادہ اور ناقابل عمل تھا۔ ٹامسن کا قاعدہ (۵۲) حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہوا تھا اور مالکوں اور کاشتکاروں کی نظروں میں اراضی قابل قدر ملک نہیں رہی تھی۔ ٹامسن کے "ہدایات" پر نظر ثانی ضروری معلوم ہوتی تھی اسی لیے ۱۸۵۵ء میں جدید قواعد اس غرض سے نافذ کیے گئے کہ "ان اشکال میں جو عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات کی اشاعت کے وقت اس رسالے سے حذف کر دیے گئے تھے یا اس رسالے میں ان کی تفصیل درج نہ تھی اور اگر تھی بھی تو جو کچھ اس میں لکھا تھا اس کی ترمیم بعد کے احکام سے سرکار نے کر دی تھی کلکٹر کی رہنمائی کی جائے"، چونکہ یہ قواعد جدید ضلع سہارنپور کے مکرر بندوبست سے متعلق صادر ہوئے تھے اسی لیے عام طور پر ان کو "قواعد سہارنپور" کہا جاتا ہے:-

"قواعد سہارنپور" میں سب سے اہم قاعدہ (۳۴) ہے جس کی رو سے محصول اراضی جاگیر کی خالص پیداوار یا خالص لگان کے ۶۶ فی صدی کے بجائے ۵۰ فی صدی کر دیا گیا۔ اس قاعدے کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"کسی جاگیر کا اثاثہ بالتفصیل معلوم نہیں کیا جا سکتا لیکن بمقابل پہلے کے اب اوسط خالص اثاثے کے متعلق زیادہ صحیح معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے اراضی پر بے انتہا محصول لگا دینے کا امکان اب زیادہ ہے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ دو ثلث یعنی ۶۶ فی صدی حقیقی اوسط اثاثے کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ معمولی طور پر مالکان اراضی یا دیہی جماعتیں کسی طویل مدت تک اس کو ادا نہیں کر سکتیں۔

اسی سبب سے سرکار نے "عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات" نامی رسالے کے فقرۂ (۵۲) میں جو قاعدہ درج ہے اُس کی اب یوں ترمیم کی ہے کہ جاگیر کے اوسط خالص اثاثے کا ۵۰ فی صدی مطالبۂ سرکار مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر جاگیر کی جمع اُس کے خالص اوسط اثاثے کا نصف حصہ مقرر کر دی جائے بلکہ یہ ہے کہ اس اثاثے اور دوسرے مواد پر غور کرتے وقت کلکٹر اس بات کو ملحوظ خاطر رکھے کہ پہلے کی طرح خالص اثاثے کا دو ثلث نہیں بلکہ تقریباً نصف حصہ جس کو نہایت تحقیق کے ساتھ معلوم کیا گیا ہو مطالبۂ سرکار مقرر کر دینا چاہیے کلکٹر کو یہ بھی چاہیے کہ مذکور الصدر رسالے کے (۴۷) فقرے سے (۵۱) فقرے تک جو تنبیہ کی گئی ہے اس کو پیش نظر رکھے اور جاگیر زیر بندوبست کے اوسط خالص اثاثے کو بلا کم و کاست دریافت کرنے کی بے سود کوششوں میں تضیع اوقات نہ کرے"۔

آج کل ہندوستان میں مالگزاری کا تعین اسی قاعدے پر مبنی ہے نصف صدی کے بے اندازہ مالگزاری اور دوسری غلطیوں کے بعد انگریزی سرکار نے نصف لگان یعنے زمین کی نصف خالص پیداوار تک اپنے مطالبے کو محدود رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان کے اور اقطاع میں بھی جہاں مالگزاری کا دوامی تعین نہیں ہوا تھا یہی طریقہ پھیل گیا۔ صوبۂ متوسط اودھ اور پنجاب میں ان ممالک کے الحاق کے بعد ہی طریقہ رائج کیا گیا۔ مدراس و بمبئی جیسے صوبوں میں بھی جہاں عموماً کاشتکار بلا توسط مالکان اراضی براہ راست سرکار ہی کو مالگزاری ادا کرتے تھے وزیر ہند نے یہی طریقہ ۱۸۶۴ء کے مراسلے کے ذریعہ نافذ کر دیا۔

چوتھا باب

بمبئی میں بندوبست اراضی

مارکوئیس ہیسٹنگز کے عہد حکومت میں ہندوستان کی مغربی سرحد جلد جلد اور آگے بڑھا دی گئی اور آخری جنگ مرہٹہ کے بعد ۱۸۱۷ء میں دکن کا تمام علاقہ انگریزی حکومت کے تحت آگیا۔ اس نومقبوضہ علداری پر سب سے پہلے مونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن نے ۱۸۱۹ء میں ایک قابل قدر رپورٹ پیش کی اس کے بعد ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۲ء میں چیپلین نے بھی دو رپورٹیں پیش کیں۔ ان سے مرہٹوں کی سابقہ علداری کی زرعی حالت کے ساتھ ساتھ کسانوں کے حالات پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

الفنسٹن نے یہ لکھا تھا کہ دکن میں مرہٹہ حکومت کی سب سے اہم صورت حال یہ تھی کہ تمام دیہات کو قصبات یا دیہی جماعتوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا "ان میں مختصر پیمانہ پر سب کچھ موجود تھا جو ایک مملکت میں ہوتا ہے کسی وقت اگر ان کی محافظت کے لیے کسی قسم کی حکومت بھی باقی نہ رہے تو یہ آپ اپنی حفاظت معقول طریقے پر کر سکتے ہیں"۔

پونے کے کپتان رابرٹسن نے لکھا تھا کہ "پٹیل جو دیہی جماعت کا صدر ہوتا تھا سابق زمانے میں اور اب بھی ایک مجسٹریٹ کی حیثیت رکھتا ہے جو حکومت کا مقرر کردہ اور دیہی جماعت کے ارادہ مجموعی سے قائم ہے۔ وہ ان

سب باتوں کی پابندی کراتا ہے جو انگلستان میں شخصیہ کے قوانین مقامی کہلاتے ہیں
سابق میں وہ اس جماعت کے مصارف اور اس جماعت کے صدر ہونے کی حیثیت
سے اپنا وقار برقرار رکھنے کے لیے معقول رقم چندے سے جمع کر لیتا تھا۔ اب وہی
اس انجمن کی فلاح و بہبود کی خاطر اصلاح کی تدبیریں سوچتا ہے اور اس انجمن کے
ارکان سے امن عامہ قائم رکھنے میں ہر طرح کی مدد لیتا ہے۔ سابق کی طرح اب بھی
وہ ایک بزرگ خاندان کی حیثیت سے ان دیوانی مقدمات کا انفصال کرتا ہے
جن میں لوگ اس کو اپنی خوشی سے ثالث یا پنچ مقرر کرتے ہیں اور ان کارروائیوں
میں یہ سرپنچ ہوتا ہے جن میں یہ خود یا فریقین مقدمہ مابہ النزاع امور کے تصفیے کے
لئے دوسروں کو پنچ مقرر کرتے ہیں۔"

دوسری اہم صورت حال مرہٹوں کے عہد حکومت میں یہ تھی کہ کسان مالک
اراضی بھی تھے اور خود اپنی زمینوں کی کاشت بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ اس لیے "میراث
دار" کہلاتے تھے کہ اپنے کھیتوں کے یہی موروثی حقدار تھے۔ الفنسٹن بیان کرتا ہے
کہ "کثیر التعداد رعیت اس شرط پر اپنی اراضی کی مالک ہے کہ وہ ایک مقررہ
لگان سرکار کو ہمیشہ ادا کرتی رہے۔ ان کی یہ ملک موروثی ہے اور فروخت
بھی ہو سکتی ہے۔ جب تک وہ محصول اراضی ادا کرتے رہتے ہیں ان کو اپنی مقبوضہ
اراضی سے کبھی بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔" کپتان رابرٹسن لکھتا ہے کہ "ایسی حقیت
اراضی کی اصلی بنیاد دیکھی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی کسی ایسی
ملک مطلق سے کم حیثیت ہرگز نہیں جو ہر طرح کی نزع سے بالکل پاک ہو۔" چیپلین
کہتا ہے کہ "میراثی حقیت اراضی مفتوحہ علمداری کے اس حصے میں جو دریائے
کرشنا سے لے کر مغربی گھاٹیوں تک چلا گیا ہے عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔" اور
مسٹر چیپلین یہ بھی کہتا ہے کہ "کلکٹر پونا کا میراث داروں کے تحفظ حقوق کی حمایت
کرنا بالکل درست ہے چنانچہ متعدد مقامات میں اس نے نہایت شدومد کے
ساتھ اس بات کی تیح بھی کی ہے۔ لیکن مجھ کو یہ یقین ہے کہ آج تک کسی نے
ان کے حقوق پر حملہ کرنے کا خیال تک نہیں کیا تو پھر اب اس مسئلے پر زیادہ
بحث کرنا فضول ہے۔"

بڑے افسوس کی بات ہے کہ مفتوحہ علمداری پر انگریزوں کی حکومت ہوئے ابھی ایک پشت بھی نہیں گزری تھی کہ میراث داروں اور دیہی جماعتوں جیسے دو قدیم اداروں کا دراصل خاتمہ ہی ہو گیا۔ ہر کاشت کار سے براہ راست انتظام اور ائندہ ہر بندوبست پر کاشتکار کے مقررہ لگان پر نظر ثانی کرنے کا تہیہ کر لیا گیا تھا جس سے دیہی جماعتیں کمزور ہو گئیں اور میراثی حقوق کچھ باقی نہ رہے۔ کوئی غیر جانبدار مورخ ایسا بھی نافہم نہ ہو گا کہ مرہٹوں کی حکمرانی کا جس میں جنگ وجدل لا متناہی ہوتے تھے انگریزوں کی حکمرانی کے ساتھ جس میں رعایا کو حفظ وامن حاصل تھا مقابلہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی غیر جانبدار مورخ ایسا بھی نہ ہو گا جو ان قدیم خود اختیاری حکومت رکھنے والے اداروں کے انحطاط پر اور قدیم اسامیوں کے حقوق زائل اور اراضی کے بار لگان میں یوں اضافہ ہو جانے پر جب کہ یہ سب کچھ انگریزی نظم ونسق کا نتیجہ ہے اظہار افسوس نہ کرتا ہو۔ یوں تو کسی ملک کے حکومت خود اختیاری رکھنے والے دیسی اداروں کا میٹ دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں مگر بالخصوص ایک پردیسی راج کے لیے جس کو رعایا کے فطری رہنماؤں اور نمائیدوں سے راہ رکھے بغیر ان کے حالات اور امنگوں سے کبھی واقفیت ہی نہیں ہو سکتی یہ بڑی نادانی کی بات ہو گی۔ انگریزوں کو دکن فتح کیے پچیاسی سال ہو چکے لیکن دیہی جماعتوں کے مماثل حکومت خود اختیاری کا کوئی اور نظام ان کے بجائے آج تک قائم نہیں کیا گیا۔

دکن کی فتح کے ساتھ ہی مختلف اضلاع میں عارضی طور پر بندوبست کر دیا گیا تھا مگر بمبئی کی ملازمت دیوانی کے مسٹر پرنگل نے ۱۸۲۴ء سے باضابطہ پیمایش کے بعد بندوبست کرنا شروع کر دیا اور پرنگل کا طریقہ ہی ۱۸۲۸ء تک جاری رہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کھیتوں کی پیمایش کے بعد مختلف النوع اراضی کے تخمینۂ پیداوار پر پرنگل نے محصول اراضی کا تعین کر دیا تھا جس سے پیداوار کا ۵۵ فی صدی حصہ حق سرکار ہوتا تھا۔ لیکن پیمایش غلط ہوئی تھی۔ پیداوار کا تخمینہ بھی صحیح نہ تھا اور سرکاری مطالبہ بھی حد سے زیادہ تھا اسی لیے بندوبست کامل رعایا کے لئے موجب سختی و آزار ثابت ہوا۔" اگر کسان مطالبہ سرکار ادا نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے تھے تو ان بدبختوں سے

ان کے مقدور کی انتہا تک وصول کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز کوششوں سے کبھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا جو نہایت ظالمانہ اور قابل نفرت ہونے کی وجہ سے بیان سے باہر ہیں۔ اکثر تو گھروں کو چھوڑ کر آس پاس کی دیسی ریاستوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ زمین کے بڑے بڑے خطے بے کاشت پڑے ہوئے تھے اور بعض اضلاع میں تو قابل کاشت رقبے کا ایک ثلث سے زیادہ حصہ رعایا کے زیر قبضہ نہ تھا۔"

۱۸۳۵ء میں گولڈ اشمڈ اور لفٹننٹ ونگیٹ نے مکرر پیمائش شروع کر دی اور وہ اصول قائم کر دیے جن پر بمبئی کا نظام مالگزاری آج تک بنی چلا آ رہا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے شمالی ہند کے موجودہ نظام بندوبست کا آغاز سال ۱۸۳۳ء سے ہوا اسی طرح بمبئی کے موجودہ نظام بندوبست کی ابتداء ۱۸۳۵ء سے ہوئی۔ اور بمبئی اور شمالی ہند دونوں جگہ انھیں سنین سے طویل المیعاد تیس سالہ بندوبست عمل میں آنے لگے تھے۔

گولڈ اشمڈ اور ونگیٹ نے جو منصوبہ اختیار کیا تھا وہ بالکل سیدھا سادہ تھا۔ انھوں نے زرخیزی کے لحاظ سے اراضی کی نو ۹ قسمیں قرار دی تھیں۔ ہر ضلع کے موجودہ حالات اور سابقہ سرگزشت دریافت کرنے کے بعد اس پر محصول اراضی کا وہ تعین کر دیتے تھے اور اس وصول طلب رقم کو اسی ضلع کے تمام مواضعات اور کھیتوں پر منقسم کر دیتے تھے۔ ہر کھیت کے مالک پر فرض تھا کہ اپنے کھیت پر معینہ محصول اراضی ادا کر دینے کے بعد اس کی کاشت کرے۔ "مہتمم بندوبست کاشتکار سے کچھ پوچھنے کے بغیر محصول اراضی کا تعین کر دیتے تھے اور جب نرخ نامہ مالگزاری کا رواج پڑا تو یہ ہونے لگا کہ ہر کھیت پر آئندہ کیا معیار لگایا جائے گا اس سے ہر کھیت کے مالک کو کلکٹر اپنے پاس طلب کر کے آگاہ کر دیتا تھا۔ اگر وہ ان شرائط پر کھیت اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا تو اس کی خوشی اور نہ رکھنا چاہتا تھا تو اس کی مرضی۔"

ناظرین خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس سیدھے سادھے منصوبے میں دکن کی دیہی جماعتیں بالکل نظر انداز کر دی گئی تھیں اور میراثی اسامیوں کو ایک مقررہ شرح محصول پر اپنی موروثی اراضی پر قبضہ رکھنے کا جو حق حاصل تھا وہ بھی

زایل ہو گیا تھا۔ انگریز منتظمین مملکت کی نظروں میں ہر اسامی سے فرداً فرداً بلاتوسط غیرے بندوبست کر لینا ہی بڑی دانائی تھی اور انھوں نے ہر کھیت پر اپنی مرضی کے موافق محصول لگا دیا۔ اس طرح محصول اراضی کا بالجبر تعیین کرنا بھی کم و بیش قیاسات ہی پر مبنی تھا اور اسی لیے اس میں بھی وہی نقص رہ گیا تھا جو محصول کی متغیر مقدار سے شمالی ہند کے نظام میں موجود تھا۔ عہدہ داران بندوبست کے مختلف طبائع کے موافق اس کا تعیین ہوتا تھا کہ جہاں وہ سخت گیر ہوئے محصول سنگین ہو گیا اور جہاں انھوں نے اعتدال سے کام لیا محصول بھی مبنی بر اعتدال ہو گیا۔ اگر کسی بندوبست میں حوادث زمانہ کے واقع ہونے سے اعتدال پیش نظر رہا تھا تو خوش حالی کے آثار نظر آتے ہی دوسرے بندوبست پر اعتدال تشدد سے مبدل ہو جاتا تھا جب تک بندوبست کے عہدہ دار ہر نئے بندوبست پر اپنی مرضی کے موافق محصول اراضی میں کمی و بیشی کرنے کے مجاز تھے اس وقت تک زرعی دولت کا اجتماع بالکل ناممکن تھا اور جب تک مطالبۂ سرکار کے یوں زبردستی بڑھ جانے کو کسی صورت کسان روک نہیں سکتے تھے اس وقت تک وہ اپنی حالت مستقل طور پر درست نہیں کر سکتے تھے۔

صدر مجلس مالگزاری اور حکومت ہند نے رعیت واری بندوبست کی اس کمزوری کو تاڑ لیا تھا اور اسی زمانے میں اس بندوبست کی بدترین شکل مدراس میں نظر آتی تھی۔ سر ٹامس منرو کی وفات سے دس سال بعد مدراس کے کاروبار میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ محصول اراضی بڑھ کر گھٹ جانے کے بعد پھر بڑھ گیا تھا۔ اس طرح لگان کی غیر معینہ مقدار کی خرابی تو پہلے ہی سے موجود تھی اب وہ بے اندازہ بھی ہو گئی۔ مطالبۂ مالگزاری کی بے اندازہ رقم نہ وصول ہو سکتی تھی نہ کبھی وصول ہوئی تھی کسان مٹی میں مل گئے اور ملک کے اس سرے سے اس سرے تک زرعی بد حالی پھیل گئی۔ اس نظام کی مخالفت میں صدر مجلس مالگزاری نے صدائے احتجاج بلند کی۔

صدر مجلس کے اس مراسلے کی نقل بمبئی بھیجی گئی۔ اگرچہ اس مراسلے کا مطمح نظر مدراس کے حالات تھے مگر اس میں خود رعیت داری نظام پر حملہ کیا گیا تھا لیکن گولڈ اسمڈ اور ونگیٹ چونکہ بمبئی میں اسی نظام کی ترویج کر رہے تھے اس لیے انھوں نے اس کی

حمایت پر کمر باندھی۔ ۷ اراکتوبر ۱۸۴۲ء کے مراسلے میں انہوں نے جواب دیا کہ بدراس کی زبون حالت رعیت واری نظام کی وجہ سے نہیں بلکہ حد سے زیادہ محصول عائد کرنے سے پیدا ہوئی تھی اور یہ بحث کی کہ رعیت واری نظام بشرطیکہ خوش اسلوبی کیساتھ وہ عمل میں لایا جائے رعایا کے لیئے ایسا ہی مفید ہو سکتا ہے جیسا شمالی ہند کا نظام جس کو مارٹنز برڈ نے رائج کیا تھا۔ اس قابلِ ذکر مراسلے کے چند اقتباسات سے شمالی ہند مدراس اور بمبئی کے نظام اراضی پر جو اس وقت زیر تشکیل تھے خوب روشنی پڑتی ہے۔

"۳ شمالی مغربی ممالک میں محصول اراضی بجائے ہر کھیت پر علیحدہ علیحدہ مقرر کیے جانے کے جیسا یہاں ہوتا ہے سب جاگیروں پر اگرچہ یہ متعدد اشخاص کے زیر قبضہ ہوتی ہیں ایک ساتھ معین کر دیا جاتا ہے کبھی تو پورا ایک موضع ہی جاگیر ہوتا ہے کبھی موضع کا کچھ حصہ اور کبھی کبھی متعدد مواضعات یا مواضعات کے متعدد حصے جاگیر میں داخل ہوتے ہیں اور یہ ایک ہی شخص کی ملک ہونے کے بجائے عموماً متعدد اشخاص کی مِلک ہوتے ہیں۔ ایسی جاگیری اراضی پر بہ حیثیت مجموعی محصول لگا دیا جاتا ہے اور ان اشخاص پر اس کے ادا کرنے کی مشترکہ ذمہ داری رہتی ہے برخلاف اس کے دکن میں موجودہ تقسیم اراضی میں عموماً ہر کھیت کا رقبہ ایسا متوسط قرار دیا گیا ہے کہ اس کی کاشت ایک آدمی تنہا کر سکتا ہے اور یہ تقسیم اراضی ہمارے بندوبست میں بحالہ رکھی گئی ہے اور محصول اراضی ہر کھیت پر علیحدہ علیحدہ مقرر کر دیا گیا ہے"۔

"۹۔ .... ہماری نظروں میں حق ملکیت اراضی ایک ہی صورت سے زائل ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پر ایسی سنگین مالگزاری لگا دی جائے جس میں لگان کلیتاً جذب ہو جائے ورنہ حصول مالگزاری کے بعد بھی کچھ نہ کچھ لگان جب تک بچ رہے گا اس وقت تک لگان کے اس باقی حصے کی بدولت زمین قابل قدر سمجھی جائے گی اور قابض زمین اپنی اراضی کو فروخت کر سکے گا یا کرایہ پر دے سکے گا اور یہی بات قابض کو مالک اراضی قرار دیتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دریافت کرنا ضروری نہیں کہ آیا سر ٹامس منرو نے حقیقی مالکان اراضی کے حقوق کو نظر انداز کر دیا تھا

یا محض قابضان وقت ہی کے نام سب زمینیں لکھدی تھیں ۔ اور اس طرح موخرالذکر ہی محصول ادا کرنے کے ذمہ دار بن گئے تھے مگر ہم تو بلا پس و پیش یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بندوبست میں تمام موجودہ حقوق مالکانہ کو تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ اور مالک اراضی کو پوری آزادی دیدی گئی ہے کہ جن شرائط پر وہ چاہے اپنی اراضی کسی شکمیدار کے نام منتقل کر دے چنانچہ ہر جگہ رعیت اس حق سے استفادہ کرتی ہے "

"۱۱ ۔ ...... ہم نے دکن کے اس حصے میں جہاں تک ہمارا کام ہوا ہے اراضی کے نو درجے قائم کیے ہیں اور ہر قسم کی زمین انھیں مدارج میں سے ایک کے تحت آجاتی ہے کیونکہ ان مدارج کی تعداد ہماری دانست میں کافی ہے"

"۱۵ ...... زرعی طبقے کے موجودہ حالات خاص خاص مواضعات کی حالت سرکاری وصول باقی ۔ پیداوار کی قیمتیں اور اس طرح کی دوسری باتوں کا گزشتہ زمانے سے مقابلہ کرنے کے بعد موجودہ جمع میں کیا اضافہ یا معافی ہونی چاہیے اس کے متعلق اطمینان بخش تصفیہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کافی مواد فراہم ہو سکتا ہے[1]"

"۳۹ ۔ مجلس نے اپنے مراسلے کے خاتمے پر ان تمام خرابیوں کا خلاصہ کر دیا ہے جو مجلس کی نظروں میں رعیت واری نظام کی خصوصیات تھیں جیسے ضلع مدراس کی حالت تھی اور اس ضلع کا شمالی مغربی ممالک سے جو موجودہ بندوبست میں نہایت سرسبز حالت میں تھے مقابلہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ موضع دار انتظام بے انتہا بہتر ہے ۔ لیکن ہماری ناچیز رائے میں شمالی مغربی ممالک کی جو بے انتہا برتری نظر آتی ہے ۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ سرکاری مطالبہ وہاں مبنی بر اعتدال ہے اور انتظام مدراس کی ناقابل تردید بدتری کا سبب یہ ہے کہ وہاں محصول اراضی غلطی سے بے انتہا

[1] زرعی تمول و خوشحالی کی مزاحمت کے لیے کوئی اس سے زیادہ موثر طریقہ اختراع نہیں کیا جا سکتا کہ "زرعی طبقے کی موجودہ حالت وغیرہ کے لحاظ سے مالگزاری میں کمی و بیشی کرنے کا اختیار عہدہ داران بندوبست ہی کو دیدیا جائے ۔ جب رعیت خوشحال ہوتی تھی تو مالگزاری میں بھی بیشی کر دی جاتی تھی ۔ ایسی صورت میں اصلاح و ترقی یا اجتماع دولت کا کیا امکان یا ان کے لیے کیا باعث ترغیب ہو سکتا ہے ؟

لگا دیا گیا تھا"۔

"۴۴۔ یہ بھی ہمیں باور آتا ہے کہ قومی خوش حالی کے نہایت ہی اہم عناصر جن میں ذیل کے مصرحہ امور کا بھی شمار ہے بندوبست کے اس منصوبے سے حاصل ہو سکتے ہیں جو فی الوقت دکن میں زیر عمل ہے مثلاً ایک مبنی بر اعتدال و مساوی المقدار محصول اراضی لگانا جس سے مالک اراضی یا قابض زمین کے لیئے لگان کا ایک حصۂ متناسبہ بچ رہے۔ بندوبست کی میعاد تیس سالہ ہو یا بندوبست کے اندرون میعاد کسی صورت مطالبے میں اضافہ نہ کیا جا سکے۔ اس اثناء میں جو لوگ اپنی اراضی میں اصلاح و ترقی کریں اس سے وہی کلیتاً مستفید ہوں۔ مشترکہ ذمہ داری اُن چند کارروائیوں تک محدود رہے جہاں کھیت مشترکہ قبضے میں ہوں یا مشترکہ پٹی داروں نے شخصی اراضی کی ایک ذیلی تقسیم آپس ہی میں کر لی ہو، اراضی پر حق مالکانہ کا تسلیم کرنا، مالکان اراضی کو شکمیداروں سے لگان وصول کرنے کے انتظام اور اپنی اراضی کے فروخت کرنے میں پوری آزادی دینا، کھیتوں یا اراضی کے ایسے محدود حصوں پر جو اس ملک کے مالکان اراضی کے عام حالات کے لحاظ سے قابل انتقال متصور ہوتے ہوں، لگان کی ذمہ داری شخصی داروں پر منقسم ہونے کی وجہ سے اراضی کے انتقال قبضہ یا فروخت کے لیئے سہولتیں پیدا کرنا۔ صرف زیر کاشت اراضی پر محصول وصول کرنا، اور اس طرح رعیت کو ہر وقت اپنے مقدور کے موافق اپنے حلقۂ محنت کو بڑھانے گھٹانے کی اجازت دینا جو ایک ایسے ملک میں جہاں زراعت پیشہ لوگوں کا سرمایہ نہ صرف بالکل تھوڑا ہے بلکہ موسمی تغیرات کے اثرات سے کم و بیش بھی ہوتا رہتا ہے ایک بہت بڑی رعایت ہوگی"۔

جان ویبرٹ اس رپورٹ اور دوسری ایسی رپورٹوں سے مسلح ہو کر مجلس مالگزاری کے الزاموں سے بمبئی کے نظام کو بری کرنے کے لیئے حکومت بمبئی سے مخاطب ہوا۔ اس بات کے ثابت کرنے میں کہ محصول اراضی کی تشخیص میں عہدہ داران بمبئی بھی بالکل انھیں امور کو پیش نظر رکھتے تھے جن کو شمالی ہند کے عہدہ داروں نے ملحوظ رکھا تھا ویبرٹ کو کچھ مشکل نہ ہوئی۔ اس مراسلت کے معائنے سے ناظرین کے دل پر جو پہلا نقش بیٹھتا ہے وہ یہ کہ اگر بمبئی میں تشخیص محصول محض قیاسات پر مبنی تھی تو

شمالی ہند میں بھی تشخیص محصول قیاسات پر مبنی تھی اور شمالی ہند کا بمبئی کو ملامت کرنا ایسا ہی تھا جیسا شیطان کا کسی گنہگار کو اس کے گناہوں پر ملامت کرنا۔ پھر بھی یہ ایک اہم اختلاف تھا کہ شمالی ہند میں کسی جاگیر یا موضع پر بہ حیثیت مجموعی محصول لگایا جاتا تھا اور محض قیاسات پر یہ محصول مبنی ہونے سے اگر اس میں غلطی ہو جاتی تھی تو مالکان اراضی یا زمیندار سب مل کر اس پر اعتراض کر سکتے تھے جس کا کچھ اثر بھی ہوتا تھا مگر بمبئی میں ہر کھیت پر علیحدہ علیحدہ محصول لگایا جاتا تھا اور اگر عہدہ دار سرکاری بندوبست میں کوئی غلطی بھی کر جاتا تھا تو غریب کاشتکار کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔

قارئین کو فوراً محسوس ہو گیا ہو گا کہ ایسے صوبے میں جہاں موروثی زمیندار یعنی اور دیہی جماعتوں کے سے قدیم ادارے اگرچہ بے دست و پا ہی سہی مگر برقرار ہوں اور ایک ایسے صوبے میں جہاں ان قدیم اداروں کو مٹایا یا بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہو اور ایک طرف حکومت کی مطلق العنانی اور دوسرے طرف انفرادی حیثیت سے ہر کاشتکار کی بے بسی دست بگریبان کا مصداق رہے، بہت بڑا اختلاف ہے۔ سطحی نظر رکھنے والے مصنفین کی عادت ہے کہ وہ ہندوستان کے ان درمیانی مالکان اراضی کو ایک طرح کا بار زمین سمجھتے ہیں لیکن پُر مغز اصحاب فکر نے ہندوستان کے معاشی اور معاشرتی حالات پر خوب غور و فکر کرنے کے بعد جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایک پردیسی حکومت اور ایک زراعت پیشہ قوم کے درمیان جس کا کوئی نمایندہ نہ ہو ایسی ذی اثر جماعتوں کی موجودگی سے جو سیاسی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اُن سے قطع نظر کر کے غور و فکر کرنے والے اشخاص نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ انھیں لوگوں کی رائے اور اثر سے جو اسی ملک کے باشندے اور عوام کے طبقے سے ہوتے تھے نظم و نسق بھی متاثر ہوتا ہے۔ غلطیوں کی اصلاح اور زیادتیوں کی مزاحمت ہوتی ہے نیز حکومت اور رعایا کے درمیان ایک رشتۂ اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ بمبئی اور مدراس کے مقابل شمالی ہند میں انتظام مالگزاری اس لیے زیادہ کامیاب اور محصول اراضی بھی کم مقدار رہا کہ وہاں ذی اثر رہنمایانِ قوم اور دیہی جماعتیں موجود تھیں جنھوں نے اپنا مدعا آخر منوا لیا۔ نظم و نسق پر اتنا اثر

ڈالا اور محصول کو ایک اعتدال پر لاکر ہی چھوڑا۔ بمبئی او، مدراس میں سب سے زیادہ افسوسناک غلطی جو ہوی وہ یہی کہ نظم و نسق کی بہتری کے لیے دیہی جماعتوں بانی گھاروں جاگیرداروں اور رعایا کی دوسری ذی اثر جماعتوں سے مدد لینے کی بجائے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا یا سرے سے میٹ دیا گیا۔

گولڈ اسمڈ اور ونگیٹ نے اپنے طریق کار کی تائید میں کہا کہ "مالگزاری ادا کرنے کی مشترکہ ذمہ داری اور موضع میں مشترکہ انتظام یہ دونوں باتیں دکن میں عام تھیں لیکن مشترکہ ملکیت کا پتا نہیں چلتا"۔ اگر یہ ہی جماعتوں کے ذریعہ سے "موضع کا یہ مشترکہ انتظام" جو دکن میں عام تھا یونہیں محفوظ و برقرار رکھا جاتا تو انگریزی راج کو بھی اس سے بہت کچھ فائدہ ہوتا۔ باوجود اس کے کہ سر جورج ونگیٹ جیسے بہت بڑے اور نیک آدمی کی یاد تاریخ کے ہر متعلم کے دل میں ابھی تک تازہ ہے اور اس کی بڑی وقعت کی جاتی ہے لیکن پھر بھی اس سچی بات کا اخفا نہیں کیا جا سکتا کہ دیہی جماعتوں کی برخاست کرنے اور ہر ضلع میں لکھو کھا کاشتکاروں سے فرداً فرداً لکھو کھا کھیتوں کا بندوبست کرنے میں ونگیٹ نے بہت بڑی غلطی کی۔ مدراس کی مجلس مالگزاری نے ۱۸۱۸ء میں ایسی غلطی مدراس میں سرزد ہونے پر سخت اعتراض کیا تھا مگر محض بے سود صدر مجلس مالگزاری نے دوبارہ ۱۸۳۰ء میں اس غلطی پر اعتراض کیا مگر اس کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

اس کے پندرہ سال بعد دار العوام اور دار الامرا کی مجالس منتخبہ کے سامنے ایک بہت بڑے منتظم مملکت کی جو بمبئی کا گورنر تھا شہادت لی گئی اس گورنر کو یہ کہنے کی ہمت ہوی کہ جہاں کہیں رعیت واری نظام کی ترویج کی گئی اور دیہی جماعتوں اور درمیانی مالکان اراضی کو میٹ دیا گیا وہاں کے مزارعین ایسے ہو گئے جیسے کنگالوں کی ایک قوم۔ یہ شخص سر جورج کلارک تھا اور اس کی شہادت ایسی زبردست اور صریح و صاف تھی کہ اس سے چند اقتباسات یہاں پیش کرنا ضروری ہے۔

سوال۔ انتظام اراضی کے کس نظام میں عوام کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ جو خود رعیت کے ساتھ کیا جائے یا زمیندار کے؟

جواب۔ ان دونوں کے مفید عام اشکال جدا جدا ہیں لیکن رعیت واری

نظام ملک کے لیے سب سے زیادہ ضرر رساں ہے ....

سوال۔ ہماری رعایا کی عام خصوصیت کیا یہ نہیں ہے کہ وہ شروع ہی سے مفلس اور کنگال ہیں؟

جواب۔ میرے خیال میں جہاں رعیت واری نظام ہے وہاں یہی حالت ہے۔

مذکورۂ بالا شہادت ۱۸۵۲ء میں دارالامرا کی مجلس کے سامنے پیش ہوئی تھی اس کے دوسرے ہی سال اس گواہ نے دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے رعیت واری نظام کی خرابیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیں۔

سوال۔ کیا آپ چند لفظوں میں رعیت واری نظام کے اصول بیان فرمائیں گے؟

جواب۔ اراضی کے ٹکڑے ٹکڑے جو ہر کاشتکار کے زیر قبضہ ہیں ان پر بلا توسط کسی سرکار کا نہایت باریک بینی اور تفصیل کے ساتھ محصول لگانا جس سے یہ کاشتکار پہلے جیسے مفلس اور کنگال تھے ویسے ہی اب بھی رہیں۔ ان کاشتکاروں اور حکومت کے درمیان کوئی سلسلۂ توسط نہیں ہے ....

سوال۔ رعیت واری نظام کے متعلق کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ یہ نہ تو حکومت کے لیے کچھ فائدہ مند ہے اور نہ دیسیوں کے حق میں مفید ہے؟

جواب۔ یقیناً میرا یہی خیال ہے۔ ان کاشتکاروں کے اوپر کوئی مالک اراضی ایسا ہے ہی نہیں جو سرمایہ پیدا کرے۔ یہ کسان اس طبقے کے لوگ ہیں جو کسی ملک میں بھی سرمایہ دار نہیں ہوتے بلکہ یہ محض کاشتکار ہوتے ہیں ....

سوال۔ شمالی مغربی ممالک میں مالگزاری کا کونسا نظام قائم ہے؟

جواب۔ وہاں مختلف حیثیت کے زمینداروں کو جنہیں بعض کے زیر قبضہ ایک موضع ہے اور بعض اشتراک کے طور پر ایک ہی موضع کے صدر ہیں نئے بندوبست میں طویل المعیاد پٹے دیدیے گئے ہیں۔

سوال۔ کیا یہ بندوبست مسٹر برڈ کے مجوزہ اصول پر ہوا ہے؟

جواب۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں لیکن یہ اصول جدید نہیں ہے۔ بلکہ مسٹر برڈ

کے زمانے سے بھی پہلے کا ہے۔ ہندوستان میں تشخیص مالگزاری کا بہت قدیم طریقہ یہی تھا۔

سوال۔ کیا آپ کی رائے میں یہ اچھی طرح چلنتا رہا ہے؟

جواب۔ میرے خیال میں یہ بہت خوبی کے ساتھ چلتا ہے بشرطیکہ مواضعات کے صدر اشخاص سے مل کر تشخیص مالگزاری میں کسی زمیندار کے حقوق پامال نہ کیے جائیں۔

سوال۔ کیا فصل کے نہ ہونے پر زمیندار اپنی حسب عادت رعیت کی امداد کرتے رہتے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں!۔

سوال۔ یہ لوگ کس طرح رعیت کی امداد کرتے ہیں؟

جواب۔ زمیندار رعیت کی مدد رقم۔ بیج۔ اناج اور بیلوں سے کرتے ہیں۔ موضع واری یا زمینداری بندوبست میں یہی فائدہ تو ہے۔

اس مجلس منتخبہ کے ارکان کاٹن اور جوزف ہیوم جیسے مشاہیر بھی تھے اور ان کے خاص خاص سوالات کا اس گواہ نے جو جواب دیا ہے اس کا پڑھنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

مسٹر کاٹن۔ آپ نے بیان کیا ہے کہ بمبئی میں رعیت واری نظام میں ایک مشکل یہ بھی تھی کہ دیسی لوگوں میں عام طور پر بد دیانتی پھیلی ہوئی تھی اور جہاں کہیں یورپی اشخاص خدمت پر نہ تھے وہاں وفادار تنظیمِ مملکت کا ملنا ناممکن تھا مگر اس سے پہلے آپ نے اپنی شہادت میں ہندوستانیوں کی صدق بیانی اور عام اخلاق اچھے ہونے کے متعلق بیان کیا تھا پھر اس پہلے اور بعد کے بیان میں کیا مطابقت ہے۔؟

جواب۔ مجھ کو یہ خیال نہیں ہے کہ میں نے لوگوں میں عام طور پر بد دیانتی پھیلی ہوئی ہے کہا تھا۔ قطعی میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرے کہنے کا دراصل منشا یہ تھا کہ روپے کی قلت کے باعث اچھے لوگوں کے بجائے کم مواجب دیسی مختاروں ہی سے کام لینا پڑتا ہے اور ان پر رقم مالگزاری کی ارسال یا رعیت واری

نظام کی بالتفصیل پابندی کرنے کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

سوال۔ اگر آبادی کا ایک کثیر حصہ صدق بیان اور دیانت دار ہو تو پھر دیانت دار مختاروں کے ملنے میں کیا مشکل ہے؟

جواب۔ آپ ایسے لوگوں کے ذمے نہایت جابر کاہ دشوار فرائض کر دیتے ہیں مگر ان کو اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے کافی تنخواہیں نہیں دیتے۔......

مسٹر ہیوم۔ آپ نے بیان کیا ہے کہ موجودہ رعیت واری نظام سے کاشتکاروں کی بھکاریوں کی سی حالت بن جاتی ہے اور کس حد تک موضع واری نظام اختیار کیا جا سکتا ہے اس کے متعلق آپ نے اپنے شکوک کا اظہار بھی کیا ہے مگر کیا آپ کوئی ایسا طریقہ بتا سکتے ہیں جس سے بمبئی کے کاشتکاروں کی اصلاح حال ہو سکتی ہے؟

جواب۔ مجھ کو خیال نہیں پڑتا کہ میں نے موضع واری نظام کے متعلق شبہ کا اظہار پہلے کیا ہے۔ برخلاف اس کے یہ وہی نظام ہے جس کی میں نے ہر وقت نہ صرف تائید کی بلکہ ہر جگہ اسی کو اختیار بھی کیا۔

بمبئی میں رعیت واری نظام ہی جاری رہا۔ آخر کار ۱۸۴۷ء میں قواعد بندوبست ایک "مشترکہ رپورٹ" کی شکل میں جس پر ایچ۔ ای گولڈ اسمتھ۔ کپتان ونگیٹ اور کپتان ڈیوڈسن کے دستخط تھے یکجا کر دیے گئے۔ یہی ۱۸۴۷ء کی "مشترکہ رپورٹ" بمبئی کے بندوبست کا سنگ بنیاد ہے جس طرح ۱۸۴۴ء میں ٹامسن کا شائع کردہ "عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات" نامی رسالہ شمالی ہند کے بندوبست کا تھا۔

اس "مشترکہ رپورٹ" میں بندوبست بمبئی کے جن اصول کی توضیح کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

اول یہ کہ ہر کھیت پر فرداً فرداً تشخیص لگان کیا جاتا تھا۔

دوم یہ کہ طویل المیعاد تیس سالہ پٹے دیے گئے تھے۔

سوم۔ یہ کہ لگان کی تقسیم تخمینہ پیداوار پر نہیں بلکہ قیمت زمین پر مبنی ہوتی تھی۔

"جب تک کاشتکار اپنی مقررہ مالگزاری ادا کرتا رہے خواہ ہر سال اس کے ساتھ تجدید اقرار نامہ کیوں نہ ہو اس وقت تک اس کا اپنے کھیتوں پر حق قبضہ زائل نہیں ہو سکتا۔ کاشتکار کے زیر قبضہ کُل زمین پر ایک ساتھ محصول لگانے کے بجائے ہر کھیت پر علٰحدہ علٰحدہ محصول لگانے میں فائدہ یہ ہے کہ حالات کے لحاظ سے جس وقت مناسب معلوم ہو کاشتکار جتنے کھیتوں سے چاہے دست بردار ہو سکتا ہے یا دوسرے کھیتوں کو جو کسی کے زیر قبضہ نہوں اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے اور اس طرح اپنے ذرائع آمدنی کے مساوی اپنی ذمہ داری میں کمی وبیشی کر سکتا ہے ہماری پیمائش نے کھیتوں پر ۳۰ سالہ میعاد کے لیے جو محصول مقرر کر دیا ہے اس سے کاشتکار کو اندرون میعاد مقررہ سال بہ سال ہر کھیت کا محصول ادا کرنے پر بلا کسی مزید شرط کے ۳۰ سالہ پٹے کے جملہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح کسی لاحقہ ذمہ داری یا خطرے کے بغیر جس کی تلافی اس کے محدود سرمایہ اور متزلزل حالت کا لحاظ کرتے ہوے اس سے ممکن نہ تھی کاشتکار کو تحفظ حقیت اراضی ایسا ہی حاصل ہو جاتا ہے جیسا ایک طویل المیعاد پٹے میں"۔

اراضی کی قدر کا تخمینہ کرنے کی غرض سے تمام اراضی کے نو مدارج قائم کیے گئے تھے جیسا ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوتا ہے:

قسم	قسم کی مالیت اضافی آنوں میں یعنے روپیے کے سولھویں حصے میں	مٹی		
		درجہ اوّل جو یکساں باریک اجزا سے مرکب ہے اور رنگ میں گہری سیاہ سے گہری بھوری تک ہوتی ہے	درجۂ دوم جو مقابلۃً یکساں موٹے اجزا سے مرکب ہے اور رنگ میں بھی ہلکی اور عموماً سرخ ہوتی ہے۔	درجہ سوم کنکریلی اور ریتیلی بھربھری اور رنگ میں بادامی سے بھوری تک ہوتی تھی۔
	گہرائی ہاتھوں کے مساوی ایک ہاتھ = ½۱ فٹ	گہرائی ہاتھوں کے مساوی ایک ہاتھ = ½۱ فٹ	گہرائی ہاتھوں کے مساوی ایک ہاتھ = ½۱ فٹ	
۱	۱۶	۱ ۳/۴	۰	
۲	۱۴	۱ ۱/۲	۱ ۳/۴	—

۳	۱۲	۱¼	۱½	
۴	۱۰	۱	۱¼	
۵	۸	¾	۱	
۶	۶	½	¾	۱
۷	۴½	¼	½	¾
۸	۳	—	¼	½
۹	۲	—	—	¼

کھیتوں کے اقسام مقرر کر دینے کے بعد کل ضلع پر مطالبۂ سرکار کی تشخیص باقی رہ جاتی تھی تاکہ اس ضلع کے کھیتوں اور مواضعات پر مطالبۂ سرکار کی جملہ رقم منقسم کر دی جاسکے۔

"بندوبست کی تکمیل کے لیے تمام ضلع پر محصول کی کتنی رقم لگانی چاہیے صرف اس کا تعین قطعی طور پر کر دینا باقی ہے۔

"اس رقم کی تشخیص ہی سب سے اہم اور سب سے مشکل کام ہے جو پیمایش کے ذمے ہے اور جس عہدہ دار کا یہ فرض منصبی ہوتا ہے اس کو علاوہ دوسری باتوں کے نہایت تمیز اور سمجھداری کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے صاف طور پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمارے سابقہ انتظام کی نوعیت کیا تھی اور اس کا اس ضلع پر کیا اثر ہوا۔ اس کے معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سالانہ بندوبست مالگزاری کے متعلق گزشتہ جتنے برسوں کا قابلِ اعتبار مواد مل سکتا ہے اور پیمایش کے وقت مقامی لوگوں سے دریافت کرنے پر دستیاب ہوسکتا ہے اس کی چھان بین کے بعد اعداد کا ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔

"اس کے علاوہ مواضعات یا ان خطوں کی جن میں متعدد مواضع واقع ہوں خوشحالی یا انحطاط کے اسباب دریافت کرنے کے وقت اس سے بھی مدد لینے کے لیے ہر موضع کے سالانہ بندوبست مالگزاری کی ایک علیحدہ کیفیت مرتب کی جائے ....

"اور سب سے آخر اس اہم موضوع پر مکمل سے مکمل معلومات حاصل کرنے کی غرض سے تفصیلی کیفیتیں اور افراد اعداد مرتب کرنا چاہیئے جن میں ہر قسم کی اراضی جو ان مواضعات کے اندرونِ حدود واقع ہو جن پر مالگزاری لگانے کی تجویز ہورہی ہے خواہ ایسی زمین سرکاری ہو یا سرکار نے کسی کو دیدی ہو کن کن مدّات کے تحت کن کن ذرائع سے کیا کیا محاصل وصول ہوتے ہیں ان سب کو بتانا چاہیے۔

"اس طرح جو معلومات فراہم اور مقامی تحقیقات سے جو گزشتہ تاریخی حالات جمع کیے جائیں ان سب سے ہم اس ضلع کے سابقہ حالت کے موثر اسباب کا پتا لگا سکتے ہیں۔ ان باتوں کے علم کی بدولت اور اس ضلع کی استعداد اراضی کا دوسرے آس پاس کے اضلاع سے مقابلہ کرنے کے بعد اب مالگزاری کی کیا رقم مشخص کر دینی چاہئے اس کے متعلق ہم ایک اطمینان بخش نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

قارئین ان دقیق و دشوار قواعد سے فوراً محسوس کر سکتے ہیں کہ اس ضلع پر اس کے اور اس کے مواضعات کے گزشتہ تاریخ اور سابقہ حالات کے لحاظ سے سرکاری مطالبہ کی تشخیص کس قدر عہدہ داران بندوبست کی قوت تمیزی اور فیصلے پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ اگر عہدہ دار ہمدرد ہوتا تھا تو اس کو حسب دل خواہ اعتدال پر کاربند رہنے کی اور اگر وہ ہمدرد نہ ہوتا تھا تو من مانے تشدّد کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل تھی اور لکھوکھا کسانوں کی خوش نصیبی یا بدبختی رواجی دھارے پر نہیں بلکہ مختلف عہدہ داروں کے مختلف فیصلوں پر منحصر تھی۔ مزید برآں ضلع کی سابقہ حالت کے لحاظ سے جو مالگزاری مقرر ہوگی لازمی ہے کہ خوش حالی کا زمانہ آنے کے بعد اس میں اضافہ بھی ہوگا۔ پھر ایک ایسے نظام میں جس کے تحت زرعی سرسبزی پر اسی طرح روز افزوں محصول کا مضر اثر پڑ سکتا تھا کسانوں کی دوامی اصلاح حالات ناممکن نہیں تو کیا تھی۔

تشخیص لگان کی یہ کمزوری حکومت بمبئی کی نظر سے نہیں چوک گئی تھی۔ گورنر بمبئی نے اپنی ۱۶ر نومبر ۱۸۴۷ء کی یادداشت میں لکھا تھا کہ "مجھ کو اس بات کے اعتراف کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ فی الوقت ہمارا انحصار کلیتاً ہمارے مہتموں کے فیصلوں ہی پر ہے۔ اور اس وقت تک ہماری یہی حالت رہے گی

جب تک ہمارے کمشنران مالگزاری ہمارے اور ہمارے مہتمموں کے مابین ڈاک کی طرح مراسلات پہنچانے کا ذریعہ بنے رہنے کے بجائے کچھ کام نہ کریں"۔ لیکن خود کمشنران مالگزاری اس معاملے میں بے دست و پا تھے۔ بمبئی کی کونسل کے رکن آنریبل مسٹر ریڈ نے اپنی ۱۶ مئی ۱۸۴۸ء کی یادداشت میں نہایت برمحل یہ لکھا تھا کہ "میں معزز ممبر مجلس کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ مہتممان پیمائش کے فیصلے پر انحصار لازمی ہے۔ درحقیقت ان امور میں انھیں پر کلیتاً انحصار کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کیونکہ میرے خیال میں کمشنران مالگزاری سے بجز مہتمموں کے کام پر ایک عام نگرانی رکھنے کے اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کام کی تفصیلی تنقیح کرنے کی چند ہی کمشنروں میں قابلیت ہو گی اور ایک بھی کمشنر ایسا نہ ہو گا جس کو اتنی فرصت ملتی ہو کہ وہ خود اس کام کو کر سکے۔"

ونگیٹ کے لیے یہ موجب ستایش ہے کہ اس نے اپنے غیر محدود اختیارات سے نہایت اعتدال فراست اور انسانیت کے ساتھ کام لیا۔ تشخیص لگان میں اگرچہ اس نے محض قیاس ہی سے کام لیا تھا اس پر بھی حتی الامکان نہایت احتیاط اور کاوش کے ساتھ اس نے اس کام کو انجام دیا اور اس کے بندوبست سے دکن کے کسانوں کو اس بدنظمی اور ظلم سے نجات ملی جو وہ بیس سال سے جھیل رہے تھے۔ مدراس میں سر ٹامس منرو اور شمالی ہند میں مارٹنز کی طرح بمبئی میں سر جورج ونگیٹ کی یاد تازہ ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ ان کا کارنامہ سنگین غلطیوں سے بالکل پاک تھا بلکہ اس لیے کہ جہاں پہلے بدنظمی تھی وہاں انتظام اور ایسا نظام قائم کرنے میں جو آج تک چلا آرہا ہے بہ حیثیت مجموعی وہ کامیاب رہے۔

بمبئی کے انگریزی عمال و عہدہ داروں نے وقتاً فوقتاً جو محصول اراضی لگایا تھا اس کا مالی نتیجہ اعداد کے ملاحظہ ہی سے بہترین طور پر ظاہر ہوتا ہے ۱۸۱۷ء اور ۱۸۱۸ء کے درمیان پیشوا کی قلمرو کے الحاق کے بعد سے ونگیٹ کی ۱۸۳۶ء میں شروع کی ہوئی پیمائش و بندوبست تک اس صوبے میں انگریزی عملداری کے حدود میں کسی قسم کی توسیع نہ ہوئی لیکن اس کے باوجود اس فتح کے بعد ہی تھوڑی مدت میں مالگزاری میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔

	پونڈ تھی
۱۸۱۷-۱۸۱۸ء میں مالگزاری کی رقم	۸۶۰۰۴۷
۱۸۱۸-۱۸۱۹ء " " "	۱۱۴۳۰۴۱
۱۸۱۹-۱۸۲۰ " " "	۱۰۷۸۱۶۴
۱۸۲۰-۱۸۲۱ " " "	۱۸۱۸۳۱۴

دوسرے لفظوں میں بشمول مقبوضات مفتوحہ اس صوبے کی مالگزاری پیشوا پر فتح پانے کے چار سال کے اندر اندر دوچند سے بھی کچھ زیادہ ہوگئی۔

ونگیٹ نے جو بندوبست ۱۸۳۶ء میں شروع کیا تھا وہ ۱۸۷۲ء میں جاکر کہیں تکمیل کو پہنچا اور پونا اور چند دیگر مقامات کو جن کے بندوبست زیر نظر ثانی تھے خارج کرکے سابقہ جملہ مالگزاری ۱۵۳۴۰۰۰ پونڈ جو تھی وہ اب ۲۰۳۲۰۰۰ پونڈ ہوگئی تھی یعنے اس میں ۳۲ فی صدی اضافہ ہوگیا تھا۔ مختلف اضلاع کے اعداد حسب ذیل ہیں:

ضلع	مالگزاری قبل بندوبست پونڈ	مالگزاری تحت بندوبست پونڈ
ٹھانہ	۱۶۶۲۸۷	۲۱۱۰۳۷
خاندیس	۲۱۵۹۴۶	۳۰۷۸۶۹
رتناگری	۴۶۴۴۰	۴۶۵۷۲
احمد آباد	۵۳۷۵۲	۹۰۴۷۴
کھیرہ	۱۴۴۸۸۶	۱۸۸۷۵۲
سورت	۱۷۴۰۸۱	۲۴۰۱۳۴
بروچ	۸۸۹۸۴	۱۱۲۵۶۴
پنچ محال	۴۸۲۵	۸۱۵۵
کراچی	۱۹۴۰۴	۳۱۶۷۶
حیدرآباد (سندھ)	۶۳۳۳۰	۷۷۳۵۳
شکارپور	۱۲۳۹۳۱	۱۵۹۲۶۳
دھارواڑ	۱۱۳۰۳۹	۱۵۶۵۶۲

بلگام	۱۳۰۷۴۴	۱۵۷۰۲۶
کشناگری	۳۰۵۵۵	۵۸۲۸۳
سنارا	۱۴۳۶۵۶	۱۵۸۵۴۳
کنارا	۱۴۸۵۰	۲۷۷۸۸
میزان	۱۵۳۴۷۱۰	۲۰۳۲۰۵۱

پانچواں باب

مدراس میں بندوبست اراضی

۱۷۹۲ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلے پہل بارہ محال کے اضلاع پر قبضہ ہوا تو وہاں کپتان ریڈ اور ٹامس منرو نے رعیت داری بندوبست یعنے کاشتکاروں کے ساتھ انفرادی طور پر تعین مالگزاری کا طریقہ رائج کیا تھا اور یہی نظام رفتہ رفتہ صوبہ مدراس کے دوسرے اقطاع میں بھی پھیل گیا تھا۔ پہلی دفعہ جو مالگزاری مقرر کی گئی تھی وہ نہایت سنگین تھی۔ سرکاری مطالبہ کھیتوں کے تخمینۂ پیداوار کا نصف کردیا گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ یہ مطالبہ تمام ملک کے جملہ معاشی لگان سے بھی زیادہ تھا۔ ٹامس منرو نے یہ بات خوب محسوس کی اور ۱۸۰۷ء میں مالگزاری کو گھٹا کر اس نے پیداوار کا ایک ثلث کردینے کی تجویز پیش کی۔ حکومت مدراس نے اس تجویز کے مبنی بر انصاف ہونے کا اعتراف تو کیا مگر وہ اس لیے اس پر عمل پیرا نہ ہوسکی کہ نظمائے کمپنی بار بار زرطلب کررہے تھے۔ چنانچہ مزید دس لاکھ پونڈ سالانہ بھیجتے رہنے کے احکام انگلستان سے اس دھمکی کے ساتھ صادر ہوئے تھے کہ عدول حکمی کی صورت میں تخفیف عملہ کا مسئلہ خود نظماء اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ اسی لیے مدراس کے کسانوں کو سرکاری مطالبے کی زیادتی سے نجات نہیں ملی۔

۱۸۰۰ء اور ۱۸۱۶ء کے درمیان مدراس کی مجلس مالگزاری نے اس صوبے

کی دیہی جماعتوں کو تسلیم کر لینے کی پُر زور تائید کی اور صلاح دی کہ ہندوستان کے قدیم رواج کے موافق انھیں جماعتوں کے ساتھ بندوبست مالگزاری کیا جائے۔ مجلس نے تجربے سے یہ بھی ثابت کر کے دکھادیا کہ جہاں کہیں موضع واری بندوبست عمل میں آیا تھا وہ نہایت کامیاب رہا تھا اور جس جگہ فرداً فرداً اسامیوں سے بندوبست کیا گیا تھا وہ بالکل ناکامیاب ثابت ہوا تھا۔ لیکن کمپنی کی مطلق العنان حکومت میں ایسی دیہی جماعتوں کی جو رعایا کی نمایندہ تھیں کوئی گنجایش ہی نہ تھی۔ نظما نے اس جماعت کے بلا توسط کاشتکاروں ہی سے فرداً فرداً معاملہ طے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی تاریخ سے مدراس کی قدیم دیہی جماعتوں کا انحطاط شروع ہو گیا۔

۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۷ء تک سر ٹامس منرو گورنر مدراس رہا تھا اور اس عرصے میں اس صوبے کے تمام اقطاع میں جہاں زمینداروں سے دوامی بندوبستِ مالگزاری نہیں ہوا تھا رعیت داری بندوبست شروع کر دیا گیا۔ منرو نے اپنی سابقہ تجویز کے موافق سرکاری مطالبے میں تخفیف کر دی اور اس کے ہمدردانہ طریقِ کار اور انتھک نگرانی سے کئی خرابیاں رفع ہو گئیں۔

لیکن اس کے باوجود سر ٹامس منرو کا مطالبہ تخفیف کے بعد بھی سنگین ثابت ہوا۔ کئی مواضعات اور کھیتوں میں پیداوار کا ایک ثلث کُل معاشی لگان کے مساوی تھا۔ عام قیمتوں اور سالانہ پیداوار کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک مقررہ رقم نقد وصول کر لی جاتی تھی اور ان کے وصول کرنے کے لیے نہ تو بزرگانِ قصبہ اور نہ قصبے کی کسی مجلس کا توسط اختیار کیا جاتا تھا بلکہ یہ رقم مملکت کے چند کم مواجب مختار و بکار پرداز وصول کرتے تھے جو اپنی بددیانتی اور مظالم سے کاشتکاروں کے مصائب و تکالیف میں اضافہ کر رہے تھے۔ جب سر ٹامس منرو کو جو ہر بات کی تنظیم کرتا اور ہر بات پر نظر رکھتا تھا دستِ قضا نے اس منظرِ ہستی سے اٹھا لیا تو اس نظام کی مشکلیں اور زیادہ محسوس ہونے لگیں۔ تیس سال تک صوبہ مدراس ایسے مظالم اور زرعی مصائب کی جولان گاہ بنا رہا کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں بھی کہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

مالگزاری کے کلکٹروں نے بھی عالمگیر مصیبتیں جن میں وہ گھرے ہوئے تھے بچشمِ خود

کی تھیں اور ان پر رپورٹیں لکھی تھیں جن کے چند اقتباسات ملاحظہ کرنے سے لوگوں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ضلع کڈھپہ۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں کلکٹر نے مجلس مالگزاری کو لکھا تھا کہ "جس قدر آپ سننے کے لیے تیار ہیں اس سے کہیں زیادہ اب رعیت تاجروں کے پنجوں میں گرفتار ہے صرف تقاوی لیکر اراضی کی کاشت کرنے سے بڑھکر کسانوں کو مقدور نہیں بشرطیکہ کوئی غیر معمولی نقصان ان کو نہ پہنچا ہو۔ اگر مویشی کے مرجانے یا اور وجوہ سے ان کو غیر معمولی نقصان پہنچ چکا ہو تو پھر تقاوی بغیر تلافئی مافات بالکل ناممکن ہے"

ضلع بلہاری۔ سنہ ۱۸۴۵ء میں کلکٹر نے اطلاع دی تھی کہ "عام طور پر رعایا کی شکایت اور درخواست یہی ہے کہ اس کو کاشت کا رقبہ کم کر دینے کی اجازت دی جائے اور یہ کاشت کے نفع بخش نہونے کا بین ثبوت ہے۔ پہلے تو رعیت خاصی مالدار تھی۔ اراضی میں سرمایہ لگانے کے قابل بھی تھی، سرکاری مطالبہ فوراً ادا کر دیتی تھی اور ایک مناسب قیمت آنے تک پیداوار محفوظ رکھتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ وہی رعیت قرض میں گرفتار سنگین سود ادا کرتی رہتی ہے اور قرض خواہوں کی بالکل دست نگر بن گئی ہے۔ اگر کلکٹر نے اپنے زیردستوں کے ذریعہ سے ان کی مدد نہ کی ہوتی تو اس اراضی کے جس پر بہت زیادہ مالگزاری لی جاتی تھی نصف یا کم سے کم ثلث حصے سے رعایا اب تک دست بردار ہوگئی ہوتی۔ یہاں کاشت خاطر خواہ نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ زمین جس قدر پیداوار کے قابل تھی اتنی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی۔ پٹے داروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن یہ ایک نادار طبقہ ہے جو صرف کشت کاری پر گزر اوقات کر لیتا ہے اور اس میں وہ ہمت بھی نہیں ہے کہ اس کا ان سابقہ زمینداروں سے تقابل کیا جائے جو طرح طرح کی مشکلات میں گرفتار ہونے کے بعد ضلع کے فرد جمعبندی سے اب خارج ہو چکے ہیں۔ اس طبقے کے اکثر افراد کو پہننے کے لیے نہ برابر کپڑے نصیب ہیں اور نہ پیٹ بھر کبھی کھانا ہی میسر آتا ہے اور ان کی حالت اور ہئیت کو دیکھ کر سوا اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ افلاس ہی اس کا اصل سبب ہے"

سر ہنری منٹگمری کی ۱۸۴۴ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجمندری (جس کا نام بعد میں ضلع گوداوری رکھا گیا تھا) کی حالت تباہی کے قریب پہنچ چکی تھی وہاں ۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۱ء میں قحط پڑے تھے۔ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۶ء اور ۱۸۳۷ء میں ہنگام نامساعد رہا تھا اور ۱۸۳۸ء اور ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۰ء میں ایسے موسمی حوادث وقوع پزیر ہوئے تھے جو آفت سے کم نہ تھے۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں ۷۹۵۰۱۶ کی آبادی تھی۔ مگر سنہ ۱۸۴۱ء میں گھٹکر ۵۳۳۰۳۶۰۰ رہ گئی تھی۔

گنتور اور مچھلی بندر۔ ان اقطاع میں ۱۸۳۳ء کا قحط جس کو قحط گنتور کہا جاتا ہے شدید ترین سمجھا جاتا تھا۔ کپتان والٹر کیمبل جس نے بچشم خود وہاں کی حالت دیکھی تھی لکھتا ہے کہ "محاصرۂ کارنتھ نامی نظم میں کتّوں کا انسان کی کھوپریوں کو چبا چبا کر کھانے کا جو ذکر ہے وہ بہ مقابل ان ہیبتناک واقعات کے جن کو دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جن کو روزانہ صبح و شام گھوڑے پر جاتے ہوئے دیکھنے کے سوا مجھے چارہ ہی نہ تھا ایک بالکل معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ دیکھنا کس قدر ہولناک ہے کہ انسان ہو کر کیسی کیسی نفرت انگیز چیزیں مجبوری کے وقت جان بچانے کے لیے زہر مار کرنی پڑتی ہیں یہ فاقہ زدہ بدبخت مرے ہوئے کتّے ہوں کہ گھوڑے سب چٹ کر جاتے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ قلعے سے ایک گدھا راہ بھٹک کر ان لوگوں میں چلا گیا تھا۔ بھیڑیوں کے غول کی طرح یہ لوگ اس پر گرے۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور وہیں ہضم کر گئے۔" ضلع کرشنا کے گنتور کی طرف کے حصے میں ایک ثلث سے نصف تک آبادی کا صفایا ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے سال ہی ایک ایسی وبا پھیلی کہ ایک بھی "باصحت اور تنومند شخص کہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

ضلع نلور۔ اناج کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے یہاں کی رعیت مفلس ہو گئی تھی۔ کاشت کا تمام تر رقبہ ۱۸۰۱ء میں ۲۴۴۳۱۹ ایکر جو تھا وہ گھٹ کر ۱۸۵۰ء میں ۲۰۹۸۰۲ ایکر ہو گیا تھا لیکن عام قیمتوں کے گھٹ جانے سے محصول کا بار بڑھ گیا تھا اور اسی لیے باغات کی اراضی کی کاشت موقوف ہو گئی تھی۔

شمالی ارکاٹ۔ کلکٹر نے اطلاع دی تھی کہ "رعیت کی حالت جیسی

اس صدی کے ابتداء میں تھی اب اس سے بھی بدتر ہے ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حالت بری ہے اور قابل اصلاح ضرور ہے۔ ان میں سے اکثر بے حد مفلس ہیں ان کی غذا نہ تو اچھی ہوتی ہے اور نہ کافی ان کے کپڑے بھی غریبانہ ہی ہیں اور تن ڈھانکنے کے برابر نہیں ہوتے ان کے مسکن معمولی جھونپڑیاں ہیں اور ان سب پر طرہ یہ نری جہالت میں مبتلا ہیں۔"

جنوبی ارکاٹ۔ کلکٹر کی اطلاع کے موافق آبادی اور محنت کی اجرت میں یہاں اضافہ ہوا تھا اور گاڑی گھوڑا کپڑے۔ مکانات رعایا کی ترقی پر نمایاں حال سے شاہد تھے۔ مگر سنگین اور غیر مساوی لگان کے باعث یہاں زراعت بہت پیچھے تھی اور دو ثلث قابل کاشت زمین افتادہ تھی۔

ضلع تنجور۔ اس ضلع کے ذرائع آبپاشی او رذرائع آمد و رفت میں ترقی ہونے کی وجہ سے بمقابل دوسرے اضلاع کے یہاں زرعی حالت کم خراب تھی۔

ضلع کوئمبتور۔ کلکٹر نے ۱۸۵۵ء میں یہ لکھا تھا کہ گزشتہ دس ہنگام میں نو خراب تھے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مالگزاری کی رقم گھٹ گئی۔ بمبئی سے موٹے موٹے کپڑے کے تھانوں کی جو تجارت قائم تھی اس میں کچھ اضافہ ہوا تھا مگر مہین مہین پارچوں کی تجارت تو انگریز صناعوں نے غارت کردی۔ پے در پے خرابی موسم کی وجہ سے غلے کی قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

اضلاع سالم و مدورا و تناولی۔ سوتی پارچوں کی برآمد میں جو کوئمبتور سالم۔ مدورا اور تناولی میں بنتے تھے بہت کچھ بیشی ہو گئی تھی۔ کاشت میں بیشی ہونے کے ساتھ ساتھ محنت کی اجرت میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ کلکٹر نے یہ بیان کیا تھا کہ سستی قیمتوں کی وجہ سے اشیائے تعیش و تکلف کا صرف بڑھ گیا تھا۔

مدراس کی رعیت کی عام حالت۔ ان مختلف اضلاع کے حالات معلوم کرنے کے بعد ہم مدراس کے کاشتکاروں کی عام حالت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کو اس زمانے کے ایک مشہور مدراس کے عہدہ دار نے بیان کیا ہے۔ بورڈ کن بہ حیثیت کلکٹر شمالی ارکاٹ اور دوسرے مقامات میں رہ چکا تھا اور لوگوں کے

حالات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا تھا سر ارتھر کاٹن اور دیگر ممتاز اشخاص کے ساتھ تعمیراتِ عامہ کے ماموریہ کی رکنیت پر اُس کا بھی انتخاب کیا گیا تھا۔ اس ماموریہ نے ۱۸۵۲ء میں اپنی قابلِ قدر رپورٹ پیش کر دی تھی۔ بورڈلن نے ۱۸۵۳ء میں مدراس کی رعیت کے حالات نہایت ہی سنجیدہ اور معقول طور پر قلمبند کیے ہیں جن میں نام کو بھی مبالغہ نہیں اور کاشتکاروں کے لاعلاج افلاس کی دردناک تفصیل اس میں درج کی ہے۔

چند ہی کاشتکار ایسے تھے جن سے مالگزاری کم لیجاتی تھی یا جن کی اراضی مالگزاری سے مستثنیٰ تھی یا جو دیگر مفید مطلب حالات کی بنا پر مالدار سمجھے جاتے تھے اور دس ۱۰ تا چالیس ۴۰ شلنگ کی ماہانہ آمدنی پر خوش باش کہلاتے تھے۔ اس طبقے میں بھی تین پونڈ سے لیکر پانچ پونڈ تک کی آمدنی الشاذ کالمعدوم کا مصداق تھی۔

کاشتکاروں کا ایک غلبۂ کثیر ہمیشہ افلاس زدہ اور عموماً مقروض رہتا تھا رعیت کے طبقے کا ہر فرد بہ مشکل گزرِ اوقات کرتا ہے روپیہ پر اس کی نگاہ شاذ ہی پڑتی ہے بجز اس کے کہ سرکار کو قسط ادا کرنے کے لیے وہ اپنی چٹھی پر ساہوکار سے قرض لے۔ گاؤں کے باہر مبادلے کی زیادہ نوبت ہی نہیں آتی۔ اور جو کچھ بھی مبادلہ ہوتا ہے وہ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے ہل کے جانور نہایت خراب ہوتے ہیں اور ان کی قیمت فی راس ساڑھے تین روپے سے لیکر چھ روپے تک ہوتی ہے اور اس پر بھی یہ جانور اس کی ملک اس لیے نہیں ہوتے کہ انکی قیمت اس نے ابھی ادا نہیں کی ہے۔ اس کے ناقص اور بد شکل ہل کی قیمت جبکہ وہ بالکل نیا ہو دو ۲ یا تین ۳ شلنگ سے زیادہ نہیں اور اس کے چند زرعی اوزار اسی طرح کے ناقص و ناکارہ ہوتے ہیں۔ اس کا مسکن ایک جھونپڑی ہے جس کی دیواریں مٹی کی اور چھت پھوس کی ہوتی ہے اور مذکورۃ الصدر رعیت کے مکانوں سے ان جھونپڑوں کی حالت زیادہ خراب و خستہ تنگ و تاریک ہوتی ہے۔ اس میں سامان آسائش کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اس کی اور اس کے ارکانِ خاندان کی غذا کچھ تو دلیا ہوتی ہے اور کچھ چاول جنمیں برائے نام مسالہ پڑا ہوتا ہے۔ عام طور پر کھانے اور پکانے کے مٹی کے برتن بدنما اور بھدے ہوتے ہیں جن پر روغن نہیں ہوتا اور وہ اچھے انگریزی

سفال یا اینٹ سے زیادہ بھدّے نظر آتے ہیں۔ ایسا نہ تھا کہ اس طبقے میں کسی کے پاس پیتلی ظروف بالکل نہ تھے لیکن وہ شاذ ہوتے تھے۔

رعیت میں نیچے کے درجے کے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے قبضے میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے اور یہ لوگ مویشی مستعار لے کر اس ٹکڑے کی کاشت کر لیتے ہیں لیکن ان کا اصل پیشہ محنت مزدوری ہی ہے اور وہ یا تو جلانے کی لکڑیاں کاٹ کر آس پاس کے قصبات میں بیچ لیتے ہیں یا کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں۔

"محض مزدور پیشہ طبقے کے لوگ ان سے بھی نیچے درجے کے ہوتے ہیں اور در حقیقت ان کی حالت بھی ان سے بدتر ہوتی ہے مگر کوئی مابہ الامتیاز بات ان میں نہیں ہوتی۔ زراعت کا کام کاج کرنے والے مزدور کی آمدنی ہر چیز کو شامل کر کے ۲۰ روپے سالانہ سے بڑھ کر نہ تھی اور یہ بھی نقد نہیں بلکہ اشیا کی شکل میں ہوتی تھی۔

"اس آمدنی کی بڑی سے بڑی شرح ۲۰ روپے سالانہ ہی لی جائے تو بھی مذکورالصدر معیار سے انگلستان میں اس کی حقیقی قدر دس پونڈ سالانہ کے برابر تھی۔

"کھیتوں میں کام کرنے والے انگریز مزدور کی اوسط آمدنی فصل میں اضافہ یافت وغیرہ ملا کر ۲۰ پونڈ سالانہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس طرح ظاہر ہے کہ کھیتوں کے مزدور کی (جس کو مسلسل کام ملتا رہتا ہے) حقیقی اجرت یعنے اس کی مقدور برابر زندگی کی ضرورتیں اور سہولتیں انگلستان کے مقابل ہندوستان میں ایک ثلث سے کسی قدر زیادہ اس کو حاصل ہیں۔"

رعیت واری نظام کی اصل کارروائی پر جس میں ہر ضلع کے کلکٹر کا فریضہ تھا کہ وہ اپنے ضلع میں ایک لاکھ اسامیوں سے مالگزاری کی ناممکن الوصول رقم وصول کرے ایک اور ممتاز عہدہ دار کی شہادت ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ جو رج کیمبل نے جو بعد کو "سر" کے خطاب کے ساتھ بنگالے کا لفٹننٹ گورنر اور اس کے بعد رکن پارلیمنٹ مقرر ہوا تھا ۱۸۵۲ء میں مدراس کے اس نظام کے متعلق حسب ذیل بیان کیا ہے:

"و ذرا خیال تو کیجیے کہ ایک کلکٹر اور ڈیڑھ لاکھ اسامیوں سے جن میں ایک بھی پٹہ دار نہ ہو اور جہاں ہر کاشت کار اپنی کاشت اور فصل کے موافق اور اپنے مویشی بچے اور اولاد کی تعداد کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ مالگزاری ادا کرتا ہو جس میں اگرچہ تخفیف کا بھی امکان ہو مگر صرف ایسی صورت میں جبکہ وہ اس کی ضرورت معقول طور پر ثابت کر دے معاملات طے کرے۔ انگلستان یا دوسرا کوئی ملک کیوں نہ ہو وہاں اگر ایسا نظام ہو تو پھر اس نظام کے تحت ایک طرف تو زرعی مصائب اور دوسرے طرف اڑ دیا د اولاد کی بنا پر کیا ہی تہلکہ نہ مچے گا! اس وقت کیا کوئی اسامی ایسا بھی ہو گا جو یہ کہے کہ اس کی اراضی میں کچھ پیداوار واقعی ہوئی ہے یا اس کے مویشی کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے یا اس کے اولاد ہوئی ہی نہیں اگر کلکٹر غیب داں ہو یا اس نے عمر نوح اسی ضلع میں گزاری ہو تو بھی وہ اس فریضے کی انجام دہی کے قابل نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے وہ تو بندہ بشر ہے اور اس پر پر دیسی جس کا ہمیشہ یہاں سے سے وہاں تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بڑی تعجب کی بات ہو گی کہ اس کے ذیلی دیسی کا پردار جو چاہے نہ کر سکیں یا اقتدار رکھ کر اس کا بے جا استعمال نہ کریں۔ بنابراں عام طور پر یہ امر مسلم ہے کہ اس تمام نظام کی بدعملی بالخصوص مالگزاری کی معافیات کی بدنظمی بہت ہی بدنما ہے۔ ہر قسم کی ہیر پھیر اور بے انتہا سازشیں ہوتی رہتی ہیں اور اس پر جاسوسوں کی مخبریوں پر کلکٹر مدراس کے اعتماد کرنے سے رہی سہی اصلاح حال بھی کچھ نہیں ہوتی۔"

اس حکمت عملی کے یہ ابتدائی نتائج تھے جس میں دیسی جماعتیں نظر انداز کر دی گئی تھیں اور ہر چھوٹی چھوٹی اسامی سے بھی براہ راست ایک ناممکن الوصول رقم مالگزاری کا وصول کرنا ایک کلیۃً قرار دیا گیا تھا۔ نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس صوبے میں قسامت کے مارے کاشتکاروں سے مقررہ مالگزاری کے بروقت وصول کرنے کے لیے ان کو طرح طرح کی اذیتیں دینے کا طریقہ عام طور پر رائج تھا۔ اس زہر آلود طریق عمل کی خبر ہوتے ہوتے انگلستان تک پہنچی، اور ۱۸۵۴ء میں مسٹر بلیکٹ نے جو شہر نیو کاسل کی طرف سے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تھا۔ مدراس کے نظام اراضی کی تحقیقات کے لیئے انعقاد ماموریہ کی تحریک پر پارلیمنٹی بحث کی ابتدا کی۔ اس نے بیان کیا کہ اس

نظام سے بدتر کوئی نظام وضع نہیں کیا جا سکتا تھا اور دعوے کے ساتھ کہا کہ مطالبہ مالگزاری اخذ بیجا سے کم نہ تھا۔ کیونکہ وہ رعیت کو اذیت پہنچائے بغیر وصول ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جان برائیٹ نے بھی نہایت نڈرپن سے اس مباحثے میں شرکت کی اور مدراس کے کاشتکاروں کی حالت اور ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا تھا اس کے بیان کرنے میں وہ بلاغت دکھائی کہ لوگوں کو اس کی تقریر سن کر طیش آ گیا۔

یوں تو حکومت ہند اصلاح کی راہ میں قدم رکھنے سے جھجھکتی اور تساہل سے کام لیتی تھی مگر اس پارلیمنٹی مباحثے کے بعد کچھ نہ کچھ کرنے پر وہ بھی مجبور ہو گئی۔ لوگوں کی شہادت قلمبند کرنے کے لیے ایک ماموریہ مقرر کیا گیا اور اس ماموریہ کو اپنا کٹھن کام شروع کرنے کا مجاز کرنے کے لیے ایک قانون بھی نافذ کر دیا گیا ایلیٹ جو مدراس کی عدالت خفیفہ کا جج تھا اور نارٹن نامی مدراس کا ایک بیرسٹر اور اسٹوکس جو رعیت واری نظام کا بڑا ہی طرف دار تھا یہ تینوں کمشنر مقرر ہوئے جب کمشنر ایسے ہوں تو ان کی رپورٹ بھی ویسی ہی نپی تلی ہو گی۔ ان کے نزدیک یہ تو ثابت تھا کہ اس صوبے میں مالگزاری وصول کرنے کے لیے لوگوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں اور اس پر لوگ کہیں داد فریاد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کا شنوا ہی کوئی نہ تھا لیکن انہوں نے سرکار کے یورپی عہدہ داروں کو اس جرم میں لپیٹنے سے احتراز کیا، اور اس بات کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی کہ "عوام کو یہی خیال ہو گیا تھا کہ سرکار کے یورپی عہدہ دار اس برے برتاؤ سے جو رعایا کے ساتھ ہوتا تھا چشم پوشی کرتے ہیں یا اس کو روا رکھتے ہیں"۔

لوگوں کو جو اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں وہ حسب ذیل اقسام کی تھیں:۔ آدمی کو تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑا کرنا۔ کھانا کھانے یا حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے نہ دینا۔ چپراسی کو اس پر متعین کرنا۔ "کٹی انڈل"، کا استعمال یعنے آدمی کو خمیدہ کر کے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دینا۔ انگلیوں کو قینچی بنا کر دبانا۔ ادھر سے ادھر دوڑا کر اس کے چٹکیاں لیتے جانا۔ طمانچے لگانا اور تازیانہ یا گھسے مارنا۔ گوشمالی دینا۔ گھٹنوں میں روڑے دبکرا کڑوں بٹھانا۔ نیچ قوم کے کسی شخص کو اس کی پیٹھ پر سوار کرانا "دونا دھنہ" آدمیوں کے سروں کو لے کر ایک دوسرے

کے ساتھ ٹکرانا یا دونوں کے چونڈے باندھ دینا۔ پاؤں کاٹھ میں ٹھوکنا۔ گدھے یا بھینس کی دم سے سر کے بال باندھ دینا۔ گردن میں ہڈیوں کا یا اس سے بھی ذلیل نفرت انگیز چیزوں کا ہار بنا کر پہنانا اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ سخت سرزنش کرنا اور سزا دینا۔

اس تحقیقات کے اثنا میں ایک بات جو بالکل صاف طور پر معلوم ہوئی یہ تھی کہ جہاں زمین پر بہت سنگین محصول لگایا گیا تھا وہاں لوگوں کو اکثر اذیتیں دی جاتی تھیں۔ ماموریہ نے لکھا تھا کہ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کنٹرا اور ملیبار میں عام طور محصول اراضی ہلکا ہے لوگ بھی خوش حال ہیں اور آسانی ہی سے نہیں بلکہ خوشی خوشی مالگزاری ادا کرتے ہیں اور اس بنا پر وہاں ایک کش مکش سی رہتی ہے اور اس لیے نہیں کہ کس کس پر سرکاری مطالبہ ادا کرنا لازمی ہے بلکہ اس لیے کہ دیکھیں کون یہ مطالبہ سے پہلے ادا کرتا ہے اراضی کی وہاں قدر ہے اسی لیے وہ قابل فروخت بن گئی ہے۔ بنجر زمین کے بٹوارے پر ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ وہ مجھی کو ملے۔ ایسی حالت میں اگر ان سرسبز مقامات کے یورپی باشندے بلا استثنا یہ کہیں کہ اغراض مالگزاری کے لیے ایذا رسانی سے یہاں کے لوگ مقابلۃً ناآشنا ہیں تو اس پر کس کو تعجب ہو سکتا ہے!"

بورڈلن نامی شمالی ارکاٹ کے کلکٹر نے اپنی یہ رائے قلم بند کی تھی کہ اغراض مالگزاری کے لیے ایذا رسانی کا طریقہ "اب تک بالکل موقوف ہو گیا ہوتا اگر ان صوبوں میں زمین پر حد سے زیادہ مطالبہ سرکار نے نہ کیا ہوتا یا نظام مالگزاری میں وہ چند مخصوص واقعات نہوئے ہوتے جو ہوئے تھے۔ اگر مالگزاری اعتدال پر مبنی ہوتی تو اراضی بھی قابل قدر ملک متصور ہوتی اور ہر شخص احتیاط کرتا کہ کہیں وہ ہاتھ سے نہ چلی جائے۔ تنگ دستی کے زمانہ میں بھی خود زمین اس کے پاس ایک ذریعہ تھی جس سے وہ مطالبہ سرکار بآسانی ادا کر سکتا تھا۔ مزید برآں اگر محصول اراضی اعتدال پر مبنی ہوتا تو خود اس کا قوی اثر لوگوں کی کردار کو فروغ پر پہنچانے کے لیے کافی تھا کیونکہ جب لوگ اپنے لیے املاک پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں تو ان میں خودداری پیدا ہو جاتی ہے اور عوام میں احترام کس طرح قائم رکھنا چاہیے اس کا ڈھنگ بھی

بھی انھیں آجاتا ہے جس کے بعد صاحب ملک و جائداد کسی صورت سے ذاتی تذلیل وتحقیر گوارا نہیں کرسکتے۔"

رعیت داری نظام کی برائیوں اور بے انداز محصول اراضی لگا دینے کی خرابیوں سے جیسی مدراس میں پھیلی ہوئی تھیں حکومت ہند خوب واقف تھی چونکہ شمالی ہند کے نظام کے مقابلے میں یہ نظام اتنا اچھا نہ تھا اسی لیے اس پر اعتراضات بھی ہوئے تھے۔ جیسا پچھلے باب میں بیان کیا گیا ہے صدر مجلس مالگزاری نے گورنر جنرل ہند کی خدمت میں ایک پُرزور مراسلہ بھیجا جس میں اس نے مدراس کے نظام پر نکتہ چینی کی تھی اور بتایا تھا کہ سرکار کا ہر کم مواجب کارپرداز کیا کیا جعلسازیاں اور مظالم نہیں کرتا ساتھ ہی ساتھ مجلس نے ہر کاشتکار کے ذرائع آمدنی کے متعلق دریافت کرنے کے طریقے کو جو عدالتی تحقیقات سے کم لوگوں کو دق کرنے والا نہ تھا مذموم قرار دیا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ جہاں سخت افلاس اور بے چارگی اسفل درجہ کی موجود تھی وہیں یہ نظام بھی تھا "اس سے ہر شخص خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اس کی ایک طفلانہ حیثیت بن جاتی ہے نہ تو اپنے بل آپ کھڑے رہنے والوں کی مردانہ آن بان اس میں ہوتی ہے اور نہ اپنے سے کسی بڑے آدمی کے لطف و کرم اور غیظ و غضب سے ایک مستغنی شخص کی سی تمکنت و بردباری اس میں پائی جاتی ہے۔" لیکن حکومتِ مدراس نے اپنے بدترین انتظام مالگزاری کی اصلاح کے لیے نہ تو صدر مجلس کی ایک سنی اور نہ کلکٹروں نے ان اضلاع کی مسلسل بُری اطلاعوں پر کچھ دھیان کیا۔

تعجب تو اس پر ہے کہ دوسرے صوبوں میں جب برڈ اور ونگیٹ جیسے مرد میدان بڑی بڑی خرابیوں کی بیخ کنی کر رہے تھے اس وقت مدراس کے حکام کوئی بڑی اصلاحی تجاویز یا نقائص کو دور کرنے والی تدابیر یا لوگوں کے حالات کو ترقی 77 دینے کی کوئی مدبرانہ حکمت عملی اختیار کرنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ صوبہ مدراس کا لقب ہمیشہ سے "سیاہ بخت" رہا ہے مگر پہلے کسی زمانے میں بھی وہ اس مذمت کا اس درجہ مستحق نہ تھا جیسا انیسویں صدی عیسوی کے اوّل نصف حصے میں وہ نظر آتا تھا۔ ہندوستان میں ہر جگہ ضیائے نور بتدریج پھیل رہی تھی

نگر ساحل کرومنڈل پر جو گھنگور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ان کی تاریکی تک اُس کی شعاع نہ پہنچی تھی نہ پہنچ سکی۔ ہم تک سرکاری اسناد کا ایک دفتر پہنچا ہے۔ لیکن اس میں مدراس کے اصلاح حال کی تدبیروں اور منصوبوں کو ہماری نظریں ڈھونڈتی رہیں مگر لاحاصل!

اس وقت بھی مدراس کے عہدہ دار اپنے ہی نظام پر نہ صرف کاربند تھے بلکہ کسی وجہ سے محصول کی نادہندگی پر دوامی بندوبست شدہ جاگیریں نیلام کر کے اس نظام کے حلقۂ عمل میں وسعت پیدا کر رہے تھے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس حکمت عملی کی جس مستعدی کے ساتھ پابندی کی گئی تھی اس کو ایک عہدہ دار وقت نے یوں بیان کیا ہے "کسی رعیت واری کلکٹر سے اس کے مکان پر ملیے اور اس کے مہمان نواز دسترخوان پر اُس سے گفتگو کیجیے تو وہ تسلیم کر لے گا کہ فلاں بڑی زمینداری جو ابھی ابھی نیلام کر دی گئی ہے وہ محض اس کے انتظام کی ہوشیاری اور چالاکی کا نتیجہ ہے اور وہ یہ کہ زمیندار کو جان بوجھ کر کلکٹر نے ایسا پھانسا کہ رہائی کی کوئی صورت ہی نہ رہی اوّل تو اراضی کو نیلام کرنا ہی لازم نہ تھا لیکن بجائے نیلام کو موقوف کرنے کے اراضی کو بڑی بیدردی کے ساتھ نیلام کر دیا گیا۔" اس شخص[1] نے متعدد ایسی مثالیں بھی دی ہیں جن کو پڑھتے ہی سے اب تکلیف ہوتی ہے۔

---

[1] "مدراس۔ نظم ونسق دیوانی" مولفۂ پی۔بی۔اسمالٹ۔ لندن ۱۸۵۷ء عیسوی ضلع تنیاولی میں جو کم ٹی کی قدیم جائداد کا مالک اپنے بقایا کے تصفیے کے لیے وہاں کے کلکٹر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس کو غدار اور خطرناک شخص قرار دیکر حراست میں لے لیا گیا۔ اور کوئی قانونی جرم اُس پر عائد کیے بغیر اُس کو ایک سیاسی مجرم کی حیثیت سے قید میں رکھا گیا اور اُس کی جائداد بھی ضبط کر لی گئی۔ ضلع نلور میں اوڈیگری کے مسلمان جاگیردار پر خواہ مخواہ سرکار کی بدخواہی اور بغاوت کا الزام لگا کر بلا کسی عدالتی تحقیقات کے اس کو اسی طرح قید کر لیا گیا اور اس کی جاگیر بھی ضبط کر لی گئی۔ ضلع گنتور میں واسی ریڈی کے مقبوضات جن کی سالانہ آمدنی ساٹھ ہزار پونڈ تھی وصول بقایا کے لیے پانسو پونڈ میں نیلام کر دیے گئے حالانکہ یہ اس زمانے کا بقایا تھا جب کہ خود سرکاری عہدہ داروں نے بحیثیت مہتممی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

رعیت واری نظام کا اصل بانی تو ٹامس منرو تھا مگر اس کے حاشیہ خیال
میں بھی وہ طریقے نہیں آئے تھے جو بعد میں اس نظام کے تحت زیر عمل لائے گئے۔ اس
نے سنہ ۱۸۳۱ء میں دار العوام کے سامنے یہ بیان کیا تھا کہ "رعیت واری نظام کا اصل
78 اصول ملک کی تمام اراضی پر محصول مقرر کر دینا ہی ہے۔ یہ محصول دوامًا مقرر کر دیا جاتا
ہے۔ ہر فرد رعیت جو اپنی اراضی کا مالک بھی ہے اور کاشتکار بھی اس بات کا مجاز
ہے کہ مقررہ مالگزاری پر جب تک چاہے اپنی زمین پر قبضہ رکھے اور آیندہ بھی رقم مالگزاری
میں بغیر کسی اضافے کے وہ اپنی زمین پر ہمیشہ قبضہ قائم رکھ سکتا ہے"۔

لیکن یہ مالگزاری بہت بڑھا چڑھا کر لگادی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطالبۂ
سرکار ہنگام کے اختلافات اور لوگوں کے تغیر حالات کے مطابق بڑھتا گھٹتا رہا۔
اس طرح صوبے کی نئی سالہ تاریخ اس محصول اراضی کے اتار چڑھاؤ کی تاریخ ہے۔ یعنے
حکمنامے پر حکمنامے جاری ہوتے تھے کہ محصول اراضی کل وہ تھا آج یہ کر دیا گیا۔
مصائب یا قحط کے آثار نمایاں ہوں تو اس میں تخفیف ہو جاتی تھی۔ اور خوش حالی
کی پہلی علامت نظر آنے لگتی تو اضافہ ہو جاتا تھا۔ موجودہ عہد کی تاریخ میں ایسے
انتظام کی ایک بھی مثال نہیں ملے گی جہاں اراضی پر مالگزاری عائد کرنے کا ایک
کا ایک ایسا نظام قائم ہو جس کے تحت سال بسال ملک کے انتہائی مقدور تک
مالگزاری وصول کر لی جائے۔ اور اسی طرح ایک بڑی محنتی اور متمدن آبادی کیلیے اصلاح
حال یا زرعی دولت کی تحصیل بالکل ناممکن بن جائے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کی مکرر تجدید سے پہلے سنہ ۱۸۵۲ء اور سنہ ۱۸۵۳ء کی پارلیمنٹی
تحقیقات میں اس نظام کی خرابیوں کی خوب پردہ دری ہوی اسی تحقیقات
کے سلسلے میں مدراس کے حکام کا بھی بیان لیا گیا۔ اور ان عہدہ داروں نے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ گزشتہ)۔ اس جاگیر کا انتظام کیسا تھا۔ ضلع مچھلی پٹن میں ندادول
کی جاگیر جس کی سالانہ آمدنی تین ہزار پونڈ تھی بارہ سو پونڈ میں نیلام کر دی گئی۔ ضلع وزیگپٹن میں
گولکنڈہ کی قدیم زمینداری جس کی سالانہ آمدنی ہزار پونڈ تھی صرف دس پونڈ میں نیلام کر دی گئی۔
اس طرح ایک ایک کر کے اور جاگیریں بھی نیلام کر دی گئیں۔ پھر ان زمینات میں رعیت واری نظام کی ترویج
آسان ہو گئی۔

بے باکانہ سب کچھ کہدیا۔

میلکم لیون نے جس نے ہندوستان میں بیس سال تک کلکٹر اور جج اور رکن کونسل کی حیثیت سے مختلف خدمتیں انجام دی تھیں دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے بیان کیا کہ "میرے خیال میں نظام مالگزاری سے ملک کے اخلاق کا بہت بڑا تعلق ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ مدراس میں ابھی نظام مالگزاری ایسے موجود ہیں جن سے ایک طرف تو ملک کے اخلاق کی بیخ کنی اور دوسری طرف رعایا کے افلاس میں اضافہ ہونے کا احتمال ہے۔" اس نے یہ بھی کہا کہ "تحصیلدار تحقیقات کے لیے ادھر اُدھر دورہ کرتے رہتے ہیں اور انھیں کے ہاتھ میں اس تمام رقم مالگزاری کا تعین
ہے جو سرکار رعیت واری اضلاع سے وصول کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں 79
کہیں تحصیلدار پہنچتے ہیں اس گاؤں کی رعیت سب سے پہلے تحصیلداروں کو رشوت دیکر اس لیے اپنا کرلیتی ہے کہ مالگزاری ان پر کم باندھی جائے۔"

جیمز ولیم بی ڈائیکس نے جو ضلع سالم میں مالگزاری کا کام کرچکا تھا دارالعوام کے سامنے بیان کیا کہ اس صوبے میں اس سرے سے اس سرے تک رعیت واری نظام میں حسب تفصیل ذیل نقائص موجود تھے۔

(۱) محصول لگانے کی بے قاعدگی یعنے کاشت کاروں کی اراضی میں اصلاح کی صورت پیدا ہوتے ہی لگان میں اضافہ کردینا۔ (۲) ملکیت اراضی کا تذبذب اور (۳) قواعد مالگزاری سے جاہل ناخواندہ کاشتکاروں کی ناواقفیت۔

مدراس کے عمال نے ۱۸۵۵ء میں بمجبوری اصلاح کی وہی تدابیر اختیار کیں جن کو شمالی ہند میں ۱۸۳۳ء میں اور بمبئی میں ۱۸۳۵ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ ایک وسیع پیمانے پر پیمائش اور بندوبست کرنے کا تہیہ کیا گیا اور حکومت مدراس نے اپنے ۱۸۵۵ء کے مشہور حکم میں اس بندوبست سے خوشگوار ترین نتائج مرتب ہونے کی توقع ظاہر کی۔

"اگر صحیح طور پر پیمائش کی جائے اور احتیاط کے ساتھ بندوبست مالگزاری عمل میں آئے تو سب خرابیاں دور ہو جائینگی۔ ہر شخص کو کتنا لگان ادا کرنا چاہیے اس کا تعین ہو جائے گا۔ عام کلیہ یہی بن جائے گا اور معافیات کا مسئلہ ہی پھر

باقی نہیں رہے گا۔ کہ اس کے لیے سازشیں کی جائیں اور لوگوں کو رشوتیں
دی جائیں۔ اس طرح ایک طرف لجاجت اور عاجزی کرنے اور رشوت
دینے کا اور دوسرے طرف رشوت ستانی اور بددیانتی کا بہت کچھ انسداد
ہو جائے گا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے نظام کے تحت موجودہ مالگزاری
سے زیادہ رقم رعایا کو بہ نسبت پہلے کے کم زحمت دیکر وصول ہو سکتی ہے۔ نہ صرف
رعیت کا پیسہ جو عہدہ داران سرکاری کو رشوت دینے میں صرف ہوتا ہے
رعیت کو بچ جائے گا۔ بلکہ مالگزاری کی مساوی تقسیم سے ان لوگوں کو بھی
محصول کے مزید بار سے نجات مل جائے گی جو اس وقت بے انتہا رقم ادا کر رہے
ہیں۔ اور وہ لوگ بھی مالگزاری کا ایک واجبی حصہ ادا کرنے لگیں گے جو ناواجبی طور
پر اس وقت تک اس سے گریز کرتے رہے ہیں۔ فقط یہی نہیں بلکہ اس کا بھی یقین
80 ہے کہ اگر محصول مبنی بر اعتدال اور معینہ ہی رہے تو لوگ جلد جلد اراضی زیر قبضہ
لینے لگیں گے۔ فی الوقت اراضی پر بالواسطہ اور بلاواسطہ بار سنگین عائد ہونے
کی وجہ سے کاشت بے شک دبی ہوئی سی ہے لیکن جب یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا تو
نہ صرف اصلی زراعت پیشہ طبقے اور زمینوں کو اپنے زیر قبضہ لیں گے بلکہ تاجر طبقے
کے اکثر اشخاص بھی اپنی کمائی زراعت میں لگائیں گے۔

مزید برآں یہ بات یقینی ہے کہ بے انتہا مالگزاری لینے اور صحیح حسابات نہ
رکھنے سے بڑے پیمانے پر جعل سازی اور کاشت کے چھپانے کا موقع رعیت کو مل
جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسی ایسی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ایک وسیع پیمانے
پر ان کے وقوع کا ثبوت ملتا ہے۔ اور تمام عہدہ داران مالگزاری کو معلوم ہے
کہ عام طور پر یہی ہوتا ہے مگر ذیلی اہل کار رشوت لے کر اس سے چشم پوشی کر جاتے
ہیں جس سے اصل حال مخفی رہتا ہے اور منکشف نہیں ہونے پاتا۔

مالگزاری کی تخفیف کے ساتھ ہی اس کی ادائی سے لوگوں کا دغابازی
سے گریز کرنا کم ہو جائے گا۔ کیونکہ چشم پوشی کے لیے اہل کار کو رشوت دینے کی
ضرورت بھی کم ہو جائے گی اور صحیح طور پر پیمائش اور حسابات پاک و صاف ہو جانے
کے بعد ایسی جعلسازیاں ان کے لیے مشکل اور خطرناک ہو جائینگی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اس قدر اراضی کسی کے زیر قبضہ نہ ہونے سے یوں ہی پڑی رہے، صلح پسند اور جفاکش رعایا کو پیٹ بھر کھانا اور پیٹ پالنے کے برابر مزدوری نہ ملنے پر گھر بار چھوڑنے کی سخت مخالفت کے باوجود محنت مزدوری کے لیے سمندر پار جانا پڑے اور ہر سال سڑکوں اور ذرائع آمد و رفت میں توسیع اور ترقی بھی ہوا کرے تو پھر ان حالات میں یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر محصول اراضی میں اتنی تخفیف کر دی جائے جس سے زراعت نفع بخش ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ فی الفور زراعت میں بہت بڑی توسیع ہو جائے گی۔ ان توقعات کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے خطوں پر جو محصول اب ادا نہیں ہو رہا ہے وہاں ایسے اسباب پیدا ہو جائینگے کہ ان پر مالگزاری کا واجبی مطالبہ قابل عمل بن جائے گا۔ سب سے آخر یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ مجوزہ طریقوں پر کاربند ہونے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ اس بات کی بمشکل توقع کی جا سکتی ہے کہ اس وسیع صوبے کی پیمایش اور بندوبست پندرہ یا بیس سال سے کم مدت میں تکمیل 81 پائے گا۔ اسی طرح ہر سال مالگزاری کے صرف $\frac{1}{15}$ یا $\frac{1}{20}$ حصے کے متعلق معاملہ طے ہوا کرے گا۔ اور ایسے وسائل ان نئے طریقوں کی وجہ سے پیدا ہو جائیں گے۔ جن سے کمئی محاصل کی تلافی ہو جائے گی۔ مجموعی حیثیت سے اس صوبے کی خراب و خستہ حالت کا لحاظ کرتے ہوئے اس بات کی پوری توقع رکھنا درست معلوم ہوتا ہے کہ ان تدابیر کا نتیجہ سرکار مالگزاری میں کسی قسم کا خسارہ ہونے کی بجائے اس میں اضافہ ہی ہو گا اور محصول دہندگان ملک اور عوام الناس کو کثیر فائدہ پہنچے گا۔ ذرائع مالگزاری بھی موجودہ ذرائع کے مقابل دو چند بلکہ سہ چند ہو جائیں گے۔ اور اسی تناسب سے سہولت کے ساتھ اور کسی کو عسرت میں گرفتار کیے بغیر مطالبہ سرکار وصول ہو جائے گا۔"

ہم نے یہ طول طویل اقتباس اس لیے پیش کیا ہے اسی اشتہاد سے مدراس کے انتظام مالگزاری کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۵۵ء

کی مجوزہ پیمایش وبندوبست کے نتائج ہم بعد کے کسی باب میں بیان کریں گے

چھٹا باب

پنجاب میں بندوبست اراضی

سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے ۱۸۴۶ء میں پنجاب کا کچھ حصہ انگریزی عملداری میں شامل کرلیا تھا مگر سکھوں کی دوسری جنگ کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا باقی حصہ بھی اپنے زیر تسلط کر لیا۔ اس صوبے کی حالت سکھوں کے سابقہ عہد حکومت نیز انگریزوں کی حکمرانی میں کیا تھی اس کا صاف صاف بیان پنجاب کے نظم و نسق کی پہلی رپورٹ میں جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی تھی درج ہے۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں جس نے اس صوبے کو ایسا مستحکم اور قوی بنا دیا تھا کہ وہ ایک طاقتور سلطنت کے برابر ہو گیا تھا صرف وہی اشخاص جو جرأت اور اعلیٰ قابلیت کی بناء پر ممتاز و سربرآوردہ تھے اور عدالتی اور مالی اعلیٰ اختیارات کے ساتھ محصول مالگزاری کے لیے دور دور از مقامات پر بھیجے جاتے تھے انھیں لوگوں میں ایک جنرل اویٹیبل بھی تھا جس نے اپنے پنجۂ آہنی کے زور سے پشاور کو سرنگوں کر رکھا تھا۔ اور دوسرا سور ماہری سنگھ تھا جس نے ہزارہ نامی کوہی قبیلے کے سرکش و تند خو لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف مطیع و منقاد بنا رکھا تھا۔ لاہور کے قریب نیز اضلاع میں مالگزاری وصول کرنے پر "کاردار" یعنے کارپرداز مقرر تھے۔ اور ان کی اہم ترین کارروائیوں پر لاہور کی وزارت نگرانی کرتی تھی۔

یہاں کوئی قانون اب تک منضبط نہیں ہوا تھا اور عدل و انصاف بالکل ازادی اور سیدھے سادھے طریقے پر ہوتا تھا۔ خانگی ملکیت اراضی کاشتکاروں اور مالکان اراضی کے حقوق اضافی اور دیہی جماعتوں کی اجتماعی حیثیت غرض یہ سب کچھ تسلیم کی جاتی تھی مقامی حکام کے زیر ہدایت خانگی ثالثی سے اکثر کام لیا جاتا تھا۔ حقیقی اور شخصی جائداد کے مشکل ترین مسائل کا تصفیہ بھی یہی پنچایتیں کرتی تھیں ..... مہاراجہ بھی ہمیشہ اپنی قلمرو کا دورہ کرتا تھا۔ اس کی سواری جب باہر نکلتی تھی تو وہ سب کی فریاد سنتا تھا اور جس صوبے میں وہاں کے صوبہ دار کے متعلق بہت زیادہ شکایتیں پیش ہوتی تھیں تو اس پر عتاب کرتا تھا۔ اپنے دربار میں بھی وہ شخصی استغاثے کی سماعت کرتا تھا۔"

یہاں محصولات بہت سنگین تھے، لیکن بعض امور کے لحاظ سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ اگر ایک ہاتھ سے سرکار لیتی تھی تو دوسرے ہاتھ سے دیتی بھی تھی۔ سرکار کے دائرۂ ملازمت میں بے شمار لوگ داخل تھے۔ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے گاؤں گاؤں سے لوگ آتے تھے اور نوکری میں اپنی کمائی جو کچھ پس انداز کرسکتے تھے وہ اپنے اپنے گھروں کو بھیجدیتے تھے۔ متعدد مواضعات میں جن پر بہت سنگین محصول اراضی لگادیا جاتا تھا کم سے کم اس محصول کا نصف یہ لوگ اپنی فوجی آمدنی سے ادا کرتے تھے اور اس طرح زر برابر دست بدست پھرتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں محصول اراضی اصولاً خام پیداوار کا نصف تو تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ عملی طور پر درحقیقت اوہ "خام پیداوار کے دو خمس سے لیکر ایک ثلث تک ہوتا تھا۔" ان سب صوبوں میں جن کو سکھوں نے کلیتاً فتح کرلیا تھا اور جہاں کاشت بھی معقول ہوتی تھی محصول اراضی کا یہی تناسب قائم تھا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بہ استثناء اس صوبے کے جو دیوان ملراج کی زیر حکومت تھا دریائے سندھ کے اس کنارے پر تمام مقبوضات میں محصول کا یہی تناسب نافذ العمل تھا۔ البتہ دریائے سندھ کے اس پار مالگزاری کا یہ نظام لوگوں پر اس قدر باران وجوہ سے نہ تھا کہ یہ خطہ مستقر کی نگرانی سے بہت دور تھا اور وہاں کے لوگوں میں زیادہ صبر و برداشت کا مادہ نہ تھا نیز املاک

کی حالت وہاں غیر محفوظ تھی اور آبادی کم تھی"۔

محصول اراضی جیسا کچھ تھا نقد نہیں بلکہ بہ شکل جنس وصول کیا جاتا تھا۔ اور اس لیے اچھے اور برے دونوں ہنگام میں کھیتوں کی پیداوار کے ساتھ اس کا تناسب یکساں رہتا تھا۔ ایسے نظام کے تحت جب کسی سال ہنگام خراب ہو تو یہ لازم نہ تھا کہ کاشتکار ایک معینہ اور غیر متغیر رقم ہی ادا کریں۔ یا ان ایام میں جبکہ عام قیمتیں گری ہوئی ہوں وہی مالگزاری ادا کریں جو عام قیمتیں بڑی رہنے کے وقت معین کی گئی تھی۔

سنہ ۱۸۴۶ء کے دوسرے معاہدے کی رو سے جسکی تکمیل اسی سال دسمبر میں ہوئی پنجاب کے دیوانی اور فوجی معاملات ایک انگریز رزیڈنٹ کی زیر نگرانی کر دیے گئے اور "ہنری لارنس" وہاں کا پہلا رزیڈنٹ متقرر ہوا۔ ہندوستان کی اس عہد کی تاریخ 84 میں گو وہ زمانہ قابل منتظمین مملکت اور بہادر سپاہیوں کے لیے مشہور تھا کسی کا نام ایسا روشن نہیں جیسے "صلح کار" ہنری لارنس کا نام ہے۔ اس کی ولادت سنہ ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ اس نے سنہ ۱۸۲۵ء کی پہلی جنگ برما میں شرکت کی۔ پشاور میں سکھوں کے سرداروں پر اچھی نگرانی رکھی اور سنہ ۱۸۴۲ء میں افغانستان پر چڑھائی کرنے میں پولک کی کمک کی۔ اس نے جنگ سبراؤں میں حصہ لیا جس پر سنہ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کی پہلی جنگ ختم ہوئی تھی۔ اس وقت ہندوستان میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جس کو سکھوں کے حالات سے ہنری لارنس سے زیادہ واقفیت تھی۔ یا جس کا اثر سکھوں پر لارنس سے بڑھ کر تھا۔ کوئی ایسا بھی نہ تھا جس کو لارنس سے زیادہ سکھوں کی خوبیوں کا احترام ملحوظ یا سکھوں کی حیثیت وقار اور خود مختاری برقرار رکھنے کی سچی خواہش دل میں جگہ لیے ہوئی تھی۔ بہ حیثیت رزیڈنٹ کے ہنری لارنس عملی طور پر پنجاب کا حکمران تھا اس نے اپنی سب اصلاحی تجاویز نیابتی مجلس وزراء سے جو آٹھ سرداروں پر مشتمل تھی منظور کرائیں۔

ان اصلاحوں میں ایک اصلاح البتہ رعایا کے حق میں کلیتاً مفید نہیں تھی وہ یہ کہ قدیم نظام کے بجائے جس کے تحت محصول اراضی بہ شکل جنس وصول ہوتا تھا۔ انگریزوں کا جدید انتظام اس نے قائم کر دیا جس کے تحت مالگزاری نقدی کی شکل میں وصول ہونے لگی۔ مطالبۂ سرکار میں برائے نام تخفیف تو ہوگئی مگر سرسری بندوبست اور زر کی

شکل میں تعین محصول سے جیسا انگریزی سرکار کے عہدہ دار کرتے تھے کاشتکاروں کے کندھوں کا بوجھ ذرا بھی ہلکا نہ ہوا۔ البتہ اور باتوں میں لارنس زیادہ کامیاب رہا۔ سکھوں کے اداروں سے اس کا ربط ضبط قائم تھا۔ مختلف مواضعات سے پچاس چودھری منتخب کیے گیے۔ جنھوں نے سردار لہنا سنگھ کی نگرانی میں ایک سیدھا سادہ قانون منضبط کیا جو سکھوں کے رواج پر مبنی تھا۔ تشدد آمیز محصولات اور سرکاری اجارے سب مسدود کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ ہنری لارنس نے اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے لائق فائق کارکن عہدہ داروں کا انتخاب کیا۔ جن کو اس صوبے کے مختلف اقطاع میں نظم ونسق کا نگران کار بنایا گیا۔ سردار اور روسا، مالکان اراضی اور عوام الناس اس کے انتظام مملکت کی قدر جانتے تھے اور اس صلح کار اعظم کی حکمرانی کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

بدنصیبی سے جن دو شخصوں نے پنجاب میں امن قائم کیا انھوں نے تھوڑی 85
ہی مدت میں ہندوستان کو خیر باد کہا۔ ہنری لارنس کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی اس لیے اس نے ۱۸۴۷ء میں بہ مجبوری ہندوستان سے وطن کی طرف مراجعت کی۔ اور لارڈ ہارڈنگ نے ۱۸۴۸ء کی ابتدا میں لارڈ ڈلہوزی کو زمام حکومت تفویض کر دی۔ اس کے بعد ہی ہنگامہ و فساد شروع ہوے جن کی بڑھتے بڑھتے سکھوں کی دوسری جنگ تک نوبت پہنچ گئی۔ اس کی تفصیل کسی دوسرے باب میں بیان ہو چکی ہے۔

ہنری لارنس جس کو ممتاز خدمات کے صلے میں "سر" کا خطاب حال میں ملا تھا، اس ہنگامے کی خبر سنتے ہی بعجلت تمام ہندوستان واپس آیا۔ اور جنوری ۱۸۴۹ء میں میدان چلیان والا میں جو گھمسان کی لڑائی ہوی تھی اس میں لارڈ گوف کے دوش بدوش یہ بھی کھڑا ہو گیا۔ فروری میں دوسری جنگ گجرات میں ہوی جس کے بعد سکھوں کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور پھر پنجاب کا فیصلہ ہو گیا۔ ہنری لارنس نے انگریزوں کے پنجاب کو الحاق کر لینے کی مخالفت کی۔ مگر اس کے بھائی جان لارنس کے متعلق یہ مشہور رہے کہ وہ تو اس الحاق[۱] کا حامی تھا۔

۱ عام طور پر یہی خیال پھیلا ہوا ہے لیکن اس واقعے کے اٹھارہ سال بعد خود جان لارنس نے

غرض ۲۹ رمارچ ۱۸۴۹ء میں اعلان کر دیا گیا کہ پنجاب کی فرمان روائی اب ملکۂ انگلستان پر منتقل ہو چکی ہے۔

جیسے ہی سر ہنری لارنس نے یہ فیصلہ سنا اس نے اپنا استعفا دیدیا۔ یہ کچھ تو اس وجہ سے تھا کہ اس الحاق کے برملا خلاف انصاف ہونے کے متعلق اس نے اپنا خیال پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا اور زیادہ تر اس عقیدے کی بناء پر بھی کہ اب جو انتظامات ہونے والے تھے وہ مفتوح قوم کے حق میں موجب سختی ہوں گے۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی اس صلح کار کی قدر و قیمت سے خوب واقف تھا اس لیے اس نے سر ہنری کو جانے نہیں دیا۔ ڈلہوزی نے اپنے معتمدِ خاص کے ذریعہ سے اس کو کہلا بھیجا کہ وہ پنجاب میں اپنی موجودہ اعلےٰ خدمت ہی انجام دیتا رہے۔ "اور کچھ نہ سہی تو اس خاص غرض ہی سے سہی کہ اپنے مقصدِ عظیم کے حصول کا یعنے اس کا کہ مفتوحین کا نہ صرف از روئے انصاف لحاظ کیا جائے بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کے خواہشات کی پاسداری ہو۔ اس کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ وہی ایک شخص ہے جو اس وقت ان خوددار اور بہادر غنیم کے اس طرح اطاعت قبول کر لینے کے ناگزیر صدمے اور کوفت کو ان کے دلوں سے دور کر سکتا ہے اور دوسرا ایسا کوئی نہیں جو ان کے سرداروں اور رہنمایان قوم سے اس طرح بے تکلف خلا ملا رکھتا ہو یا ان کی شرافت نفس کا ایسا ہی قدر دان ہو جیسا سر ہنری تھا۔"

87 جب اس استدلال کے ساتھ یہ استدعا کی گئی تو پھر سر ہنری کو مان لینے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کے انتظام مملکت کے لیے ایک مجلس قائم کی جو تین (۳) اشخاص پر مشتمل تھی۔ سر ہنری لارنس اس کا میر مجلس تھا اور اس کا بھائی جان لارنس اور چارلس مینسل اور چند روز کے بعد چارلس مینسل کے بجائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ اس سے انکار کیا اور وزیر ہند سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ کو لکھا کہ "میں پوری صداقت کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ الحاق کی کسی وسیع العمل تجویز سے مجھکو کبھی کچھ تعلق نہیں رہا ہے۔ بجز ایک پنجاب کے الحاق کے اور وہاں بھی مجھکو صرف اس منصوبے کے سرانجام سے تعلق تھا۔ لیکن الحاق کی حکمت عملی سے مجھکو کچھ سروکار نہ تھا۔" مراسلہ مورخہ ۲۰ رجون ۱۸۶۷ء (سوانح عمری لارڈ لارنس مولفہ بوزورتھ اسمتھ (۱۸۸۵ء) جلد دوم ص ۳۰۵)

رابرٹ منٹگمری اس کے ارکان مقرر ہوئے۔ سر ہنری سیاسی امور انجام دیتا تھا۔ جان لارنس کی زیرِ نگرانی دیوانی اور مالگزاری کا نظم ونسق تھا اور منسیل اور اس کے جانشین منٹگمری کے زیرِ اہتمام عدالتی کاروبار تھا۔

یہ مجلس یکدل ویکجہت ہوکر کام نہ کرسکی۔ ہنری لارنس اپنی فیاض طبعی سے ہر وقت کوشاں تھا کہ انگریزوں کے اس نوحاصلہ صوبے میں ان سرداروں کا جواب اوبار میں گرفتار تھے پہلے کی طرح اعلیٰ رتبہ قائم رہے اور جیسے سابق میں ملک کے امرا میں ان کا شمار ہوتا تھا اب بھی ہو۔ جان لارنس نے اس بارے میں لارڈ ڈلہوزی کی طرح کسی قدر تنگ خیالی سے کام لیا اور اس کی رائے میں یہ سردار گزارے سے بڑھ کر کسی بات کے مستحق نہ تھے اور ان کو یا کسی کو رعایا اور پردیسی حکمرانوں کے درمیان مداخلت کا حق نہ تھا۔ ہنری لارنس کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ قوم کے ان ذی اثر فطری رہنماؤں کو تسلیم کرلیا جائے۔ برخلاف اس کے جان لارنس جس کے زیرِ تفویض انتظام مالگزاری تھا اس بات کا خواہاں تھا کہ جو کچھ محصولِ اراضی کاشتکار ادا کرتے ہیں اس پر خوب گرفت رکھی جائے اور ان قدیم سرداروں کو مان لینے میں اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ سرکار کا حق مالگزاری مارا جاتا ہے۔

یہ دو بھائی جو ایک دوسرے کا بہت کچھ ذاتی لحاظ کرتے تھے سرکاری معاملات میں ایک دوسرے سے بالکل کشیدہ ہوگئے جس سے سرکاری کام میں حرج ہونے لگا۔ جان لارنس نے گورنر جنرل کے معتمد خاص کو لکھا کہ "میں اور میرے بھائی ہم دونوں ملکر پہلے سے بہتر کام نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں کشیدگی اور بڑھ گئی ہے۔ شاذ ہی ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ شاذ ہم سرکاری معاملات پر کبھی گفتگو کرتے ہیں۔ ...... میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ اگر اس قماش کے دو آدمی ایک جگہ جمع ہوجائیں جو ارادے کے قوی بھی ہوں اور خیالات میں متضاد بھی اور جن کے عادات واطوار اور طریقِ کار میں بین تفاوت ہو تو پھر سب سے زیادہ خرابی اور بگاڑ کی بات ہوگی۔"

ایک ساتھ دونوں بھائیوں نے استعفا پیش کر دیا۔ اس پر لارڈ ڈلہوزی کے لیے ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ناگزیر ہو گیا۔ مگر اس نے انتخاب میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ مجلس نظم و نسق برخاست کر کے اس نے جان لارنس کو پنجاب کا چیف کمشنر بنا دیا اور سر ہنری لارنس کو تبادلے کے ساتھ راجپوتانے میں نائب سرکار کی کم ذمہ دارانہ اور کم حیثیت خدمت دیدی۔

لارڈ ڈلہوزی نے یہ فیصلہ کیا صادر کیا گویا پنجاب پر ایک بجلی گرا دی۔ "یہ خبر سن کر ہر ایک کی صورت غمزدہ سی ہو گئی۔ پیر و جوان۔ مالدار و مفلس۔ سر رشتۂ فوج اور دیوانی کے ملازم۔ اہل قلم و اہل سیف۔ انگریز اور دیسی لوگ غرض بلا استثناء ہر شخص یہی محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ایک دوست و بہی خواہ ہمیشہ کے لیے اس کو داغ مفارقت دے کر جا رہا ہے۔ قوی دل مرد (جن میں ہربرٹ ایڈورڈز بھی نظر آتا تھا) بچوں کی طرح ڈھاریں مار مار کر رو رہے تھے۔ جب وداع کا وقت آپہنچا اور جب ہنری لارنس نے اپنی بیوی اور بہن سمیت ۱۸۵۳ء
یکم ۲۰ جنوری کو لاہور اور پنجاب کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا تو دیسی سرداروں کی ایک لمبی قطار شہر سے باہر بہت دور تک اس کے جلو میں نظر آتی تھی۔ ان میں سے بعض پانچ بعض دس اور بعض بیس پچیس میل تک اس کے ہمرکاب گئے۔ یہ لوگ اپنے اپنے غریبانہ حوصلے کے موافق نہایت خلوص کے ساتھ رنج و غم۔ تشکر و تحسین کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ ان کو ہنری لارنس سے جس کا نیّر اقبال کم سے کم پنجاب میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا تھا۔ اب تو کچھ توقع نہ رہی تھی کہ ظاہرداری انکے لیے اس طرح کریں۔ یہ جلوس لاہور سے امرتسر تک لمبا تھا اور ایسا تھا کہ گویا کسی کا جنازہ نکلا ہے۔ رابرٹ نپیر جو اس زمانے میں لارڈ نپیر مگڈالہ کے خطاب سے ممتاز تھا سب سے آخر اس سے رخصت ہوا کیونکہ ہنری لارنس اس کو بھائی سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ نپیر دل شکستہ لاہور کی طرف چلنے کھڑا ہوا تو ہنری لارنس نے اپنی بہن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "بہن نپیر کو پیار کرو۔ یہ میرا بہترین اور عزیز ترین دوست ہے۔" ہنری لارنس جب امرتسر پہنچا تو چارلس سانڈرز نامی ڈپٹی کمشنر کے گھر پر سوگواروں کی ایک نئی جماعت کھڑی تھی اور یہاں پھر اظہار

رنج و ماتم کیا گیا امرتسر سے وہ راجپوتانے روانہ ہوگیا"۔

اس قصے میں ہم سر ہنری لارنس کا نام پھر سنیں گے۔ ۲۲ جولائی ۱۸۵۷ء میں جبکہ انگریزی سرکار کو شمالی ہند میں ایک بہت بڑی بغاوت کا دغدغہ لگا ہوا تھا اور کسی روز بھی لارڈ کیننگ کی وفات یا استعفا کی خبر آنے والی تھی جس سے ہندوستان میں کوئی رہنمائے حکومت باقی نہیں رہتا تھا۔ اس وقت خلوئے جائداد کے امکان کے خیال سے مجلس نظماء نے کسی کو گورنر جنرل کی خدمت پر پیش از پیش نامزد کرنا مناسب سمجھا تھا چنانچہ نظمائے نے اس خدمت کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس نے میدان جنگ میں آپ کو ایک بہادر سپاہی اور صلح کے زمانے میں ایک ہمدرد منتظم مملکت ثابت کر دکھایا تھا۔ بنابراں یہ تجویز منظور ہوئی کہ "وائیکونٹ کیننگ کی وفات یا استعفا یا مراجعت وطن پر اس کے جانشین کے انگلستان سے آنے تک سر ہنری منٹگمری لارنس کے۔ سی۔ بی گورنر جنرل ہند کے عہدہ پر مامور کیا جائے"۔ لیکن یہ اعزاز بعد از وقت تھا کیونکہ سر ہنری لارنس ۴ جولائی کو لکھنو میں مارا گیا۔ سر ہنری اس ایک مشہور انگریز کو چھوڑ کر جس کی قائم مقامی کے لیے اس کا انتخاب کیا گیا تھا ہندوستان بھر میں اس زمانے کے سب انگریزوں میں فیاض ترین منتظم مملکت تھا۔

اس شخصی دلچسپی سے قطع نظر کر کے جو ہنری لارنس کے سوانحۂ زندگی سے وابستہ ہے اس کی حکمت عملی عامہ بھی خود ویسی تھی جو ہندوستان کے منتظمین مملکت کے لیے ہمیشہ دلچسپی کا باعث ہوگی۔ وہ ایک خاص خیال کے منتظمین مملکت کا جن کے بانی گزشتہ پشت میں الفنسٹن اور منٹو تھے مگر جن کا نام و نشان آکلینڈ اور ڈلہوزی کی شہنشاہی پسندی کے زیر اثر اب مٹ رہا ہے اپنے وقت کا نمایندہ تھا۔ جنرل مکلاؤڈ انس کہتا ہے کہ "اس خاص خیال کے اشخاص دیسیوں کے احساسات روایات اور تخیلات کا خاص لحاظ کرنے اور دیسی ریاستوں کے حقوق کو واجبی طور پر تسلیم کر لینے کا مطالبہ کرتے تھے اور قوم کے فطری رہنماؤں کے ساتھ ہمیشہ عاقلانہ اور فیاضانہ برتاؤ کرنے کی صلاح دیتے تھے"۔

لارڈ ڈلہوزی تو خاص اس خیال کے لوگوں کو نہ کبھی سمجھ ہی سکا اور نہ اس نے

ان کی قدر ہی کی۔ بس وہ شہنشاہی پسند تھا اور آخر تک وہی رہا۔ اس کی رائے میں ہندوستانیوں کے لیے بہترین نظم ونسق پردیسی حکمرانوں کا بلاتوسط کسے براہ راست انتظام مملکت کرنا ہی تھا۔ یہ درمیانی روسا وسرداراور رہنمائے قوم سب انتظام مملکت میں حائل اور اصلاح کے سنگ راہ تھے۔ بیشک اس نے بھی وہی غلطی کی جو ہندوستان میں متعدد بار انگریز حکمرانوں نے کی تھی وہ یہ کہ قدیم اداروں اور سن رسیدہ وتجربہ کار رہنمایان قوم کو نظرانداز کردیا۔ اور ان کے بجائے اس نے انگریز عہدہ داروں کی شخصی حکومت بلاواسطہ قائم کرنے کی کوشش کی، سر ہنری لارنس کو پنجاب سے کیا نکالا کہ اس کی حکمت عملی کی بیخ کنی کر دی۔ قوم کے فطری رہنماؤں کا صفایا کر دیا اور جب صرف کاشتکاروں کی قوم باقی رہ گئی تو اس کو بھی براہ راست حکومت کے تحت کرلیا۔ اس بات کو پچاس سال گزر گئے ہیں مگر اس مدت میں یہ حکمت عملی تجربے سے نہ تو عاقلانہ ثابت ہوئی اور نہ اس سے نظم ونسق ہی کچھ اچھا چل سکا ہے۔

قومی ادارے قومی ضرورتوں کا نتیجہ اور گویا ان کی زبان اظہار ہیں۔ ہندوستانیوں نے دیہی جماعتوں کو ترقی دی تھی۔ اور کہیں پالیگاروں زمینداروں جاگیرداروں، اور کہیں تعلقداروں سرداروں اور پنچایتوں کے تحت رہنا اس لیے قبول کرلیا تھا کہ ان کی رعایا کو ضرورت تھی۔ دراصل ہندوستانیوں کی معاشرتی تنظیم ان کی معاشرتی ضرورتوں پر مبنی تھی۔ اور لوگ اپنے فطری رہنماؤں کے زیرسایہ اور دیہی جماعتوں کے حلقۂ اثر میں زیادہ خوش تھے۔ اور یہی سمجھتے تھے کہ اس طرح رہنے میں ان کے حقوق زیادہ محفوظ ہیں۔ پھر ایسے انتظامات میں رخنہ ڈالنا کسی حکمران کے لیے بھی عقلمندی کی بات نہ تھی۔ بالخصوص ہر دیسی حکمرانوں کے لیے تو رعایا کے منتظمہ اداروں کو نظرانداز کر دینا سراسر ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھا۔

اس طرح قومی احتیاج تو پیدا کر دی گئی مگر اس کی تکمیل کی اب تک کوئی صورت نہیں پیدا کی گئی قدیم دیہی جماعتوں کی جگہ کوئی مناسب طور پر حکومت خود مختاری رکھنے والے ادارے قائم نہیں کیے گئے۔ ان حالات میں قوم کے

فطری رہنما مدراس بمبئی اور پنجاب میں اپنی قومی خواہشات اور قومی خیالات کی معقول طور پر کیا خاک ترجمانی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان صوبوں کی حکومتیں بمقابل حکومت بنگالہ کے جہاں لارڈ کارنوالس کی مہربانی سے شیرازۂ معاشرت پریشان ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، رائے عامہ سے کم متاثر ہیں اور کم استفادہ کرتی ہیں مثلاً دیہی جماعتوں اور درمیانی بیر برآوردہ اشخاص اور سرداروں کی غیر موجودگی میں بمبئی اور مدراس دونوں جگہ تشخیص لگان میں سختی اور زیادتی سے کام لیا گیا تھا۔ پنجاب میں جہاں نصف صدی سے پہلے قوم کے رہنماؤں کو ناعاقبت اندیشی سے نظر انداز کر دیا گیا تھا کاشتکاران اراضی جن کو یونہی مالکان اراضی کا بھی لقب دیدیا گیا تھا کچھ ایسے خوش حال نظر نہیں آتے تھے اور اب وہ وقت آپہنچا تھا کہ حکومت ان لوگوں کو ایک خاص طبقے کے رہنماؤں سے یعنے سٹہ کھیلنے والوں صرافوں اور ساہوکاروں سے جن سے بدتر اشرافیہ کسی ملک میں ہو نہیں سکتی بچانے کی کوشش کرلے۔

یہ ایک سیدھی اور سچی بات ہے کہ جیسا ایشیا میں ویسا یورپ میں اقوام کے تحفظ حقوق اور فلاح وبہبود کے لیے کسی نہ کسی طرح کی نمایندگی قوم اور کسی نہ کسی قسم کی حکومت خود اختیاری کا ہونا ضروری ہے۔ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کے جو اشکال موجود تھے ان سے انگریز واقف نہ تھی لیکن ان سے سب قومی اغراض پورے ضرور ہوتے تھے۔ البتہ ان میں ترقی و اصلاح بھی ضروری تھی پھر بھی کیا اچھا ہوتا کہ انھیں کا نشو ونما کیا جاتا مگر اس کے بجائے سرے سے ان کو میٹ دینے سے قومی زندگی کا صفحہ ہی سادہ رہ گیا۔ کبھی نازک وقت آپڑتا ہے تو ان اداروں کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر اس وقت انگریزی راج کی کمک کے لیے کوئی نہیں رہتا اور خود شہنشاہیت پسندی کی قومی بنیاد متزلزل ہوجاتی ہے۔ جنرل مکلاوڈ انیس اپنی کتاب میں جس سے ایک اقتباس اس کے پہلے پیش ہوچکا ہے بیان کرتا ہے کہ غدر کے تاریک زمانے میں ستلج کے اس کنارے پر بود باش رکھنے والے سکھوں اور ملتان کے مسلمانوں کی طرح سرحدی مسلمانوں نے بھی اپنے سرداروں کی خاص ہدایت ورہنمائی میں

انگریزوں کی نہایت قابل قدر امداد کی تھی اور ان لوگوں نے اپنی طرف سے طاقتور فوجیں بھی بھیجی تھیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے سکھوں کا کوئی سردار نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے دہلی کی فتح تک تو کوئی مدد نہیں کی۔ ہندوستان کے منتظمین مملکت اس احتیاج کو یعنے پردیسیوں کے نظم ونسق کو ہر دلعزیز بنانے اور لوگوں پر حکومت کا رفیق کار بننے کے لیے اچھا اثر ڈالنے کی ضرورت محض جنگ کے زمانے ہی ایں نہیں بلکہ صلح وامن کے زمانے میں بھی محسوس کرتے ہیں۔

بہرحال جان لارنس لارڈ ڈلہوزی کی حکمت عملی پر کاربند رہا۔ اس نے نکلسن کو لکھا مالگزاری مقداریں مقرر کیجیے جس سے قابض زمین کے لیے ایک واجبی اور معقول گنجائش رہ جائے تاکہ وہ کاشت میں اضافہ کر سکے اور اس طرح سرکاری محاصل ہنگام کی خرابی اور دست برد سے متاثر نہ ہونے پائے۔ درمیانی اشخاص سے ہر وقت کنارہ کشی کیجیے۔ یہ لوگ ہر جگہ ملک کے لیے وبال و آفت جان ہیں۔"

لیکن مالگزاری کبھی کم مقداریں نہیں لی گئی۔ اور جیسا ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہوا یہاں بھی ہوا یعنے انگریزوں کا قبضہ ہونے کے ساتھ ہی مالگزاری میں اضافہ کر دیا گیا چنانچہ ۱۸۴۷ء اور ۱۸۴۹ء کے درمیان پنجاب کی مالگزاری جو ۸۲۰۰۰۰ پونڈ تھی اس صوبے کو انگریزوں کے الحاق کرنے کے تین سال کے اندر اندر بڑھ کر وہ ۱۰۶۰۰۰۰ پونڈ ہو گئی۔ عام قیمتیں گھٹ جانے سے بھی کاشتکاروں کی مصیبت میں اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ ان کو اب یہ رقم نقدی کی شکل میں ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کے متعلق ۱۸۵۱ء میں زراعت پیشہ لوگوں نے عام طور پر شکایتیں شروع کیں اور واویلا مچایا۔ "عام طور پر زراعت پیشہ طبقے کا مطالبہ یہی تھا کہ اجناس کی شکل میں مالگزاری ادا کرانے کے طریقے کو دوبارہ رائج کیا جائے۔ اور ہر ہنگام میں فصل کی تقسیم کی جائے یا اس کا تخمینہ قیمت کر لیا جائے۔ مجلس نے اس مطالبہ کی مزاحمت کی لیکن اس بات کی ہدایت کر دی کہ جہاں مناسب معلوم ہو عند الضرورت مالگزاری وصول کرنا ملتوی کر دیا جائے۔"

پنجاب کے مختلف مقامات کے متعلق ذیل کے اعداد پیش کیے جاتے ہیں۔

جن کو نظم ونسق کی پہلی رپورٹ سے اخذ کیا گیا ہے :

۱۔ پنجاب کے نظم ونسق کی پہلی رپورٹ جس سے ہم نے پچھلے صفحات میں متعدد اقتباسات پیش کیے ہیں سر رچرڈ ٹمپل کے سے کامل فن اور مشاق شخص کی لکھی ہوئی ہے ٹمپل ہندوستان میں قلم کا دھنی مشہور تھا۔ جان لارنس اگرچہ نہایت جفاکش دسکار گزار اور بہت بڑا منتظم شخص تھا لیکن اس کے طرز تحریر میں کچھ آب وتاب نہ تھی اور وہ خود اس خامی کو محسوس کرتا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں جب لارنس پہلی دفعہ شملے میں رچرڈ ٹمپل سے ملا اور اس کی لکھی ہوئی بندوبست کی رپورٹیں پڑھیں تو اس کو وہ بہت پسند آئیں۔ لارنس نے اپنے احباب سے تذکرہ کیا کہ "ہم اپنا معتمد بنانے کے لیے جس شخص کی تلاش میں تھے وہ شخص تو خود یہاں موجود ہے۔ وہ میرے منشاء کو خوب سمجھتا ہے اور اس کو بہترین شکل میں پیش کر سکتا ہے!" اس پر فوراً پنجاب کے نظم ونسق کی رپورٹ لکھنے پر ٹمپل مامور کیا گیا۔ اس رپورٹ کے کچھ حصے کا مسودہ ہنری لارنس اور جان لارنس نے لکھا تھا لیکن نو مامور معتمد نے اس رپورٹ کو از سر نو مرتب کیا۔ یہ رپورٹ ہندوستان کی اور رپورٹوں کے مقابل مایقرا اور دلچسپ ہونے کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ ۱۸۵۸ء میں جب ٹمپل انگلستان سے ہندوستان واپس آیا تو اس وقت جان لارنس پنجاب کا چیف کمشنر تھا۔ لارنس نے ٹمپل سے کہا کہ "مجھکو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کو آپ کے موزوں خدمت مل گئی ہے۔ مجھ کو آپ سے رائے لینے میں خوشی ہوتی ہے اور میں آپ کی تحریری قابلیت سے بھی بہت خوش ہوں لیکن ہمیشہ یہ ملحوظ رہے کہ جو کچھ حکمتِ عملی یا رائے ضبط تحریر میں آئے گی وہ میری اپنی حکمت عملی اور رائے ہوگی نہ کہ آپ کی۔ آپ کا بھی زمانہ آئے گا لیکن یہ میرا زمانہ ہے۔ اور ہر بات کا وقت مقرر ہوتا ہے۔" (سوانح عمری لارڈ لارنس مولفہ (بوزورتھ اسمتھ)

پرگنہ	ضلع	رقم مالگزاری ۱۸۵۰ء - ۱۸۵۱ء	رقم مالگزاری ۱۸۵۱ء - ۱۸۵۲ء
لاہور	لاہور	۳۸۰۶۰	۴۰۶۱۴
	امرت سر	۸۶۸۷۲	۱۰۲۴۷۳
	دیناگر	۸۹۹۲۷	۹۴۰۴۱
	وزیرآباد	۱۰۸۳۳۸	۱۱۴۰۱۸
	شیخ پورہ	۳۱۹۱۶	۳۸۳۲۲
جہیلم	گجرات	۵۹۳۸۲	۵۹۸۵۹
	جہیلم	۶۹۵۴۸	۷۲۰۹۱
	راولپنڈی	۸۲۴۸۱	۸۲۰۵۶
	شاہپور	۴۱۲۳۱	۳۴۳۸۱
لیئیا	لیئیا	۴۸۴۴۴	۵۴۲۵۷
	خون گڑھ	۴۹۵۳۴	۴۸۴۶۳
	ڈیرۂ غازی خاں	۴۵۵۷۴	۴۷۲۸۰
	ڈیرۂ اسمٰعیل خاں	۴۸۹۶۸	۵۰۶۵۶
ملتان	ملتان	۵۶۴۳۰	۶۰۳۵۹
	جھنگ	۲۷۸۷۸	۳۴۹۶۲
	پاک پٹن	۲۵۷۵۷	۳۸۳۱۲
	پشاور	۸۹۳۰۷	۷۱۹۲۹
	حزرہ	۱۸۸۵۴	۱۶۸۱۵
	میزان	۱۰۱۸۵۰۲	۱۰۶۰۹۸۹

انتظام مالگزاری میں جان لارنس کا اصل اصول یہ تھا کہ "اراضی پر مالگزاری کم مقدار میں لیجائے" اور اس نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ خام پیداوار کے ایک ثلث کا مطالبہ اور وہ بھی زر کی شکل میں کسانوں کے حق میں ظلم تھا۔ اسکے چند ہی سال میں پنجاب کے حکام مجازہ نے اس غلطی کی اصلاح کردی، چنانچہ پنجاب کے محصول اراضی میں تخفیف کردی گئی اور وہ پہلے خام پیداوار کا ایک ربع مقرر کیا گیا تھا بعد کو چھٹا حصہ کردیا گیا۔ اس تدبیر کی دانائی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آگے چلکر وہاں کاشت میں اضافہ ہوا محاصل میں بیشی اور حقیقی جمع بھی توفیر ہوئی ۱۸۵۶ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک اور ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۸۵۸ء تک کے اعداد ذیل سے بمقابل ان اعداد کے جو اوپر درج ہیں محاصل کی بیشی اور جمع کی اطمینان بخش حالت ظاہر ہوتی ہے:

سنہ عیسوی	مطالبہ	جمع
۱۸۵۶ - ۱۸۵۷	۱۴۸۵۰۰۰ پونڈ	۱۴۳۵۲۰۰۰ پونڈ
۱۸۵۷ - ۱۸۵۸	۱۴۶۵۰۰۰	۱۴۳۵۲۰۰۰

پنجاب کے الحاق کے بعد ہی بندوبست اراضی باضابطہ طور پر شروع کردیا گیا تھا مگر وہ ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہی برخاست کردیگئی۔ لاہور اور امرتسر کے اضلاع میں ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۲ء کے درمیان جو بندوبست اختتام کو پہنچا تھا اسکی رو سے پیداوار کا چھٹا حصہ حق سرکار معین ہوا تھا اور قواعد مابعد کی رو سے جو ۱۸۷۱ء کے قانون مالگزاری کے حسب منشا منضبط کیے گئے تھے مطالبہ مالگزاری معمولی غیر دخیل کار اسامیوں کے حقیقی لگان کا (جو سالہائے اوسط میں ان کو ملتا تھا) نصف کردیا گیا تھا۔

یہانتک تو ہم نے یکے بعد دیگرے شمالی ہند، بمبئی، مدراس اور پنجاب کے حالات بیان کردئے ہیں اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم ونسق مالگزاری کے آخری نتائج پر ایک عام نظر ڈالنی مقصود ہو تو ۱۸۵۸ء میں "انڈیا ہوز" (دفتر وزیر ہند) سے جو کیفیت بانداز یافت پیش ہوئی ہے اسکو پڑھیے کیونکہ اس سے بہتر مواد کہیں ہاتھ نہیں ملسکتا۔ اس کیفیت پر جان اسٹوارٹ مل کے دستخط ہیں جو اس وقت محکمہ وزیر ہند میں تنقیح مراسلات کی خدمت انجام دیرہا تھا اگرچہ یہ کیفیت اسکے عملے کی تیار کی ہوئی ہے لیکن اس میں عبارت کی فلسفیانہ طرز مواد کی صحت اور ترتیب اسی کے قلم کی معلوم ہوتی ہے۔ ذیل میں اسکے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:-

ہندوستان کے نظام اراضی پر
جان اسٹوارٹ مل کے خیالات

بنگالہ ۔ "بنگالے کے صوبہ جات جنوبی میں سالانہ ایک دوامی مقررہ محصول ادا کرنے پر زمیندار اپنی اراضی پر قبضہ رکھنے کے مجاز ہیں اور ۱۷۹۳ء کے قانون اوّل کی رو سے اگر یہ محصول ادا نہ ہو تو ان کی جاگیریں نیلام کر دی جاسکتی ہیں۔ سرکار کے زیر قبضہ جو کچھ بھی زمین ہے وہ انھیں جاگیروں کی ہے جن کو سرکار نے نیلام میں خرید لیا تھا۔ یہاں کے محصولِ اراضی کی شرح معلوم نہیں مگر یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ محصول اوسطاً لگان کا نصف ہوتا ہے۔"

شمالی ہند "اوّل ملک کے تمام آباد خطوں کو محال میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن کی حد بندی بھی کر دی گئی ہے۔ ہر محال پر بہ حیثیت مجموعی بیس[۲] یا تیس[۳] سال کی میعاد کے لئے محصول اراضی لگا دیا جاتا ہے جس میں اراضی کی کل خالص پیداوار کے علاوہ ایک واجبی اندازے سے منافع میں معقول بچت کی گنجائش چھوڑ دی جاتی ہے اور مالگزاری کی اس رقم کے بر وقت ادا ہونے تک تمام اراضی سرکار میں ایک صورت سے مکفول سمجھی جاتی ہے۔

"دوم۔ منافع کی اس بچت کے مستحق کون ہیں کون نہیں اس کی کامل تحقیق کر لی جاتی ہے مستحقین کا یوں تعین کر لینے کے بعد ان کے اس حق کو قابلِ انتقال اور قابل توریث قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس طرح کے حقداروں کو مالکانِ اراضی سمجھا جاتا ہے اور سرکار نے محال پر جو کچھ سالانہ محصول لگا دیا ہے وہ بھی انھیں سے وصول کیا جاتا ہے۔

"سوم۔ محال کے مالکانِ اراضی مجموعاً اور منفرداً اپنی ذات اور املاک سے سرکار کی مقررہ مالگزاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ جب ایک سے زیادہ محال کے مالک ہوں تو کس قاعدے کے تحت ان میں تقسیم منافع اور تلافی نقصان ہو اس کا

تعین کرلیا جاتا ہے۔ اگر مالکان اراضی بے شمار ہوں تو ان میں سے چند سربرآوردہ اشخاص کے ساتھ قرارداد رقم کرلیا جاتا ہے اور یہ اشخاص اپنی جانب سے اور باقی لوگوں کے نمایندوں کی حیثیت سے محال کا کل انتظام اور مقررہ محصول ادا کرنے کی تمام ذمہ داری اپنے اوپر قبول کرلیتے ہیں۔

"پہلے پہل اراضی کا دارامدار محال کی خالص پیداوار کے دو ثلث تک محدود تھا لیکن پہلے بندوبست کی تیس سالہ میعاد کے ختم پر اس شرح پر نظر ثانی کے بعد مطالبہ سرکار اوسط خالص اثاثے کے نصف حصے تک محدود کردینے کا تہیہ کرلیا گیا۔"

مدراس "مدراس میں مالگزاری کے جو نظام نافذ العمل ہیں" وہ زمینداری "موضع مشترکہ کرایہ پر دینا" "رعیت واری" اور "یولنگو" کہلاتے ہیں۔"

"زمینداری حقیت اراضی زیادہ تر شمالی سرکار میں پھیلی ہوئی ہے اگرچہ دوسرے اضلاع مثلاً مدیورا۔ نلور۔ شمالی ارکاٹ وغیرہ میں بھی زمینداروں کی بڑی بڑی جاگیریں موجود ہیں۔"

"موضع کرایہ پر دینے کے نظام میں موضع والوں کی حیثیت بعینہ زمینداروں کی ہے اور یہ لوگ سرکار سے موضع پر مشترکہ قبضہ حاصل کرتے ہیں۔ کل موضع یا تو تمام جماعت کو یا اس کے کچھ حصے کو ایک مدت مقررہ کے لیے کرایہ پر دیدیا جاتا ہے اور یہ لوگ براہ راست سرکار کو مالگزاری ادا کرتے ہیں۔ بلا مداخلت غیرے اپنے معاملات کا آپ سرانجام کرتے ہیں اور کاشت کے لئے آپس ہی میں اراضی تقسیم کرلیتے ہیں۔"

"رعیت واری نظام میں ہر قابض زمین جس کا نام دیہی کھاتے میں درج ہوتا ہے۔ زمین کا مالک تسلیم کرلیا جاتا ہے اور وہ سرکار کو براہ راست مالگزاری ادا کرتا ہے اور اس بات کا مجاز ہے کہ چاہے وہ اپنی ملکیت پر شکمیداری قائم کرے چاہے وہ اپنا حق ملکیت۔ عطیہ۔ فروخت اور کفالت کی شکل میں کسی اور پر منتقل کردے جب تک وہ مالگزاری کی مقررہ رقم سرکار کو ادا کرتا رہے

اس وقت تک اراضی مقبوضہ سے اس کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور ہر سال اس کو اس بات کا اختیار رہتا ہے کہ اپنی مقبوضہ اراضی کو وہ کم کردے یا اس میں اضافہ کرلے یا اس سے بالکل ہی دست بردار ہو جائے ۔ خرابی ہنگام پر اگر پوری پیداوار یا اس کے کچھ حصے کا نقصان ہو جائے تو اس پر مالگزاری معاف کردی جاتی ہے ۔ تشخیص مالگزاری نقدی میں کی جاتی ہے اور سال بسال رقم میں کمی و بیشی نہیں کیجاتی الاّ ان حالات کے جہاں پانی سرکاری ذرائع آبپاشی سے خشکی کی اراضی کو تری کی اراضی بنائے یا زمین کو دوفصلہ کرنے کے لئے لیا جاتا ہو جس پر پن کی مزید رقم سرکار کو ادا کرنی ہوتی ہے ۔ رعیت بمصارفِ خود کوئی اصلاح کرے تو اس کے لحاظ سے رقم مالگزاری میں اضافہ نہیں کیا جاتا ۔ اس نظام کے تحت ایک سیدھے سادھے مکمل استحقاق کی بنا پر رعیت ہی مالک اراضی متصور ہوتی ہے اور دوامی پٹے کی ذمہ داریوں کے بغیر دوامی پٹے کے تمام فائدے اس کو حاصل ہوتے ہیں یعنے ہر شخص جب چاہے وہ اپنی اراضی سے دست بردار ہو سکتا ہے ۔ مگر جب تک اپنے ذمے کی رقم وہ ادا کرتا رہے زمین سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا ۔ موسمی مشکلات و حوادث درپیش ہوں تو تقاوی لے سکتا ہے مگر اپنے ہمسایوں کی واجب الادا رقوم کا وہ ذمہ دار نہیں ...... رعیت واری نظام میں سالانہ تشخیص مالگزاری کے متعلق اکثر غلط فہمی ہوتی ہے اور اس باب میں یہ توضیح کردینی مناسب ہے کہ سالانہ تشخیص مالگزاری اس لئے ضروری ہے کہ سال بہ سال رقبۂ کاشت بڑھانے اور گھٹانے کا حق رعیت کو حاصل ہے ۔ اور اس تشخیص رقم کا یہ مقصد نہیں کہ از سر نو محصول اراضی لگایا جائے ۔ بلکہ یہ ہے کہ اس کے زیر قبضہ زمین پر سابقہ مجموعی رقم مالگزاری کا کتنا حصہ اب واجب الادا نکلتا ہے وہ مقرر کردیا جائے ۔ ایسی حالت میں جبکہ رعیت کی مقبوضہ اراضی میں کمی و بیشی نہیں ہوتی پٹے کی تجدید نہیں کی جاتی اور نہ سالانہ بندوبست سے ان کو کچھ سروکار ہوتا ہے اور نہ بندوبست کے وقت ان کے حاضر رہنے کی ضرورت ہے ۔

"اراضی کرایہ پر دینے کا نظام جو ٹیلنگو کہلاتا ہے وہ تنجور اور ترناولی میں

پایا جاتا ہے مگر وہاں بھی یہ عام نہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مطالبۂ سرکار غلّے کے رائج الوقت نرخ پر منحصر ہوتا ہے۔ اس نظام کی ترویج کے وقت ہر موضع پر لگان اجناس کی شکل میں معیّن کردیا گیا تھا اور محصول کی شرح کا ایک معیار بھی مقرر کردیا گیا تھا جس کے موافق غلّے کے مطالبے کو زر کی شکل میں بدل دیا جاتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی قرارداد ہوئی تھی کہ اگر کسی سال بازار کا بھاؤ مبادلۂ زر کے مقررہ معیار نرخ سے ۱۰ فیصدی زیادہ ہوجائے یا ۵ فیصدی گرجائے تو بجائے رعیت کے سرکار ہی یہ نفع یا نقصان اٹھائے گی۔ اس نظام میں خوبی یہ تھی کہ عام قیمتوں کی بیشی کے فائدے میں سرکار بھی رعیت کی شریک ہوجاتی ہے اور عام قیمتوں کی کمی کے نقصان سے رعیت بالکل محفوظ رہتی ہے مگر اس نظام میں یہ نقص تھا کہ سال بھر بازار کا روزمرہ بھاؤ صحیح صحیح معلوم ہونا ضروری تھا جو بہت ہی مشکل ہے"

بمبئی　"صوبہ بمبئی کا انتظام مالگزاری عام اصطلاح میں رعیت واری کہا جاسکتا ہے اور اس منشا میں کہ عام طور پر سرکاری اراضی[1] پر جو اشخاص قابض موقت ہیں وہ کسی درمیانی شخص کے توسط کے بغیر سرکاری عہدہ داروں ہی سے براہ راست اپنی مالگزاری یا لگان کا تعین کرلیتے ہیں۔ مگر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس صوبے میں ویسی بھی مثالیں اکثر ملیں گی جہاں تمام موضع کی مالگزاری کا تعین سربرآوردہ قابضان اراضی ہی سے جن کے مختلف نام ہوتے تھے انفرادی یا مشترکہ طور پر کرلیا جاتا تھا"

"اس صوبے کے اس سرے سے اس سرے تک محصول اراضی پر اب نظر ثانی کی جارہی ہے جس سے ہر کھیت پر اس کے درجے کے موافق واجب الادا رقم مقرر کردی جاتی ہے اور اس رقم کی مقدار میں تیس (۳۰) سالہ میعاد تک کوئی کمی و بیشی نہیں کی جاتی

---

[1] ۔ ایسی اراضی کو "سرکاری اراضی" کہنا کچھ حسب حال نہیں ہے۔ بلاشک وشبہہ مدراس کی طرح بمبئی میں بھی قابضان اراضی ہی اراضی کے مالک تھے اور سرکار صرف محصول اراضی کی جو کھیتوں کی خالص پیداوار کا ایک حصہ ہوتا تھا مستحق تھی۔

پنجاب :- "پنجاب میں اراضی کا مالک مطلق اور کاشت کرنے والا عموماً ایک ہی شخص ہوتا ہے گو بعض دفعہ اپنے چند کھیتوں کو وہ اسامیوں ہی کو کیوں نہ دیتا ہو اس پر لگان کا مطلق بار نہیں ہوتا البتہ کاشت کے مصارف اور سرکاری مطالبے کی گنجائش اس کو پیدا کرنی پڑتی ہے۔ باقی پیداوار چاہے وہ اپنے خاندان کی ضرورتوں پر صرف کرے چاہے وہ جمع کرتا رہے۔ اس طبقے کے لوگ اپنی شخصیت کو ممیز رکھنے کے باوجود دیہی جماعتوں میں مل جاتے ہیں۔ موضع کی آبادی کے یہ معنی نہیں کہ وہاں رعیت فلاں تعداد میں بستی تو ہے مگر ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ وہاں ایک ہی اجداد کی نسل رہتی ہے گویا یہ ایک بڑی برادری ہے جس کا چودھری ایک ہی شخص ہوتا ہے اور جس کو مشترکہ کاروبار اور باہمی امداد کی ایک مدت سے عادت پڑی ہوی ہے"

"انگریزی سرکار نے پہلے ہی سے یہ تصفیہ کر دیا تھا کہ زر کی شکل میں یہ محصول وصول کیا جائے اور ایک مدت تک اس کی مقدار معین رہے۔ "مالک اراضی کسان" سرکار سے ایک مدت معینہ کے لئے مالگزاری چکا لیتے ہیں اور اس طرح کے تشخیص لگان چکانے کو اصطلاح میں بندوبست کہتے ہیں۔ مالکان اراضی فرداً فرداً سرکار سے کوئی قرارداد نہیں کرتے بلکہ موضع واری قرارداد کرتے ہیں۔ پھر یہ برادری اپنے چودھری یا نمایندے کے توسط سے فلاں رقم فلاں مدت تک سرکار کو دیتے رہنے کا ذمہ لیتی ہے۔ اس کے بعد لوگ اس رقم کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور ہر شخص کا حصہ مقرر کر دیتے ہیں۔ اگرچہ بہ ظاہر ہر شخص اپنے ہی لئے کاشت کرتا اور صرف اپنی طرف سے رقم دیتا ہے مگر آخر العمل وہ اپنے حصہ داروں کا در حقیقت اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح اس کے حصہ دار اس کے ذمہ دار ہیں اور دونوں کی ذمہ داری مشترکہ ہے۔ اس لیے پنجاب کا نظام نہ تو رعیت داری ہے اور نہ زمینداری بلکہ موضع واری نظام کہلاتا ہے۔ گو ہی اقطاع میں اور بعض دفعہ اور جگہ بھی زمینداری نظام اور ملتان کی نواح میں رعیت واری نظام سے ملتا جلتا ایک اور نظام پایا جاتا ہے لیکن موضع واری نظام ہی عام طور پر اور بالخصوص اہم ترین مقامات میں پھیلا ہوا ہے"

خلاصہ ۔ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ چند لفظوں میں کیا جاتا ہے ۔ بنگالے میں اراضی ایسے مالکوں کے زیر قبضہ تھی جو سرکار کو ایک معینہ اور غیر تغیر پذیر محصول اراضی ادا کرتے تھے ۔ شمالی ہند میں زمین عام طور پر ایسے مالکوں کے قبضے میں تھی جو محصول اراضی ادا تو کرتے تھے مگر ہر جدید بندوبست کے وقت اس رقم پر نظر ثانی کی جاتی تھی ۔ مدراس اور بمبئی میں مالکانِ اراضی کسان ہی تھے جو سرکار کو مالگزاری ادا کرتے تھے اور یہاں ہر جدید بندوبست پر محصول کی رقم پر بھی نظر ثانی ہوتی تھی ۔ پنجاب میں بھی مالکانِ اراضی کسان ہی تھے مگر یہ لوگ دیہی جماعتوں کے ارکان ہوتے تھے اور ہر موضع سے اجتماعی طور پر لگان ادا ہوتا تھا جس پر ہر تجدید بندوبست کے ساتھ ہی نظر ثانی کی جاتی تھی ۔

ان مختلف انتظامات کے تحت کم سے کم اصول کی حد تک تو محصول اراضی کی شرح بتدریج یکساں بن گئی تھی چنانچہ بنگالے میں محصول اراضی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں لگان کا نصف تھا ۔ شمالی ہند میں ۱۸۵۵ء کے "قواعد سہارنپور" کی رو سے وہ لگان کا نصف ہی معین کیا گیا تھا مدراس اور بمبئی میں سر چارلس ووڈ نے ۱۸۶۴ء میں محصول اراضی معاشی لگان کا آدھا مقرر کر دیا تھا اور پنجاب میں سرکاری مطالبے میں یوں تخفیف کر دی گئی تھی کہ اسامی غیر دخیل کار معمولی طور پر جو لگان ادا کرتے تھے اس کا نصف مالگزاری مقرر کر دی گئی تھی ۔

یہ ہے ہندوستان کے محصول اراضی کا اصل اصول یعنے جہاں محصول اراضی دوامًا معین نہیں ہے وہاں حقیقی یا معاشی لگان کے نصف حصے کا بطور مالگزاری مطالبہ کیا جا سکتا ہے ۔

لیکن کبھی اس اصول پر عمل نہیں کیا گیا جیسا آئندہ باب میں بتایا جائے گا ۔ شمالی ہند اور صوبجات متوسط میں جہاں مالگزاری عمومًا مالکان اراضی سے وصول کی جاتی ہے حقیقی لگان کے نصف حصے سے بہت زیادہ سرکار وصول کر لیتی ہے ۔ بمبئی اور مدراس میں جہاں مالگزاری عمومًا کاشتکاروں ہی سے

براہ راست وصول کی جاتی ہے سرکار کُل معاشی لگان خود لے لیتی ہے اور کاشتکاروں کے لئے ان کی محنت کی اجرت سے زیادہ نہیں چھوڑتی ۔

ساتواں باب

خام پیداوار اور مصنوعات

جب ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کی تجدید ہوئی تو یہ شرط لگا دی گئی کہ آج کی تاریخ سے کمپنی "تمام تجارتی کاروبار موقوف کر دے اور ایسے کاروبار سے آئندہ کے لئے احتراز کرے" نیز زمانۂ مستقبل میں اس کی حیثیت ہندوستان کے محض منتظم مملکت اور حکمراں کی سی رہے۔ اس شرط کو عائد ہوئے بہت زمانہ نہ گزرا تھا کہ اس کے مفید نتائج ظاہر ہونے لگے۔ کمپنی خود جب حریف تجارت نہ رہی تو ہندوستان کے مصنوعات اور پیشوں میں بڑی دلچسپی لینے لگی چنانچہ ۱۱ فروری ۱۸۴۰ء میں پارلیمنٹ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ وہ تمام حاسدانہ اور کینہ آمیز محصولات اب مسدود کر دیئے جائیں جن سے ہندوستان کے اہل حرفہ کی دل شکنی اور صنعت و حرفت کی کساد بازاری ہو رہی تھی۔

اس عرضی پر رپورٹ پیش کرنے کے لئے دارالعوام نے اپنی ایک مجلس تنقیح مقرر کی۔ لارڈ سیمور اس مجلس کا صدر نشین تھا اور ایک رکن اس کا گلیڈسٹن بھی تھا جو اس وقت تیس برس کا جوان اور ایسا خالص قدامت پسند واقع ہوا تھا کہ اپنے سیاسی عقیدے کے خلاف وہ کسی کی بھی نہیں سنتا تھا ایک اور شخص براکلہرسٹ نامی جو میکلس فیلڈ کا رکن پارلیمنٹ تھا برطانوی صناعوں کی جانب سے اس مجلس کا رکن مقرر ہوا تھا کیونکہ اس زمانے میں میکلس فیلڈ ریشم کی صنعت کا بہت بڑا مرکز

تھا۔ اثنائے تحقیقات میں ہندوستان کی پیداوار اور مصنوعات پر بہت کچھ قابل قدر شہادت قلمبند کی گئی اور چھ سو صفحے کی کتاب کی شکل میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ مگر ہماری اس کتاب کی مختصر گنجائش کی بناء پر اس شہادت کے وہی حصے یہاں بیان کیے جا سکتے ہیں جو اس کتاب کے موضوع سے خاص طور پر متعلق ہیں۔

جے۔ سی۔ ملول

فوجی مصارف اور مطالبات وطن۔ ملول نے کہا تھا کہ ہندوستان کی شاہی فوج کے مصارف جن کو کمپنی ادا کرتی تھی ۰۰۰۰۰۰۴۱ پونڈ تھے اور کمپنی نے یہ بھی قبول کر لیا تھا کہ ہندوستان میں ۰۰۰۰۲ کی فوج ہمیشہ قائم رکھنے کے جو مزید اخراجات ہوں گے وہ بھی ادا کر دئے جائینگے۔ ہندوستان کے محاصل سے سالانہ جو اوسط رقم انگلستان میں خرچ ہوتی تھی وہ ۰۰۰۰۰۰۳۲ پونڈ تھی اور اس میں کمپنی کے حصہ داروں کا منقسوم سرکاری قرضے کا سود۔ ملازمین سرکار کے ایام رخصت کی تنخواہ۔ وظائف پیرانہ سالی وغیرہ۔ مجلس نظم اور مجلس نظار کے مصارف اور ان دونوں کے عملے کا خرچ بھی شامل تھا۔

افیون۔ افیون انگریزی عملداری کے علاوہ بنارس۔ پٹنہ اور مالوے کی دیسی ریاستوں میں بھی بنتی تھی۔ بنارس اور پٹنے کی افیون کا اجارہ کمپنی کو حاصل تھا اور حکومت بنگالہ کو اس اجارے سے بڑی آمدنی تھی کیونکہ ۰۰۲ فی صدی سے زیادہ منافع پر یہ افیون بکتی تھی۔ مالوے کی افیون بیرون ملک برآمد کرنے کے لئے جب انگریزی عملداری میں بھیجی جاتی تھی تو اس کے ہر صندوق پر ۲½ پونڈ محصول راہداری ادا کیا جاتا تھا اور اس محصول سے حکومت بمبئی کو معتدبہ آمدنی ہوتی تھی۔ چین میں ان دونوں قسم کی افیون کو ملا کر کینٹن کی منڈی میں فروخت کیا جاتا تھا۔

نمک۔ کمپنی کی عملداری میں جو نمک بنتا تھا اس سے اور دیسی ریاستوں سے جو نمک انگریزی عملداری میں آتا تھا اس پر سنگین محصول ہونے سے سرکار کو

بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ کمپنی کو افیون کی طرح نمک کا اجارہ بھی حاصل تھا۔

شکر۔ ۱۸۳۶ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے ہندوستان کی شکر پر جزائر غرب الہند کی شکر کے برابر محصول یعنی ہر ہنڈرڈ ویٹ (چھپن سیر) پر ۲۴ شلنگ محصول ادا کرنے پر اس کو انگلستان لانے کی اجازت تھی قانونی اصول یہ تھا کہ اگر اس مقام میں جہاں سے یہ شکر آتی تھی اس کی درآمد ممنوع قرار دی گئی تھی تو اس صورت میں یہ شکر انگلستان لائی جا سکتی تھی گورنر جنرل ہند نے بنگالہ میں اس کی درآمد ممنوع قرار دی تھی اس لئے بنگالے کی شکر فی ہنڈرڈ ویٹ (چھپن سیر) ۲۴ شلنگ محصول ادا کرنے پر انگلستان لائی جا سکتی تھی اس کی مقدار ۱۸۳۶ء میں جو ۱۰۱۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ تھی وہ بڑھ کر ۱۸۳۹ء میں ۵۱۹۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ ہو گئی تھی۔ گورنر جنرل ہند نے ۱۸۳۹ء میں ایک قانون منظور کیا تھا جس کی رو سے مدراس میں شکر کی درآمد ممنوع قرار دی گئی تھی۔ اس کے بعد مدراس کو بھی بنگالہ کی طرح مراعات ملنے والے تھے مگر کچھ دنوں اور بمبئی کو ان مراعات کے حاصل ہونے کی توقع نہ تھی۔

رم شراب۔ انگلستان میں ہندوستانی رم شراب کی درآمد پر ۱۵ شلنگ فی گیلن محصول تھا درانحالیکہ جزائر غرب الہند کی رم پر جو اس سے زیادہ تیز تھی صرف ۹ شلنگ فی گیلن محصول تھا۔

تمباکو۔ انگلستان میں ہندوستانی تمباکو کی درآمد پر فی پونڈ وزن فی ۳ شلنگ محصول تھا درانحالیکہ جزائر غرب الہند کے تمباکو پر فی پونڈ وزن فی ۱ ۲ شلنگ ۹ پنس محصول تھا۔ ہندوستان کے لئے یہ تفاوت محصول موجب سختی تھا اس لیے یہ باور کیا جاتا تھا کہ اگر یہ محصول دونوں جگہ کے تمباکو پر مساوی المقدار کر دیا جائے تو اس سے ہندوستانی تمباکو کے استعمال میں بہت کچھ افزونی ہو جائے گی۔

قہوہ۔ ۱۸۳۵ء میں ہندوستانی قہوے پر بھی محصول یعنی فی پونڈ (وزن فی) پر ۶ پونڈ لگا دیا گیا جو جزائر غرب الہند کے قہوے پر تھا جس کا نتیجہ ہوا کہ انگلستان میں ہندوستانی قہوے کے صرف میں بہت بیشی ہو گئی۔

سوتی۔ ریشمی۔ اور اونی پارچے۔ برطانیہ کے ساختہ سوتی اور ریشمی مال پر جو برطانوی جہازوں پر لد کر ہندوستان آتا تھا ½۳ فی صدی اور اونی پارچوں پر صرف ۲ فی صدی محصول تھا حالانکہ ہندوستان کے سوتی مال پر جو انگلستان میں درآمد ہوتا تھا ۱۰ فی صدی اور ریشمی پارچوں پر ۲۰ فی صدی اور اونی مال پر ۳۰ فی صدی محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔

جتنی جتنی ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی درآمد انگلستان میں کم ہوتی گئی حتیٰ کہ وہ رہی ہی نہیں اتنا اتنا خام روئی کی درآمد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس پنج سالہ میعاد میں جو ۱۸۱۳ء میں ختم ہوئی تھی انگلستان میں ہندوستانی خام روئی کی سالانہ درآمد اوسطاً ۹۳۶۸۰۰ پونڈ (وزنی) تھی مگر اس پنج سالہ مدت میں جو ۱۸۳۰ء میں ختم ہوئی تھی سالانہ اوسط درآمد ۴۳۲۹۶۶۰ پونڈ (وزنی) ہو گئی تھی۔

رلول سے جب یہ سوال کیا گیا کہ "کیا دیسی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات نے لے لی ہے؟" تو اس نے جواب دیا تھا کہ "ہاں! بہت زیادہ۔"

"کتنی مدت سے؟"

"میرے خیال میں زیادہ تر ۱۸۱۴ء سے"

"کیا ہندوستانی مصنوعات کے بجائے برطانوی مصنوعات نے ہندوستان میں ایسا گھر کر لیا ہے کہ اب ہندوستان ان چیزوں کے لئے برطانوی صنعت ہی کا محتاج ہے؟"

"میرا تو خیال یہی ہے"

"دیسی صناعوں کی روزی چلی جانے سے کیا اس نقصان عظیم کی تلافی خام پیداوار کی بیشی سے جو مایحتاج زندگی میں سب سے اوّل ہے کچھ ہوئی ہے؟"

"جب سے ہندوستانی پارچوں کی برآمد موقوف ہو گئی ہے اس وقت سے ہندوستان سے خام روئی کی برآمد میں بیشی ہوتی رہی ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ

کہہ سکتا کہ یہ کس قدر ہوئی"۔
"کیا ہندوستانیوں کو مثلاً جولاہوں کو ان کا روزگار چلے جانے کے بعد دوسرے مشاغل سے روزی کمانے کی وہی سہولت حاصل ہے جو اس ملک کے باشندوں کو ہے یا خاص خاص پیشے خاص خاص قوموں ہی سے مخصوص ہیں ؟
"میری دانست میں تو خاص خاص پیشے خاص خاص قوموں ہی سے مخصوص ہیں اس میں تو کچھ شک نہیں کہ برطانوی صنعت گروں کی مداخلت ہی سب سے پہلے ہندوستان کے صناعوں پر مصیبت لانے کا باعث ہوئی"۔

چائے۔ ۱۸۲۷ء ہی میں مجلس نظماء کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چائے کا پودا صرف ہندوستان میں ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی کاشت کو ترقی دینے کی کوشش ہی نہیں کی گئی ۱۸۳۴ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے مجلس کی اطلاع میں یہ بات لائی تھی کہ چائے کا پودا آسام میں بھی ہوتا ہے اور ہندوستان کے دیگر مقامات میں بھی اس کا نشو و نما ممکن ہے اس پر مجلس نے تجربتاً چائے کی کاشت کرنے کے لیے ایک عملے کی منظوری دی تھی حال میں آسام کی چائے کے بیجانوے صندوق جن کا مجموعی وزن تقریباً ۲۰۰۰ سیر تھا لندن پہنچے تھے اور یہ چائے بہت اچھی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے لیے کئی لوگوں نے ملکر اپنی ایک کمپنی قائم کی تھی۔ اور مجلس نظماء سے چائے کی کاشت کی اجازت حاصل کرنے کے لئے درخواست دی تھی جس کو مجلس نظماء نے کارروائی کے لئے حکومت ہند کے پاس بھیجدیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۴۰ء سے آسام میں خانگی سرمائے سے چائے کی کاشت شروع کر دی گئی۔

اینڈریو سیم

اس شخص کو کمپنی نے ہندوستان میں تقریباً ۶۰۰۰ ایکر اراضی عطا کی تھی۔ اس لئے اس نے زیادہ تر گنے کی کاشت اور شکر سازی کے متعلق شہادت دی ہے۔ کاشتکار اپنے کھیتوں کے گنوں کا رس نکال کر ابالتے اور اس سے گڑ بنا کر کارخانوں کو بیچ دیتے تھے۔ وہاں مشینوں سے اس کی اس طرح شکر

بنائی جاتی تھی کہ گڑ کو ابال کر اس کا شیرہ بنالیا جاتا تھا جس کے بعد اس کا پانی اتنا خشک کر دیا جاتا تھا کہ صرف شکر رہ جاتی تھی۔

برطانوی مصنوعات مثلاً ملبوسات۔ اوزار و آلات۔ کانچ کا سامان اور پیتلی ظروف وغیرہ کے رواج سے ہندوستانی اہل حرفہ کی روزی چلی گئی تھی اس کے متعلق اس گواہ نے بہت کچھ بیان کیا تھا۔ ہندوستان کے لوگ جب اپنے پیشوں سے محروم ہو گئے تو وہ "زیادہ تر زراعت" کے کاموں میں روزی کمانے لگے۔

سی۔ ای۔ ٹریولین

ایک اور اہم گواہ سر چارلس ٹریولین تھا جس نے لارڈ ولیم بنٹنک کے تحت ہندوستان میں ممتاز خدمات انجام دیے تھے اور اس کے بعد انگلستان میں خزانۂ عامرہ کا مددگار معتمد بن گیا تھا[۱]۔

جس زمانے میں ٹریولین ہندوستان میں تھا اس نے جس طرح ان تمام محصولات راہداری کے مسدود کرنے میں مدد دی تھی جو لوگوں کے لئے موجب زحمت اور اندرونی تجارت کے سنگ راہ تھے اسی طرح مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں انگلستان میں مال کی درآمد پر ان غیر مساوی اور امتناعی محصولات کے اٹھا دینے کی پُر زور تائید کی جن کی بناء پر ہندوستان کے مصنوعات انگلستان نہیں لائے جاتے تھے۔

برٹش انڈیا کی آبادی۔ عام طور پر بنگالے کی آبادی کا ۳ کروڑ تخمینہ کیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں شمالی ہند کی آبادی کا بھی ۳ کروڑ اندازہ

---

[۱] اس کے بعد ۱۸۵۹ء عیسوی میں وہ مدراس کے گورنر کی حیثیت سے ہندوستان آیا لیکن جدید محصولات پر اعتراض کرنے کی بنا پر ۱۸۶۰ء میں اس کو واپس طلب کر لیا گیا۔ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۵ء عیسوی تک وہ لارڈ ایلگن اور لارڈ لارنس کے تحت ہندوستان کا وزیر مال رہا۔ اس کی شادی مکالے کی بہن سے ہوئی تھی اور اسی کے لڑکے نے لارڈ مکالے کی سوانح عمری لکھی ہے۔

تھا۔ مدراس کی آبادی کا تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ اور بمبئی کی آبادی کا تیس لاکھ
تھا۔ اس حساب سے برطانوی ہند کی جملہ آبادی سات کروڑ ستر لاکھ ہوتی تھی۔
محنت کی معمولی روزانہ اجرت دو آنے یا تین پنس تھی۔ بنگالے میں مالکان اراضی
کاشت کے لئے اپنی زمینیں کسانوں کو دیتے تھے جو مالکان اراضی کے اسامی کہے
جاتے تھے۔ "ہندوستان کی زراعت کا اصل اصول یہ ہے کہ جب تک قابض زمین
اپنے مقامی رواج کے موافق لگان ادا کرتا رہے اس وقت تک اس کو قبضے سے
بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ہمیشہ اس قاعدے کی خلاف ورزی ہوتی رہی
ہے" ہندوستان میں یورپی اشخاص کے قبضے میں اراضی نہ دینے کے متعلق جو
امتناعی احکام تھے وہ سب منسوخ کر دیے گئے اور توقع کی جاتی تھی کہ یورپی اشخاص
اراضی خریدنے کے بعد ہندوستان میں بود و باش اختیار کرنے لگیں گے "لیکن
اس میں ناامیدی ہوئی۔ ہندوستان کی آب و ہوا کچھ ان کے موافق نہیں ہے
اور وہیں مدت العمر گزارنا ان کا مطمح نظر بھی نہیں"

شکر اور رم شراب — اگر رم شراب پر محصول مساوی نہ کر دیا جائے
تو پھر صرف شکر پر محصول کا مساوی کر دینا بے سود تھا۔ ایک ہی چیز کی حد تک مساوات
ملحوظ رکھنا بڑی مضحکہ خیز بات تھی کیونکہ مساوات قائم کرنے کی غرض سے ہونا
تو یہ چاہئے کہ شکر سے جتنی چیزیں بنتی ہیں ان سب پر محصول مساوی کر دیا
جائے"۔

رم شراب پر غیر مساوی محصول ہونے سے نہ صرف شکر اور رم بنانے والوں
کا نقصان ہوتا تھا بلکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ بدگمانیاں پیدا ہوتا تھا کہ
ان کے اغراض کو دوسرے ممالک کے اغراض پر جو ہندوستان سے زیادہ
مورد الطاف ہیں قربان کر دیا جاتا ہے۔

مسٹر گلیڈسٹن۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ دیسیوں میں بے اطمینانی پھیلی
ہوئی ہے تو اس سے کیا یہ مطلب نکالنا درست ہے کہ یہ بے اطمینانی کاشتکاروں
کے طبقے یا عام آبادی میں پھیلی ہوئی نہیں ہے بلکہ صرف ان لوگوں میں جن کو تاجروں
کے طبقے سے تعلق ہے۔

مسٹر ٹریویلین ۔ میرا اشارہ بالخصوص انہیں لوگوں سے ہے جن کا تاجروں کے طبقے سے تعلق ہے اور تعلیم یافتہ بنگالیوں سے بھی جنہیں ہندوستان اور انگلستان کے باہمی تعلقات کا کچھ نہ کچھ حال معلوم ہے اور انہیں لوگوں کو دراصل اس کی شکایت بھی ہے یوں تو دیسیوں کو اور باتوں کی شکایت بھی ہے مگر یہ مزید علیہ ہے۔ اس قسم کی شکایتیں باخبر لوگوں ہی سے عوام الناس میں پھیلتی ہیں مگر باخبر لوگوں کی طرح عوام الناس ان کے اصل وجوہ سے واقف نہیں ہوتے۔

دوسرے امور کے متعلق اس گواہ نے بیان کیا کہ بنگالے کی شکر جس کے لیے گنگا کی وادی میں گنے بوئے جاتے تھے اندرون ملک ہی زیادہ تر صرف ہوتی تھی مثلاً بنگالے کی ۳ کروڑ آبادی شمالی ہند کی ۳ کروڑ اور اس کے سوا دوسرے مقامات کی ۴ کروڑ آبادی سب یہی شکر استعمال کرتی تھی ۔ اس گواہ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وسط ایشیا کی منڈیوں میں اس زمانے تک بنگالہ کی شکر ہی کی کلیتاً مانگ تھی جب تک کہ چقندر سے بنائی ہوئی روسی شکر وہاں نہیں آئی تھی۔

سوتی مال تجارت ۔ "ہندوستان کے سوتی مصنوعات کی جگہ انگریزی مصنوعات نے غصب کر لی تھی ۔ ریشم کی طرح نرم خاص قسم کی روئی جو پہلے بنگالے میں ہوتی تھی اور جس سے ڈھاکے کی مشہور مہین ململیں بنتی تھیں وہ اب کہیں نظر نہیں آتی۔ شہر ڈھاکہ کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے گھٹ کر اب تیس[۳] یا چالیس ہزار رہ گئی ہے اور اس پر بھی ایک طرف ملیریا بخار کے زہریلے اثرات سے اور دوسری طرف شہر میں جنگل پھیل جانے سے روز بروز ویرانی بڑھ رہی ہے ۔ ہندوستان میں صرف موٹے سوتی کپڑے ہی جو تجارتی مقابلے کی تاب لا سکتے ہیں رائج ہیں ورنہ انگریزی سوتی کپڑے تو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک انتہائی مفلس و نادار لوگوں کے سوا سبھی کے زیر تصرف ہیں .... ڈھاکہ جو کسی زمانے میں ہندوستان کا مینچسٹر اور نہایت خوش حال شہر تھا اب نہایت ہی محدود و مختصر رہ گیا ہے کیونکہ درحقیقت اس شہر کو بہت کچھ مصیبتیں اٹھانی پڑی تھیں"۔

چائے ۔ آسام میں پہلے پہل سرکار نے تجربتاً چائے کی کاشت کی تھی مگر اس کے بعد نئی آسام کمپنی نے اس کاشت کو شروع کر دیا ۔ مقامی مزدوروں کا قحط تھا اس

لئے کمپنی دور کے مقامات سے پہاڑی مزدوروں کو بات ٹھہرا کر چائے کے باغات میں کام کرنے کے لئے آسام لاتی تھی۔ اس گواہ کی دانست میں اس قسم کے اقرار نامے سہ سالہ میعاد کے لئے کیے جاتے تھے لیکن اس کو اس بارے میں صحیح صحیح علم نہ تھا۔

نیل۔ پہاڑی مزدور ہر سال بنگالے کے نخلستان نیل کے پاس نیل سازی کا کام کرنے جاتے تھے جیسے "آئرلینڈ کے باشندے فصل کا کام کرنے کے لئے اس ملک (برطانیہ) میں آتے ہیں۔" یہ مزدور اہل و عیال اپنے ساتھ نہیں لاتے تھے بلکہ نیل کے ہنگام کے ختم پر گھروں کو واپس ہو جاتے تھے۔

بھاپ سے چلنے والے دریائی جہاز۔ بھاپ سے چلنے والے جہاز کشتیاں وغیرہ سب ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کے زیر انتظام و قبضہ تھے بہت چھوٹے چھوٹے بھاپ سے چلنے والے جہاز جو دو فٹ سے زیادہ گہرا پانی نہیں کھینچتے تھے کام میں لائے جاتے تھے۔ دریائے ہوگلی میں جہازوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاپ کے ذریعہ سے کھینچ لیجانے کے لئے ایک شراکت (اسٹیم ٹاگ کمپنی) بھی تھی جو خوب مقسوم پیدا کرتی تھی۔

سڑکیں۔ شاہراہوں کے سوا دوسری سڑکوں کی شاذ ہی مرمت ہوتی تھی۔ لیکن بارش کے موسم کے سوا بیل کی گاڑیوں کے لئے جو خاص مضبوط بنائی جاتی تھیں۔ یہ سڑکیں شاذ ہی ناقابل گزر ہوتی تھیں۔

خام پیداوار۔ مسٹر ٹریولین نے یہ سفارش کی تھی کہ انگلستان کی منڈیوں میں ہندوستان کی خام پیداوار پر کسی قسم کا غیر مساوی محصول نہیں ہونا چاہئے "ہم نے اُن (ہندوستانیوں کے) مصنوعات کو بالکل میٹ دیا ہے۔ اور اب ان کے پاس ان کے ملک کی خام پیداوار کے سوا رہا ہی کیا ہے جس پر ان کے گزر اوقات کا انحصار ہے اس لئے میرے خیال میں یہ انتہائی ناانصافی ہوگی اگر ہم اپنے ملک کی منڈیوں میں ان کی خام پیداوار کو مساوی مراعات دینے سے دریغ کریں۔"

ہنری گوجر

ہنری گوجر ایک تاجر تھا جس نے کئی سال اپنی زندگی کے ہندوستان میں کاٹے تھے اور کلکتے کے نواح میں اس کے کئی کارخانے بھی تھے جس میں سوتی دھاگا بٹتا تھا۔ رم شراب اترتی تھی۔ قسم قسم کے بیجوں سے روغن کشید ہوتا تھا۔ دھات کا سامان ڈھلتا اور کاغذ بنتا تھا۔ اس لئے اس کی شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

سوتی دھاگا۔ سالانہ ...... ۷ پونڈ وزن کا دھاگا کاتا جاتا تھا جو ۲۰ نمبر سے لے کر ۵۰ نمبر تک باریک ہوتا تھا۔ ہندوستان کا سوت ہی احتیاط سے چن بیننے کے بعد اس کام میں لایا جاتا تھا اور یورپی اشخاص کی نگرانی میں ہندوستانی مزدور مشینوں پر کام کرتے تھے۔ یہاں (تکلو) کر گئے تھے جو بھاپ سے چلتے تھے لیکن دھاگا بنانے ہی میں بھاپ کی تمام قوت صرف کرنے کی غرض سے کیونکہ دھاگے میں منافع زیادہ ملتا تھا ان کارگاہوں سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ کم نمبر کے موٹے موٹے دھاگے انگریزی دھاگے سے زیادہ اور بڑے نمبر کے باریک دھاگے کے برابر بکتے تھے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کاروبار میں منافع اس کی کثیر لاگت کے تناسب نہ تھا۔ اس گواہ نے کہا تھا کہ "میں تو نہیں سمجھتا کہ یہاں سوت کاتنے کا کوئی اور کارخانہ کبھی قائم ہوگا کیونکہ خود موجودہ کارخانے کی تعمیر میں اس قدر مصارف ہوئے ہیں کہ اب کسی کی ہمت نہیں بڑھتی"۔

کوئیلا۔ یہ گواہ اپنی بردوان کی کان کا کوئیلا استعمال کرتا تھا۔ کلکتے میں کوئیلا ۱۶ شلنگ فی ٹن کے حساب سے بکتا تھا۔ مگر یہ انگریزی کوئیلے کے برابر اچھا نہ تھا۔ پھر بھی سستا ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں عام طور پر بھاپ سے چلنے والے جہازوں میں صرف ہوتا تھا۔ کلکتے میں بردوان کے کوئیلے کی لاگت فی ٹن ۱۲ یا ۱۳ شلنگ تھی اور نیوکاسل کے کوئیلے کی قیمت فی ٹن ۲۵ شلنگ تھی۔

شکر۔ گنے کی کاشت کرنے والے گنوں کا رس ابالکر گڑ بناتے تھے اور شکر بنانے کے لئے کارخانوں کو بیچ دیتے تھے۔ بنارس کی باریک شکر ۱۱ یا ۱۲ روپئے (۲۴) شلنگ کو ۸۰ پونڈ (وزنی) بکتی تھی۔ محصولات کی شرح یکساں

کرنے سے پہلے اس کی قیمت کم تھی۔ انگلستان کو جو شکر جاتی تھی وہ جہاز پر ایک اٹل بوجہ منصوبہ ہوتی تھی اور فی ٹن ساڑھے دس پونڈ کرایہ اس پر دینا پڑتا تھا۔

رَم شراب جزائر غرب الہند کی رَم شراب جب انگلستان میں درآمد ہوتی تھی تو اس پر فی گیلن ۹ شلنگ محصول لیا جاتا تھا حالانکہ ہندوستان کی رَم پر فی گیلن ۱۵ شلنگ محصول تھا۔ ہندوستان میں رَم شراب گڑ سے بھی بنتی تھی اور گڑ کے فضلے سے بھی۔ ۸۰ پونڈ (وزنی) گڑ کے فضلے سے $3\frac{1}{2}$ گیلن رَم لندن کے معیار کے برابر تیز بنائی جاسکتی تھی مگر گڑ سے اس سے بھی زیادہ مقدار میں شراب کشید کی جاسکتی تھی۔ کلکتے میں ایک گیلن رَم دس آنے (ایک شلنگ تین پنس) کو ملتی تھی۔

دراصل زیادہ منافع تو اس میں تھا کہ گڑ سے شکر بنانے کے بعد فضلہ جو رہ جاتا تھا اس سے رَم شراب کشید کی جاتی مگر اس طرح عموماً نہیں کیا جاتا تھا۔

ریشم۔ انگلستان میں بنگالے کا خام ریشم فی پونڈ (وزنی) تقریباً ۱۹ شلنگ قیمت پر بکتا تھا۔ ہندوستان کے ساختہ کورے ریشمینے فی پونڈ (وزنی) ۱۶ یا ۱۷ شلنگ قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ ہندوستان سے خام ریشم کی برآمد انحطاط پر تھی۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۹ء تک ۲۰۰۰۰۹۲ پونڈ اس کی جملہ قیمت ہوئی تھی لیکن ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۲ء تک صرف ۴۰۰۰۰۵ پونڈ کی برآمد شاید اس لئے ہوئی تھی کہ ریشمی پارچے ہندوستان ہی میں زیادہ بننے لگے تھے اور غالباً ہندوستان سے ریشمی پارچوں کی برآمد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

جی۔ جی۔ دا ایچ لارپنٹ

اس کے بعد "ایسٹ انڈیا اور چینیا اسوسی اے شن" (انجمن چین و ہند) کے صدر نشین مسمی لارپنٹ کی شہادت لی گئی۔ یہ انجمن ۱۸۳۶ء میں ان لوگوں کی امداد کی غرض سے قائم ہوئی تھی۔ جن کی تجارت ہندوستان اور چین سے تھی مختلف ممالک سے انگلستان میں شکر اور رَم شراب کی جو درآمد تھی اس پر لارپنٹ نے

ایک طول طویل شہادت دی اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوستان کے سوتی اور ریشمی مصنوعات کے انحطاط پر پرزور الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سوتی مال تجارت۔ مسٹر لارپنٹ نے مجلس کے سامنے انگلستان میں ہندوستانی مال کی درآمد اور ہندوستان میں انگریزی سوتی مال کی برآمد کے متعلق ذیل کے اعداد پیش کیے تھے:

سوتی مال تجارت جو ہندوستان سے برطانیہ عظمیٰ میں درآمد ہوتا تھا۔

سنہ عیسوی	
۱۸۱۴	۱۲۶۶۶۰۸ تھان
۱۸۲۱	۵۳۴۴۹۵ ″
۱۸۲۸	۴۲۲۵۰۴ ″
۱۸۳۵	۳۰۶۰۸۶ ″

برطانوی سوتی مصنوعات جنکی ہندوستان میں برآمد تھی

سنہ عیسوی	
۱۸۱۴	۸۱۸۲۰۸ گز
۱۸۲۱	۱۹۱۳۸۷۲۶ ″
۱۸۲۸	۴۲۸۲۲۰۷۷ ″
۱۸۳۵	۵۱۷۷۷۲۷۷ ″

مصنوعات ہند کی اس کمی اور برطانوی مصنوعات کی اس بیشی کے باوجود برطانوی سوتی مال $3\frac{1}{2}$ فی صدی محصول بحساب قیمت ادا کرنے پر ہندوستان میں درآمد کیا جاسکتا تھا درآنحالیکہ ہندوستان کا سوتی مال انگلستان میں درآمد ہونے پر ۱۰ فی صدی محصول بحساب قیمت وصول کیا جاتا تھا مسٹر شور کے بیان کا اعادہ کرتے ہوئے اس گواہ نے ذیل کی عبارت پڑھ کر سنادی "برطانوی مصنوعات

کا دیسی مصنوعات کی جگہ رائج کر دینا برطانیہ کی ہوشیاری اور فیروزی کی ایک شاندار مثال کے طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے مگر در اصل انگریزی جبریت کی مثال اس کو کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح برطانیہ کی علانیہ پاسداری میں سب سے زیادہ زحمت دہ جنگی اور دیگر محصولات کا نظام قائم کر کے ہندوستان کو مفلس و نادار بنا دیا گیا تھا۔" مسٹر لارپنٹ اس باب میں بالکلیہ مسٹر شور کا ہم خیال تو نہ تھا لیکن کمپنی کے ایک ممتاز عہدہ دار کے جذبات اس سے ظاہر ہوتے ہیں اور ممکن تھا کہ یہی احساس ہندوستان کے لوگوں کے بھی ہوں۔

ریشمی مال تجارت۔ برطانوی ریشمین کپڑے وغیرہ ۳½ فی صدی محصول دینے پر کلکتے میں لائے جا سکتے تھے اور ہندوستانی ریشمی پارچے ۲۰ فی صدی محصول درآمد ادا کرنے پر انگلستان میں لائے جا سکتے تھے۔ کورے ریشمی پارچے انگلستان میں زیادہ تر چھاپنے (ٹھپا اٹھانے) کی غرض سے بھیجے جاتے تھے اور اس کے بعد دوسرے ممالک کو بھیجدیے جاتے تھے۔ انگلستان میں کوری ریشمین چیزیں جو انگلستان بھیجی جاتی تھیں ان کے متعلق ذیل کے اعداد پیش کئے گئے تھے۔

سنہ عیسوی	انگلستان کے تصرف کے لئے	غیر ممالک کو برآمد کرنے کے لئے
	تھان	تھان
۱۸۳۸	۱۶۰۰۰	۳۱۰۰۰۰
۱۸۳۹	۳۸۰۰۰	۳۵۲۰۰۰

ہندوستانی چھاپے کے جیبی باندھنو وہ مال کثیر تعداد میں انگلستان میں آمد کیے جاتے تھے۔ ریشمی مال پر انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ یکساں محصول کر دینے کے متعلق مسٹر لارپنٹ نے زور دار بحث کی تھی مگر برطانوی صناعوں کے نمایندے اور مجلس منتخبہ کے ایک رکن مسمی براکلہرسٹ کی خواہش یہی تھی کہ محصول

یکساں نہ کر دیا جائے کیونکہ انگلستان کے لیئے یہی مفید مطلب تھا۔

مسٹر براکلہرسٹ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی پیداوار پر اس کا کیا اثر ہوگا اس کا خیال کیئے بغیر آپ رائے دے رہے ہیں۔

مسٹر لارپنٹ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک حد تک اس ملک کے ریشمی مصنوعات کے ساتھ برابری کا مقابلہ رہے گا مگر اصولاً مجھ کو یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہمارے متعدد مقبوضات میں ہندوستان کا بھی شمار ہے یا نہیں؟۔ پہلے بھی یہ استدلال پیش کیا گیا تھا کہ جب ہمارے مصنوعات ہندوستان میں ایک خفیف سا محصول ادا کرنے پر آسکتے ہیں تو ہمیں بھی یہ چاہیئے کہ ہندوستان کے مصنوعات کو ویسا ہی قلیل محصول دینے پر انگلستان لانے کی اجازت دیدیں۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ کیا اس ملک کی کوئی نوآبادی ایسی بھی ہے جس کے مصنوعات اس قدر کم لاگت پر انگلستان لائے جاتے ہیں جیسے ہندوستان کے مصنوعات؟

مسٹر لارپنٹ۔ اس ملک کی کوئی نوآبادی ایسی نہیں ہے جسکے کثیر المقدار مصنوعات کے لیئے اس درجہ اس بات کی ضرورت ہے۔ ہم نے ہندوستان کے مصنوعات کو تو بالکل نیست و نابود ہی کر دیا اس کے بعد اس گواہ نے مجلس نظمار کے اُن خیالات کا اعادہ کیا جو لارڈ ولیم بنٹنک کی ۳۰ مئی ۱۸۲۹ء کی یادداشت میں درج ہیں۔ اور جسکی عبارت یہ ہے کہ مجلس کی ہمدروی مجلس مالگزاری کی رپورٹ پڑھنے کے بعد جس میں تجارتی انقلاب کے اثرات کی ایک المناک تصویر کھینچی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے موجودہ زمانے میں ہندوستان کے بے شمار طبقے اور جماعتوں کیلئے ایسے کیا کیا تکالیف نہ پیدا ہو گئے ہیں جنکی مثال تاریخ تجارت میں کہیں نہیں ملتی بہت بڑھ گئی ہے")

لیکن مسٹر براکلہرسٹ اس سے قائل تھوڑے ہی ہوتا تھا! انگلستان میں ہندوستانی ریشمی رومالوں کے استعمال پر اسکی روح کرب میں پڑ گئی تھی۔ اسلیئے ٹہر ٹہر کر وہ پھر اسی مضمون پر آتا تھا۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہندوستانی ریشمی رومال اس ملک میں بنے ہوئے رومالوں کے بجائے اس قدر میں استعمال ہو رہے ہیں کہ اب یہاں ناکارہ ریشم سے نقلی رومال بناکر ان کے بدلے رائج کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں؟

مسٹر لارپنٹ۔ میں نے سنا تو ہے کہ ناکارہ ریشم کے بنے ہوئے رومال رائج

کیے جا رہے ہیں اور جیسا میں نے پہلے کہا ہے کہ ان بنانے والوں کی جودت طبع اور حکمت سے ہماری منڈیوں میں غالباً ایسا مال رائج ہو جائے گا جو کم قیمت ہونے کی وجہ سے عام طور پر استعمال ہونے لگے۔

مسٹر براکلہرسٹ بغرض تجارتی مقابلے میں اپنی موجودہ حیثیت قائم رکھنے کے لیے برطانوی صناعوں کو ادنیٰ درجے کی چیزیں بنانے پر مجبور کر کے؟

مسٹر لارپنیٹ۔ جن چیزوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ یہیں کی ساختہ ہیں۔ برطانوی صناعوں ہی نے ان ادنیٰ درجے کی چیزوں کو بنایا ہے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ شاید یہ زیادہ مناسب ہو گا کہ ہندوستان میں صرف خام پیداوار ہوتی ہے اور یہ ملک اس خام پیداوار کو مکمل کرنے میں اپنا ہنر دکھاتا رہے؟

مسٹر لارپنیٹ۔ ہندوستان کی جو موجودہ حالت ہے اس سے قطعی یہی ہونے والا ہے اور ہماری رائے یہ ہے کہ ان اہم چیزوں ہی کے لیے جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے ہندوستان کی زرعی پیداوار کی ہمیں ہر طرح مدد کرنی چاہیے میں پھر عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان کے گئے گزرے مصنوعات میں یہی ایک چیز رہ گئی ہے جس کے اس ملک میں رائج ہوسکنے کی توقع بھی ہے تو پھر کم از کم اس کو ایک واجبی موقع دینا چاہیے اور یہ نہیں کہ برطانوی صناعوں کی طرفداری میں اس پر ۲۰ فی صدی محصول لگا دیا جائے جو سراسر ظلم ہے۔

منٹگمری مارٹن

ہندوستان کا اس سے بھی زیادہ زور آور حامی منٹگمری مارٹن تھا۔ اس نے دس سال تک زیادہ تر اپنے خرچ سے شاہنشہی برطانیہ کی نو آبادیات میں سیاحت کی تھی۔ واقعات اور اعداد و شمار جمع کیے تھے اور برطانوی نو آبادیات کی پہلی مکمل تاریخ جو پانچ ضخیم جلدوں میں تھی تالیف کی تھی۔ مارٹن ہندوستان میں بھی

رہا تھا۔ ہندوستان کے مسائل کا بہر موقع بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور ڈاکٹر فرانسس بکانن کے مغربی ہند سے متعلق ضخیم اور قابلِ قدر اعداد و شمار و حالات کو جن کو خود بکانن ترتیب نہ دے سکا تھا مرتب کیا تھا۔

اس نے لکھا کہ ”میں نے ہندوستان کی سالہا سال کی تجارت کی طول طویل تحقیق کی ہے۔ مختلف اسناد وغیرہ کو (جنہیں دیکھنے کی اجازت ایسٹ انڈیا ہوز کی معزز مجلس نظماء نے اپنی معمولی فیاضی کے ساتھ مجھے عطا کی تھی) بالتحقیق پڑھنے کے بعد صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے میں نے حد درجے کی محنت اٹھائی ہے۔ اور میں یقین واثق کا میرے دل پر بہت اثر ہے کہ ہندوستان کی تجارت بالکل ناواجبی طور پر بہت بڑے گھاٹے میں رہی ہے اور نہ صرف انگلستان کی حد تک بلکہ اور تمام ممالک کے ساتھ اور محض اس وجہ سے کہ انگلستان آزاد تجارت کے لئے ایک شور مچائے ہوئے تھا مگر خود ہندوستان کو آزاد تجارت کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا“ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ ”سوائے ان اشیاء کے جن کے دیسی صناعوں کی جگہ ہم نے غصب کر لی ہے اور اس طرح ہم اس ملک کو اور زیادہ مفلس و نادار بنا رہے ہیں عام طور پر تجارت انحطاط ہی پر ہے۔“

سوتی پارچے۔ ۱۸۱۵ء میں ہندوستان سے جو سوتی پارچے انگلستان میں برآمد ہوئے تھے ان کی قیمت ...... ۱۳ پونڈ تھی مگر ۱۸۳۲ء میں ...... ۱ پونڈ سے بھی یہ کم تھی۔ ۱۸۱۵ء میں انگلستان سے جو سوتی کپڑے ہندوستان میں درآمد ہوئے تھے ان کی قیمت (۲۶۳۰۰) پونڈ تھی مگر ۱۸۳۲ء میں ...... ۴ پونڈ سے بھی یہ زیادہ ہوگئی تھی۔ ”ہم نے ایک ربع صدی کے اندر اندر ہندوستان کی علمداری کے لئے ہمارے مصنوعات کا لینا ناگزیر کر دیا تھا۔ ہمارے پشمینوں پر محصول معاف تھا۔ ہمارے سوتی پارچوں پر صرف ۲½ فی صدی محصول تھا اور دوسری چیزوں پر بھی اسی تناسب کے ساتھ محصول لیا جاتا تھا۔ درآنحالیکہ ہماری اس علمداری کی ساختہ چیزوں پر اسی مدت میں ۱۰ سے لے کر ۲۰-۳۰-۵۰-۱۰۰-۵۰۰ کیا . . . ا فی صدی تک ہم نے امتناعی محصول لگا دیا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت قائم کرنے کے لئے جو ایک شور مچایا گیا ہے اس کا منشا

انگلستان کے ساتھ ہندوستان کی جو تجارت ہے اس کو آزاد رکھنے کا نہیں بلکہ ہندوستان کے ساتھ اس ملک کی جو تجارت ہے صرف اس کو آزاد رکھنے کا ہے ......
سورت ڈھاکہ ۔ مرشد آباد اور دیگر مقامات میں جہاں کسی وقت دیسی مصنوعات فروغ پر تھے اب ایسی تباہی اور بربادی پھیل گئی ہے کہ اس کا بیان کرنا تکلیف سے خالی نہیں ۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ یہ حالت اتنائے تجارت میں جیسا کبھی ہوا کرتا ہے پیدا ہوئی ہے بلکہ میرے خیال میں دراصل زوردار نے کمزور کی مٹی پلید کی ہے۔
اس طرح کی شہادت پر برطانوی صناعوں کے نمایندے مسمی براکلہرسٹ اور اس گواہ میں خوب بحثا بحثی ہوئی ۔

مسٹر براکلہرسٹ ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے یا اس ملک کے جولاہوں میں سے ایک گروہ کا بھینٹ چڑھنا ضروری تھا اور وہ تو ہندوستان میں ہو ہی چکا اگر کیا آپ کی خواہش اب یہ ہے کہ اس ملک پر آفت نازل کرکے ہندوستان کی آبادی میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی جائے ؟

مسٹر مارٹن ۔ میری خواہش ہندوستان کی آبادی میں از سر نو جان ڈالنے کی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کو اس طرح مسلسل نقصان جو پہنچ رہا ہے میں صرف اس کا انسداد چاہتا ہوں ۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہندوستانیوں کو اس ملک میں ملکی مصنوعات کے ساتھ تجارتی مقابلہ کرنے کی اجازت دینے سے انگلستان کے جولاہے سرے سے نیست و نابود ہو جائیں گے کیونکہ ہندوستانیوں کے پاس نہ تو بھاپ سے چلنے والے کرگھے ہیں اور نہ ان کو ہنر اور سرمایے سے اسی خوبی کے ساتھ کام لینا آتا ہے جیسا گلاسگو اور مینچسٹر کے صنعت گروں کو آتا ہے ۔

مسٹر براکلہرسٹ ۔ اب تک جتنے سوالات کیے گئے ہیں وہ کلیتاً ان مہین پارچوں سے متعلق ہیں جن کو بھاپ سے چلنے والے کارگاہوں پر تو نہیں بنا جا سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس ملک میں مہین پارچے تیار کریں یا ان کا بننا بالکل چھوڑ ہی دیں ؟

مسٹر مارٹن ۔ اگر یہاں مہین پارچے تیار کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہندوستان کے ساتھ ناانصافی روا رکھی جائے تو میرا جواب یہ ہے کہ نتیجہ کچھ ہی

کیوں نہو انگلستان کو تو ہر حالت میں انصاف ہی سے کام لینا چاہیئے۔ انگلستان کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ اپنے فائدے کی خاطر اور اپنی قوم کے محض ایک طبقے کی حمایت میں کسی دوسری قوم کو مٹی میں ملادے خواہ وہ قوم مفتوحہ ہی کیوں نہ ہو۔

مسٹر برا کلہرسٹ۔ ۱۸۳۳ء[1] میں جب اس ملک کے ہاتھ میں ہندوستان کی زمام حکومت آئی تھی اس وقت ہندوستان میں کپڑا بُننے کی صنعت مٹ چکی تھی اس لیے اب اس کے مٹانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ وہ تو گئی گزری بات ہوی۔ اب ہمارے سامنے جو شہادت پیش ہوی ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مصنوعات کے بجائے زیادہ تر زرعی پیداوار ہی ہوتی ہے اور جو لوگ پہلے صنعت میں مشغول تھے وہ اب زراعت میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو کیا یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہاں کے مصنوعات مسدود ہو جائیں تو پھر کیا یہاں کے لوگوں کو روزی کمانے کے لئے زراعت کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی موقع بھی ہے؟

مسٹر ٹارٹن۔ مجھ کو آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ ہندوستان سرے سے ایک زرعی ملک ہے۔ درحقیقت جیسا وہ صنعت گر ملک ہے ویسے وہ زرعی ملک بھی ہے اور جو کوئی اس ملک کی حیثیت کم کرکے اس کو محض زرعی بنا دینا چاہتا ہے وہ دراصل اس کو معیار تمدن سے گرا دینا چاہتا ہے۔ میرا مفروضہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان انگلستان کا ایک بہت بڑا الحیبت بن جائے ہندوستان صنعت گری کا ملک ہے ایک زمانے سے مختلف قسم کے مصنوعات وہاں بنتے

---

[1] ۱۸۳۳ عیسوی میں ہندوستان برطانیہ عظمیٰ کے زیر حکمرانی نہیں آیا تھا۔ یوں تو اس سے پچاس سال پہلے برطانوی حکومت نے ہندوستان کا نظم ونسق پٹ کے قانون ہند بابتہ ۱۷۸۴ عیسوی کی رو سے اپنی نگرانی میں لے لیا تھا اور وہ اس نظم ونسق کی ذمہ دار بھی تھی لیکن ۱۸۳۳ء میں جو قانون نافذ ہوا تھا اس کی رو سے کمپنی کے منشور کی تجدید کی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کمپنی کو آیندہ تجارت کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔

رہے ہیں اور ایسے کہ جہاں برابری کا مقابلہ رہا ہے وہاں کوئی قوم ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ میں یہ ڈھاکے کی ململوں اور کشمیری شالوں کے متعلق ہی نہیں کہتا بلکہ ان تمام مختلف چیزوں کے متعلق کہہ رہا ہوں جو بمقابل دنیا کے کسی اور خطے کے ہندوستان میں بہت بہتر طریقے پر بنتی ہیں۔

پشمینے پچیس سال تک برطانیہ کے ساختہ پشمینے ہندوستان میں بلا محصول لائے جاتے تھے۔ لیکن بکرے کے اون کے بنے ہوئے ہندوستانی پشمینوں پر ۳۰ فی صدی محصول بحساب قیمت انگلستان میں لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۸ء تک ہندوستانی پشمینوں کی درآمد اوسطاً سالانہ ۰۰۰ ۲۸ پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔ اس تجارت کو موقوف کر دینے سے برطانوی صناعوں کو کچھ فائدہ نہ ہوا کیونکہ انگلستان کے لئے شالیں زیادہ تر یورپ سے بن کر آتی تھیں۔

جہاز سازی۔ ہندوستان میں جہاز کم بن رہے تھے۔ ۱۷۹۵ء اور ۱۷۹۶ء کے درمیان کلکتے میں ۱۴۱۰۵ ٹن وزنی چھ جہاز بنے تھے اور ۵۰۰۰ سے ۶۰۰۰ ٹن وزنی ناؤ وغیرہ تیار ہو رہی تھیں۔ ۱۷۸۱ء اور ۱۷۹۸ء کے درمیان متعدد جہاز وغیرہ کلکتے کے کارخانے کے بنے ہوئے دریا پہ چلتے تھے لیکن اب (۱۸۴۰ء میں) جہاز سازی وہاں بالکل بند ہو گئی تھی۔ بمبئی میں پارسیوں نے جہاز بنانے کا ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کیا تھا جس کا تمام عملہ تین پشت تک پارسیوں ہی کے زیر انتظام رہا تھا۔ "ایشیا" نامی ایک اچھا جہاز نوروزجی جمشید جی نے بنایا تھا اور دوسرے پارسی شرفا انگریزی کارخانوں میں جہاز بنانا سیکھ رہے تھے۔ اگر انگریزوں کے بنائے ہوئے جہازوں پہ ہندوستانی خلاصی ہوتے تھے اور وہ ان ممالک کی بندرگاہوں کو جاتے تھے جن سے انگلستان کے ساتھ باہمی معاہدے تھے کہ جانبین کے حقوق و فرائض ہر وقت ملحوظ رکھے جائیں گے تو ان جہازوں کے ساتھ برطانیہ کے جہازوں کا سا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا اور یہ ہندوستان میں جہاز بنانے میں بڑا مزاحم تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ۱۸۳۳ء کے منشور میں تو یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ہندوستانی بھی برطانوی رعایا تھے مگر ان کے حق میں یہ سخت ناانصافی اور ظلم تھا کہ تجارتی جہازوں کے معاملات میں ان کو برطانوی رعایا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مطالبات وطن۔ اس گواہ نے کمپنی کے منشور کی ۱۸۱۳ء کی تجدید سے ۱۸۳۳ء کی مکرر تجدید تک اس بست[۲] سالہ مدت کے مطالبات وطن کے یعنے ہندوستان کے محاصل کی جس قدر رقم انگلستان میں صرف ہوتی تھی اس کے اعداد پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد کی پنج سالہ مدت کے یعنے ۱۸۳۴ء سے ۱۸۳۸ء تک مطالبات وطن کے اعداد دوسری رپورٹ سے لیے گئے ہیں اور ہندوستان کے محاصل کے اعداد پارلیمنٹی نقشۂ بازیافت سے اخذ کیے گئے ہیں:

سنہ عیسوی	مطالبات وطن	محاصل ہند
	پونڈ	پونڈ
۱۸۱۴-۱۵	۲۴۴۶۰۱۶	۱۷۲۹۷۲۸۰
۱۸۱۵-۱۶	۲۰۴۸۰۳۰	۱۷۲۳۷۸۱۹
۱۸۱۶-۱۷	۲۰۴۲۸۰۹	۱۸۰۷۷۵۷۸
۱۸۱۷-۱۸	۲۰۲۳۹۹۶	۱۸۳۷۵۸۲۰
۱۸۱۸-۱۹	۲۳۶۹۹۴۷	۱۹۴۵۹۰۱۷
۱۸۱۹-۲۰	۱۸۶۱۳۸۱	۱۹۲۳۰۴۶۲
۱۸۲۰-۲۱	۲۳۰۶۱۸۷	۲۱۳۵۲۲۴۱
۱۸۲۱-۲۲	۳۲۰۳۶۱۱	۲۱۸۰۳۱۰۸
۱۸۲۲-۲۳	۳۳۲۶۴۰۶	۲۳۱۷۱۷۰۱
۱۸۲۳-۲۴	۲۰۲۷۴۲۰	۲۱۲۸۰۳۸۴
۱۸۲۴-۲۵	۲۱۸۲۱۳۲	۲۰۷۵۰۱۸۳
۱۸۲۵-۲۶	۲۳۶۲۳۶۰	۲۱۱۲۸۳۸۸
۱۸۲۶-۲۷	۲۹۷۵۱۴۱	۲۲۳۸۳۴۹۷
۱۸۲۷-۲۸	۲۶۹۴۲۱۹	۲۲۸۶۳۲۶۳

۱۸۲۸-۲۹	۲۷۱۹۵۷۹	۲۲۷۴۰۶۹۱
۱۸۲۹-۳۰	۲۶۱۳۵۲۶	۲۱۶۹۵۲۰۸
۱۸۳۰-۳۱	۲۳۹۹۵۷۳	۲۲۰۱۹۳۱۰
۱۸۳۱-۳۲	۲۴۷۵۰۶۹	۱۸۳۱۷۲۳۶
۱۸۳۲-۳۳	۲۲۳۳۵۵۹	۱۸۴۷۷۹۲۴
۱۸۳۳-۳۴	۲۰۵۳۱۴۱	۱۸۲۶۷۳۶۸
۱۸۳۴-۳۵	۳۰۶۳۳۲۲	۲۶۸۵۶۶۴۷
۱۸۳۵-۳۶	۲۹۵۹۹۷۵	۲۰۱۴۸۱۲۵
۱۸۳۶-۳۷	۳۰۹۰۵۸۲	۲۰۹۹۹۱۳۰
۱۸۳۷-۳۸	۲۹۷۹۵۱۴	۲۰۸۵۸۸۲۰

اس طرح ہم نے جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے ملکۂ وکٹوریہ کے سال تخت نشینی تک اس بست و چہار سالہ مدت میں مطالبات وطن کا ہندوستان کے محاصل کے ساتھ کیا تناسب رہا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔

ان مطالبات وطن کا ایک قلیل حصہ یعنے تقریباً ایک خمس انگلستان سے جو سامان ہندوستان کی فوجی ضرورتوں وغیرہ کی تکمیل کے لئے آتا تھا اس پر صرف ہوتا تھا مابقی کے متعلق منٹگمری مارٹن نے کہا تھا کہ " یہ ہندوستان کے محاصل پر ایک ایسا مطالبہ ہے کہ ہندوستان کو اس کے معاوضے میں کچھ بھی نہیں ملتا .... یہ حساب کرنا تعجب سے خالی نہیں معلوم ہوتا کہ اگر ہندوستان کے گزشتہ تیس ۳۰ سالہ محاصل ہر سال تیس لاکھ ہی فرض کر لیے جائیں تو ۱۲ فی صدی (جو ہندوستان کی شرح سود ہے) سود در سود پر یہ رقم ۷۲۳۹۹۷۹۷۱ پونڈ ہو جاتی ہے۔ اگر ہم پچاس سال کے لئے سالانہ بیس ۲۰ لاکھ ہی محاصل فرض کر لیں تو ہندوستان کے اس سرمایے کے بار آور ہونے پر یہ رقم جملہ ۰۰۰۰۰۰۰۰۴۸ پونڈ ہو جاتی ہے جو برتر از قیاس ہے"۔

ریشمی مصنوعات۔ ہندوستان کے ریشمی مصنوعات اس غیر مساوی محصول سے

بالکل بری ہونے چاہئیں جو انگلستان میں ان پر عائد ہے کیونکہ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انگلستان کی یا کسی دوسرے ملک کی ریشمی مصنوعات سے ان کا مقابلہ نہیں ہے۔

الکزانڈر راجرز

سن۔ الکزنڈر راجرز ہندوستان میں سن کے بڑے بڑے کارخانوں کا مالک تھا اور ریشے کے لئے سن کی کاشت وہاں رائج کر رہا تھا کیونکہ ہندوستانی محض بیج کے لئے اس کی کاشت اب تک کرتے رہے تھے۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ ہندوستانی سن کے پہلے نمونے ۱۰ ار جون ۱۸۴۰ء تک انگلستان پہنچ جائیں گے اگر ہم ایک قسم کے سن کی پیداوار میں کامیاب ہوں تو دوسری قسم کے سن کی پیداوار میں بھی کامیاب ہونے میں ہمیں کچھ مشکل نہ ہوگی کیونکہ دونوں کی کاشت کا طریقہ ایک ہی ہے۔

ریشم۔ یہ گواہ ہندوستانی ریشم کثیر مقدار میں انگلستان بھیجتا تھا۔ برطانوی ریشمی مصنوعات کی ہندوستان میں درآمد پر ۱/۲ ۳ فی صدی محصول لیا جاتا تھا اور ہندوستانی ریشمی مصنوعات کی انگلستان میں درآمد پر (۲۰) فی صدی سے بھی زیادہ محصول وصول کیا جاتا تھا۔ اس تفاوت سے ہندوستانی ریشمی صنعت کے گویا ہاتھ پاؤں شل ہوگئے تھے۔ اگر ہندوستانی ریشموں پر محصول کم کر دیا بھی جاتا تو اس سے برطانوی مصنوعات پر کچھ مضر اثر نہیں پڑتا تھا کیونکہ فرانسیسی ریشموں پر محصول کم کر دینے سے کوئی مضر اثر نہیں پڑا تھا۔ ایک طرف تو ہندوستان کے ساختہ ریشم کے تھان جو انگلستان میں رائج ہوسکتے تھے وہ بہت گاڑھے ہوتے تھے مثلاً کورے ریشمے جو بہت کم انگلستان میں بنائے جاتے تھے اور دوسری طرف انگلستان کو یہ فائدہ تھا کہ اس سے دیسیوں کو ان تھانوں کے معاوضے میں ہمارا مال خریدنے کے لئے دو چند بلکہ سہ چند رقم مل جاتی تھی۔

شکر۔ اس گواہ نے اپنے نیل کے کارخانے کے قریب شکر سازی کا ایک کارخانہ

۲۷،۰۰۰ پونڈ کے مصارف سے جسور ضلع میں سرنکول کے مقام پر تعمیر کیا تھا۔ اس امید پر کہ شکر اور رم شراب پر مساوی محصول کر دیا جائے گا کیونکہ یہ دونوں گنے ہی سے بنتے تھے راجرز کو اچھے منافع کی توقع تھی۔ مگر اس کو صرف ۱۱½ فی صدی منافع ملا جو اطمینان بخش نہ تھا کیونکہ اگر ہندوستان میں بلا کسی خطرے کے صرف سو پر روپیہ قرض دیا جائے تو ۱۰ فی صدی اور سود در سود دیر تو اس سے بھی زیادہ بیٹھے بیٹھے مل جاتا ہے اگر رم شراب پر محصول مساوی کر دیا جاتا تو اس کے منافع میں اضافہ ہو سکتا تھا اور اگر نہ کیا جاتا تو وہ شکر سازی کے کاروبار سے دست بردار ہونے پر آمادہ تھا۔

ج ۔ اہم ہیتیجہ

لوہا ۔ اس گواہ کا جس انجمن سے تعلق تھا اس انجمن نے ۱۸۳۳ء میں ۱۲ میل مدراس کے جنوب میں "پورٹونوو" کے مقام پر کام شروع کر دیا تھا۔ لوہار کی بھٹیاں بنائی تھیں اور نرم لوہا بنانے کے لئے ایک لوہاری کارخانہ قائم کیا تھا غرض اس طرح اپنے کارخانے کو بہت بڑا کر دیا تھا۔ انگریزی لوہے سے فولاد نہیں بن سکتا تھا فولاد بنانے کے لئے لوہے کی ایک سلاخ بھی درکار ہوتی تھی تو انگلستان کو سویڈن اور روس سے یہ لوہا منگوانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ البتہ ہندوستان سے بھی یہ دھات مل سکتی تھی کیونکہ ہندوستانی لوہے سے بھی فولاد بن سکتا تھا۔ اس گواہ نے ریزۂ آہن کی شکل میں ہندوستان کا لوہا سلاخیں بنانے کے لئے انگلستان میں درآمد کیا تھا لیکن انگلستان میں آہن خام کی درآمد پر امتناعی محصول تھا۔ "ایک ٹن آہن خام پر ۵ شلنگ محصول ہے اور دو ٹن آہن خام سے ایک ٹن لوہے کی سلاخیں بنتی ہیں یا۔ ایک ٹن لوہے کی سلاخوں پر ½۲ شلنگ محصول لیا جاتا ہے درآنحالیکہ ایک ٹن لوہے کی سلاخیں بنانے کے لئے جس قدر آہن خام درکار ہے اس پر ۱۰ شلنگ محصول وصول کیا جاتا ہے۔ انگریزی لوہے کی ہندوستان میں درآمد پر کچھ محصول نہ تھا"۔

ہاریس ہیمن ولسن

کتب ۔ سنسکرت کے اس بڑے فاضل و فائق مستشرق نے چوبیس[۲۴] سال ہندوستان میں گزارے تھے اور مراجعتِ وطن پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتاب خانے کا محافظ اور جامعۂ اکسفرڈ میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر ہوا تھا اس نے اپنی شہادت میں بیان کیا ہے کہ جو کتابیں ہندوستان میں طبع ہوتی ہیں ان پر فی ہنڈرڈویٹ (چھپن سیر) دو پونڈ دس شلنگ محصول لیا جاتا ہے چنانچہ اس محصول کو معاف کر دینے کی اس نے استدعا بھی کی تھی ۔

جوزف ٹکر

ریشمی مصنوعات ۔ جوزف ٹکر ریشم پر ٹھپّیا اٹھانے والی اور ریشمی رومال بیچنے والی ساجھے کی ایک لندن کی دکان کا شریک تھا جو برطانوی صنعت کی حفاظت کے لئے ہندوستان کی ریشمی مصنوعات پر ۲۰ فی صدی محصول قائم رکھنے کا خواہشمند تھا ۔ اس نے کہا تھا کہ برطانیہ کے لوگ اب تک صرف برطانوی مصنوعات ہی استعمال کرتے تھے لیکن فرانسیسی ہندوستان کی چیزوں کو برطانوی مصنوعات پر ترجیح دیتے تھے اس لئے فرانس میں برطانوی ریشمی مصنوعات کی درآمد کم ہو رہی تھی ۔ اس نے پارلیمنٹی نقشہ بازیافت سے ذیل کے اعداد پیش کیے تھے :

ممالک متحدہ برطانیہ سے فرانس میں درآمد		
سنہ عیسوی	برطانوی ریشمی مال تجارت	ہندوستانی باندھنوں اور دوسرے قسم رومال
	پونڈ	پونڈ
۱۸۳۲	۵۰۶۰۰	۹۲۵۰۰
۱۸۳۳	۳۶۳۰۰	۶۰۴۰۰

۱۸۳۴	۳۲۷۰۰	۷۷۷۰۰
۱۸۳۵	۱۶۸۰۰	۱۱۴۴۰۰
۱۸۳۶	۱۵۶۰۰	۱۰۷۶۰۰
۱۸۳۷	۱۰۰۰۰	۱۷۴۵۰۰
۱۸۳۸	۹۴۰۰	۲۰۲۲۰۰
۱۸۳۹	۵۵۰۰	۱۶۸۵۰۰

اس گواہ نے مزید توضیح یہ کی تھی کہ "جس زمانے میں پہلے پہل برطانوی مال تجارت فرانس بھیجا گیا تھا اس وقت ہندوستان کے مال تجارت کا فرانس میں داخل ہونا ممنوع تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ فرانسیسی خریدار برطانوی مال ہی کو پسند کرتے تھے اور اسی لیے برطانوی مال اس مقدار میں فرانس بھیجا جاتا تھا۔ جیسے ہی یہ امتناع اٹھا دیا گیا ہماری تجارت پر اس کا اثر پڑا اگرچہ اس سے پہلے بھی اثر پڑ رہا تھا مگر وہ بالکل خفیف سا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر امتناع اٹھنا ہی تھا کہ فرانس کے ساتھ برطانیہ کا یہ رشتۂ تجارت سرے سے منقطع ہو گیا"۔

ہندوستان کی ساختہ ایک شئے کو صرف ایک یورپی قوم کے پسند کرنے سے انگریز دکانداروں اور صنعت گروں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہی رشک و حسد ذیل کے آخری چار گواہوں کے بیان سے جو ریشم کے صناع تھے اور جن کا اظہار مجلس منتخبہ نے لیا تھا ٹپک رہا ہے! ان اشخاص کی شہادت کی طرف ہم اب متوجہ ہوتے ہیں۔

ٹامس کوپ

ریشمی مصنوعات۔ کسی اور گواہ نے اس طرح صاف صاف سیدھے سادے طریقے پر گواہی نہیں دی جیسے ٹامس کوپ نامی میکلز فیلڈ کے ریشم کے پارچہ باف نے

دی تھی ۔

مسٹر براکلہرسٹ ۔ ہندوستان کے ریشمی مال پر ۲۰ فی صدی محصول جو اس وقت ہے اگر وہ صرف ۳ ½ فی صدی کر دیا جائے تو اس کا اثر آپ کے شعبۂ تجارت پر کیا ہوگا ؟

مسٹر کوپ ۔ میری رائے میں اس کا اثر یہ ہوگا کہ تجارت کا یہ شعبہ نابود ہو جائے گا ۔ اور اگر ایسا ہوگا تو وہ سب جماعتیں جن کا نام میں نے پہلے لیا ہے روزی کمانے اور محنت مزدوری کر کے ایمانداری کے ساتھ پیٹ پالنے کے ذرائع سے بالکل محروم ہو جائیں گی اور ایسے مفلس اور بے پروا بن جائیں گے کہ قوم کے دوسرے سب لوگوں کے لیے جن پر پہلے سے کچھ کم بوجھ نہیں ہے یہ مزید بار گراں ہو جائیں گے اس سے قومی سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ بیکار پڑا رہے گا اور پردیسیوں کے ہاتھوں روزی کمانے کا وہ ذریعہ چلا جائے گا جس کو ہمارے کسب معیشت کے کام آنا چاہیئے ۔

مسٹر ہاگ ۔ کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ ریشم کے صنعت گروں کے حق میں انصاف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری منڈی میں تمام بدیسی ریشمی مصنوعات کو آنے نہیں دینا چاہیئے ؟

مسٹر کوپ ۔ میری رائے یہ ہے کہ انگریز صنعت گروں کے حق میں انصاف کرنے کی خاطر ان اشیا کی درآمد پر ایسا محصول لگانا چاہیئے جس سے پردیسی اور ہم برابر ہو جائیں ۔ اگر ایک ہندوستانی روزانہ ڈیڑھ یا دو پنس پر گزر اوقات کر لیتا ہے تو ایک انگریز روزانہ دو شلنگ سے کم میں گزارہ نہیں کر سکتا اور ہم اس کو بڑا ہی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی پارچہ باف اپنا مال یہاں بھیجے اور ایسی ناواجبی شرائط پر ہم سے مقابلہ کرے ۔

مسٹر ایلیٹ ۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اس ملک کے مزدور کو جو بہتر غذا کھاتا ہے یہ کہنے کا حق ہے کہ ہم ہندوستان کے مزدور کو اسی حال پر رکھیں گے کہ اس کو کھانے کے لئے چاول سے بڑھ کر کچھ نہ مل سکے ؟

مسٹر کوپ ۔ مجھ کو ہندوستانی مزدوروں پر ترس ضرور آتا ہے مگر ساتھ

ہی ساتھ بتقابل ہندوستانی مزدوروں کے اہل وعیال کے میرے اپنے اہل وعیال کا مجھ کو زیادہ خیال ہے ۔ میرے نزدیک یہ بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی مزدور کی خاطر سے اس لیے کہ ہندوستانی مزدور کی حالت اتفاقاً مجھ سے بدتر ہے میں اپنے اہل وعیال کے آرام وآسائش کو قربان کردوں اور میرے خیال میں ایسا قانون نافذ کرنا سراسر ناوراست ہے جس سے روزی کمانے کا ایک ذریعہ ہم سے چھین لیا جائے اور ہندوستانی مزدور کو محض اس لئے دیدیا جائے کہ اس کی حالت ہم سے بدتر ہے"

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ہندوستان کے متعلق برطانیہ عظمیٰ کی جو حکمت عملی تھی وہ کوپ کے سے صناعوں ہی کی مقرر کردہ تھی اور برطانوی پارلیمنٹ و حکومت ہند دونوں برطانیہ عظمیٰ کے صناعوں اور رائے دہندوں نے محض فرماں بردار و خادم تھے ۔

جان پراوٹ

ریشمی مصنوعات جان پراوٹ میکلز فیلڈ کا ایک اور ریشم کا پارچہ باف تھا اور یہ بھی برطانوی ریشمی صناعوں کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے ۔

مسٹر براکلہسٹ ۔ کیا آپ اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے ریشمی مصنوعات اور باندھنو رومالوں پر محصول میں تخفیف کرنے سے آپ کے پیشے کو نقصان پہنچے گا ۔

مسٹر پراوٹ ۔ میں اس کو بہت بڑا نقصان سمجھتا ہوں اور عام طور پر میکلز فیلڈ کے اہل حرفہ کا خیال بھی یہی ہے کیونکہ اس حکمت عملی سے پردیسیوں کا ہماری منڈیوں پر قبضہ ہو جائیگا اور صنعت کا یہ ہمارا شعبہ بالکل مٹ جائیگا ۔

جان فرانسیس

ریشمی مصنوعات ۔ شہر نارچ کا ایک اور ریشم کا پارچہ باف مسمی جان فرانسیس

ہندوستانی ریشمینوں کے بالکل خلاف اس لئے تھا کہ وہ نہایت کامیابی کے ساتھ برطانوی مصنوعات کا مقابلہ کر رہے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے محصول کو مساوی کر دینے کی جب درخواست کی تھی تو اس پر اس نے کمپنی کے بہت سخت خلاف کہا تھا۔

مسٹر ہلیٹ۔ ریشم کی پارچہ بافی چھوڑتے وقت جو آپ کا پیشہ تھا کیا آپ صرف اس پیشہ کی حالت سے بیزار ہو گئے تھے یا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی تھی؟

مسٹر فرانسیس۔ میں صرف اس پیشے کی حالت دیکھ کر اس سے بیزار ہو گیا تھا "انڈیا ہوز یعنے" دفتر وزیر ہند میں جب کورے ریشمینوں کا نیلام ہوتا ہے میں وہاں جا کر ایک تھان آج اس قیمت پر خرید سکتا ہوں جس قیمت پر مجھ کو یہاں آدھ سیر خام ریشم نہیں ملتا۔

مسٹر اروانگ۔ آپ اس کے کیا وجوہ سمجھتے ہیں؟

مسٹر فرانسیس۔ محض یہ وجہ ہے کہ ہندوستانی اپنا مال کم لاگت پر سستے داموں یہاں بھیج سکتے ہیں۔

مسٹر برائکلہرسٹ۔ کیا آپ کے خیال میں اس صورت حال کا بہترین علاج یہ نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو یہاں خام پیداوار بھیجنے کی ترغیب دی جائے تاکہ برطانوی صناع اس کو کام میں لائیں؟

مسٹر فرانسیس۔ یقیناً۔

اس گواہ نے یہ بھی کہا کہ چالیس سال پہلے (تقریباً ۱۸۰۰ء میں) ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے کچا ریشم لائی تھی اور انگلستان میں چیزیں بنانے کے لیے کمپنی نے اس کو فروخت کر دیا تھا۔ لیکن اب کمپنی "برطانوی صنعت سے بالکل بے پروا ہو گئی ہے" اور بہتر طریقے پر ریشم اپنے پاس سے نکالنے کے لئے کمپنی نے ہندوستان ہی میں ریشمینے بنانے کی اجازت دیدی ہے۔

مسٹر براکلہرسٹ نے یہاں تک کوشش کی تھی کہ اس گواہ کے منھ سے اس بات کا اقبال کرا دے کہ ہندوستان کے صنعت گر خام پیداوار اور صرف $1\frac{1}{2}$ پنس روزانہ پیدا کرنے میں خوش تھے اور آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ آپ کے خیال میں بھی وہ کسی قسم کی تکلیف میں تو نہیں ہیں۔ ساری عمر ان کو جیسی عادت پڑی ہے ویسی وہ زندگی گزارتے ہیں۔

مسٹر فرانسیس۔ یقیناً یہی بات ہے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ اس سے بہتر ان کو ما یحتاج جب میسر نہ ہوں تو جو کچھ ہے اسی میں ان کو آرام ملتا ہوگا؟

مسٹر فرانسیس۔ جی ہاں۔ بھوکوں مرنے میں شاید آرام ملتا ہوگا مگر میں تو یہ خیال نہیں کر سکتا۔

جان پوئی ٹن

مجلس منتخبہ نے جس آخری گواہ کی شہادت لی وہ جان پوئی ٹن نامی اسپٹل فیلڈ کا ایک پارچہ باف تھا۔

ریشمی مصنوعات۔ اسپٹل فیلڈ میں بہت کم باندھنو رومال بنتے تھے اس لئے ہندوستان کا اس مقام سے کچھ مقابلہ نہ تھا۔ اس پر بھی یہ گواہ ہندوستانی مصنوعات پر محصول کم کرنے کا اس لئے مخالف تھا کہ " اگر محصول کم کر دیا جائے تو ملک میں اس وضع کے رومال اور بھی کم بننے لگیں گے اور جو لوگ اب باندھنو رومال بناتے ہیں وہ جو کچھ اور بنانا شروع کر دیں گے اور اس طرح ان چیزوں میں جن کو ہم بنا رہے ہیں یقینی وہ ہم سے مقابلہ کرنے لگیں گے۔

نہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا دار العوام کی مجلس منتخبہ نے اس شہادت پر

جو قلمبند کی گئی تھی کوئی مختص تجاویز پیش کی تھیں یا نہیں؟ لیکن ہمارے سامنے دارالامرا کی مجلس منتخبہ نے جو رپورٹ پیش کی تھی وہ موجود ہے کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دارالعوام و دارالامرا دونوں کے پاس معروضہ کیا تھا اور دارالامرا کی مجلس منتخبہ نے ملول لارپنیٹ اور ٹریویلین کے علاوہ دوسرے ان گواہوں کی بھی شہادت قلمبند کی تھی جن کی شہادت مجلس دارالعوام کے سامنے پیش ہوئی تھی اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

لارڈ ایلنبرو جو بعد کو گورنر جنرل ہند ہوا تھا مجلس دارالامرا کا صدر نشین تھا اور اگرچہ اس کی رپورٹ ہندوستانیوں کے ساتھ بظاہر اتھا ئی ہمدردی جتانے کے خیال سے لکھی گئی تھی مگر اس میں بھی ان کی دست گیری و دادرسی کے لئے جس کی تگ و دو میں وہ لگے ہوئے تھے کچھ نہیں لکھا گیا۔ لارڈ صاحب نے ہندوستان کے مخصوص دعاوی کو جو پارلیمنٹ کی حق شناسی اور فیاضی پر مبنی تھے حسب معمول اپنے رنگین طرز تحریر میں صرف بیان فرما دیا:

"ہندوستان جس کی آبادی ممالک متحدہ برطانیہ اور برطانوی شہنشہی کے زیر نگین جتنے اقطاع عالم ہیں ان سب سے زیادہ اور چہار چند زیادہ ہے جس کے محاصل ہی سے حکومت اور فوجی محافظت کے جملہ مصارف ادا ہوتے ہیں جس کی حکومت کے اعلیٰ تر معزز تر اور زرخیز تر عہدوں پر پیدائشی انگریز رعایا ہی مامور ہے اور حکمرانی کرتی ہے اس پر یہ بھی لازم کیا گیا ہے کہ مختصر سے فوجی سامان کے سوا بلا کسی معاوضے کے سالانہ وہ اس ملک کو بیس۲ اور تیس۳ لاکھ پونڈ انگلیسیہ کی رقم ارسال کرتا رہے"۔

اس بلاغت نشان اظہار خیال کے بعد لارڈ ایلنبرو نے جزائر غرب الہند اور ہندوستان کے تمباکو پر محصول یکساں کر دینے کی سفارش کی لیکن رم شراب کے متعلق اس طرح کی تجویز پیش کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہندوستان کے سوتی مصنوعات تو مٹ ہی چکے تھے۔ ایلنبرو نے سفارش کی کہ ان پر ہندوستان اور انگلستان میں محصول یکساں کر دیا جائے۔ لیکن ہندوستان

کے ریشمی مصنوعات انگلستان کے ریشمی مصنوعات کے ساتھ اب بھی مقابلہ کر رہے تھے اس لیے لارڈ ایلنبرو نے ان پر محصول یکساں کر دینے کی کوئی سفارش نہیں کی اور "ہندوستان کے یہ سب سے آخری مصنوعات" اسطرح مٹ گئے۔

آٹھواں باب

قہوہ - شکر اور روئی

۱۸۴۸ء اقوام یورپ کے لئے بڑے سیاسی انقلاب کا سال تھا۔ فرانس نے اپنے بادشاہ کو معزول کر کے اس کی جگہ دوسری مرتبہ جمہوریہ قائم کی تھی جرمانیہ چھوٹے چھوٹے والیانِ ریاست کی مطلق العنانی سے تنگ آکر باغیانہ تحریکات کی شکل میں اپنی بے صبری اور اضطرار کا اظہار کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو ایک اہم دستور بھی مل گیا تھا۔ اطالیہ نے قبل از وقت آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا میزینی کے خیالات کی تقلید میں ایک جمہوریہ روما میں قائم کر دی گئی تھی اور وہاں قومی خودمختاری حاصل کرنے کے لیئے پہلی دفعہ ایک کوشش عظیم کی گئی تھی جو ناکامیاب رہی۔ آسٹریا نے ویانا کی بغاوت بھی دیکھی تھی اور وطن پرست ہاورکسوتھ کے زیر حکم شورش پر آمادہ تھی آئرلینڈ میں تنسیخ "اتحاد" کا مسلسل مناقشہ کھلی بغاوت کا مقدمہ بن گیا تھا غرض ہر جگہ قدیم روش اور پرانی باتیں مفقود ہو رہی تھیں اور ان کے بجائے نئے نئے قومی ادارے اور قومی طاقتیں پیدا ہونے کے آثار نظر آتے تھے۔

ان سیاسی تحریکات کے ساتھ ساتھ تجارتی اور زرعی مصیبت بھی یورپ میں پھیلی ہوئی تھی۔ انگلستان میں ایک طرف تو مالکانِ اراضی کا طبقہ غلے کی

قیمت حسبِ حال برقرار رکھنے پر تلا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف صنعت گرد مزدور پیشہ طبقہ صنعتی روٹی کھانے پر اڑا ہوا تھا۔ اس جھگڑے کا تصفیہ سنہ ۱۸۴۶ء میں قانونِ غلہ کی تنسیخ پر ہوا۔ اس طرح برطانوی مصنوعات کو اس سے بڑا زور ہو گیا اور لوگ ایک ایسی شاہنشاہی کے بے سرو پا خواب دیکھنے لگے جس میں سب انسانی ضرورتوں کا پورا پورا سامان موجود ہو۔ کیا یہ ممکن تھا کہ انگلستان پردیسی اقوام سے بالکل مستغنی بن جائے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انگلستان کے سب مایحتاج خود اسی کی نوآبادیات سے دستیاب ہونے لگیں؟ چینی چائے کے بجائے ہندوستانی چائے بتدریج مقبول ہو رہی تھی۔ کیا ہندوستان کے لیے یہ ممکن تھا کہ حسبِ ضرورت قہوے کی سربراہی بھی کرے؟ جزائر غرب الہند میں غلاموں کو آزادی ملنے کے بعد نیشکر کے نخلستانوں کو انحطاط ہو گیا تھا۔ کیا ہندوستان کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ برطانیۂ عظمیٰ کے لئے معقول مقدار میں شکر بھیجا کرے؟ امریکہ کی روئی لنکاشیر کے کارگاہوں کے کام آتی تھی کیا یہ ممکن تھا کہ ضرورت کے موافق ہندوستان میں کپاس پیدا ہونے لگے؟ غرض ان سب امور کی پارلیمنٹ نے تحقیقات شروع کر دی۔

مجلسِ شکر و قہوہ

سنہ ۱۸۴۸ء میں دارالعوام نے لارڈ جورج بنٹنک کی صدارت میں یہ دریافت کرنے کے لئے ایک مجلس منتخبہ منعقد کی کہ "ملک معظم کے جزائر غرب الہند اور ہندوستان کے مقبوضات اور جزیرۂ ماریشس میں شکر اور قہوے کے نخلستانوں" کی موجودہ حالت کیا ہے اور آیندہ کے توقعات کیا ہو سکتے ہیں۔ اس مجلس نے متعدد گواہوں کی شہادت قلمبند کی اور دو ہزار مطبوعہ صفحات کی آٹھ رپورٹیں پیش کیں۔ پہلا گواہ لارڈ پامرسٹن تھا مگر ہندوستان کی تجارت کے متعلق صاف سیدھا اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پارلیمنٹ کے ایک رکن مسمی جان ہنگستا کی شہادت بھی اسی روز پیش ہوئی۔ ہنگستا نے ان سب غیر مفید اشکال کو تفصیل کے ساتھ

بیان کیا جن کے تحت ہندوستان کو دوسرے برطانوی مقبوضات سے مقابلہ کرنے پر سخت نقصان پہنچا تھا۔

"اول ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبات وطن کی تکمیل کے لئے ہندوستان کے محاصل سے بلا کسی قسم کے معاوضے کے ہر سال تین۳ لاکھ پونڈ انگلیسیہ اور اس سے بھی بڑھ کر رقم باہر چلی جاتی ہے۔

"دوم - دیوانی اور فوج کے ملازم جن میں سے شاذ ہی دو ایک ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے بود و باش اختیار کر لیتے ہیں روپیہ خوب جمع کرتے ہیں اور ہندوستان کی دولت کا یہ جز ہر سال برطانیہ عظمیٰ ارسال ہوتا ہے جس سے وہاں کے اصل میں اسی قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔"

"سوم یہ مشہور امر واقع ہے کہ برطانوی ہند کے محاصل کا جزء اعظم مالگزاری ہی ہے اور پیداوار اراضی پر یہ ایک بار سنگین ہے جو ایک کروڑ پینتیس۳۵ لاکھ پونڈ انگلیسیہ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔

"چہارم - انگلستان کے محصول خانوں میں جن طریقوں سے محصولات وصول کیے جاتے ہیں ان کی وجہ سے مال درآمد کرنے والوں کو ہر وقت مشکلات درپیش رہتی ہیں۔

گزشتہ تیس۳ سال میں ہندوستان میں سوتی مصنوعات کے مٹ جانے پر جان بیگشا نے بہت تاسف کا اظہار کیا۔ ۱۸۱۶ - ۱۸۱۷ء میں "ہندوستان نے نہ صرف اپنی بڑی آبادی کے تمام کپڑوں کی سربراہی کی بلکہ ۱۶۵۹۴۳۸ پونڈ مالیت کے تھان اس کے علاوہ برآمد بھی کیے" مگر اس کے تیس۳ سال بعد یہ برآمد کچھ بھی باقی نہیں رہی تھی بلکہ الٹے خود ہندوستان چالیس لاکھ پونڈ انگلیسیہ کا سوتی مال اپنے لیے درآمد کرنے لگا تھا۔ "برطانوی مصنوعات اہل ہند چاہیں تو خرید سکتے ہیں کیونکہ یہ $2\frac{1}{2}$ فی صدی محصول ادا کرنے پر ہندوستان میں درآمد ہوتے تھے مگر ہندوستانی مصنوعات پر یہاں (انگلستان میں) ایسا امتناعی محصول وصول کیا جاتا ہے کہ اہل انگلستان کا اس مال کو استعمال کرنا بالکل بند ہو گیا ہے" شکر انگلستان میں نہیں بنتی تھی اس لیے اس کے شرح محصول میں کسی قدر مفید تبدیلی

کی گئی۔ جس کا نمایاں نتیجہ فوری دکھائی دینے لگا۔ ایک ہندوستانی اخبار کی عبارت نقل کرتے ہوئے بگشا نے یہ کہا کہ "گزشتہ کسی عہد میں تجارت کی کسی شعبے میں بھی ایسی بڑی ترقی ہونے کی مثال نہیں ملتی۔ اس ناگہانی توفیر کے مماثل ہندوستان کے کسی اور ذریعۂ آمدنی کا نشو و نما کبھی دیکھا ہی نہیں گیا۔ گزشتہ سال ہم نے (ہندوستان نے) انگلستان کو اس کے جملہ صرفے کی ایک ربع مقدار کے برابر شکر کی بہم رسانی کی تھی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان رفتہ رفتہ انگلستان کی پوری مانگ کی تکمیل کر سکے گا۔" یہ کہنا اب بے فائدہ ہے کہ یہ توقع کبھی پوری نہ ہوئی اور انیسویں ۱۹ صدی عیسوی کے آخری نصف حصے میں قریب قریب دوسرے سب مصنوعات کے ساتھ شکر سازی پر بھی انحطاط چھا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ممتاز ناظم مسمی کرنل سائیکس نے جس نے ہندوستان کے اعداد و واقعات کا بغور مطالعہ کیا تھا ہندوستان سے ہر سال ......۳۳ پونڈ سے لیکر...... ۳۷ پونڈ تک جو معاشی سوتاؤ تھا اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سچ کہا تھا کہ "وہاں برآمد ہمیشہ درآمد سے متجاوز رہتی ہے جبھی تو ہندوستان اس خراج کی تاب لا سکتا ہے۔" ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر نشین ہنری سینٹ جان ٹکر نے کہا تھا کہ اس معاشی سوتاؤ کی مقدار روز افزوں ہو رہی ہے "کیونکہ مطالبات وطن میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔" کمپنی کے صدر نشین کا اس پر اظہار افسوس کرنا بیشک خلوص دل کے ساتھ تھا مگر اس سے بھی کچھ تدارک حاصل نہ ہوا کوئی ستم ظریف یہ کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان سے دولت کی گنگا جتنی انگلستان کو بہتی تھی انگلستان بھی اتنی ہی زیادہ ہمدردی اور تاسف کا دریا بہا کر اس کا نعم البدل کر دیتا تھا۔

تھیسیل الکزانڈر جو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرتا تھا انگلستان میں ہندوستانی شکر کے بڑی مقدار میں صرف ہونے کا دیر تک ذکر کرتا رہا مگر اس کے آئندہ توقعات کے متعلق نہایت نپی تلی شہادت اس نے دی تھی۔ ہندوستانی شکر کی تجارت میں ۱۸۴۶ء سے قبل معقول منافع ملتا تھا مگر تھوڑا عرصہ گزرا کہ کچھ نہیں ملنے لگا

اگر یہ تجارت بھی انحطاط میں آگئی تو پھر بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندوستان سے اس ملک کو خراج ہر سال کیونکر ایصال ہوگا۔ اس گواہ نے یہ بیان کیا کہ دو سے ۱۸۴۲ء تک تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عموماً ہندوستان کی درآمد تقریباً ۶۰۰۰۰۰۰ پونڈ اور برآمد تقریباً ۹۵۰۰۰۰۰ پونڈ رہی تھی۔ اور ان دونوں کا تفاوت تقریباً ۴۰۰۰۰۰۰ پونڈ ہوتا ہے اور یہی وہ خراج تھا جس کو کمپنی اس ملک سے وصول کرتی تھی [۱]

الگزانڈرا و رسر جورج لارنپٹ (جن کا ذکر ہم نے پچھلے باب میں کیا ہے) ان دونوں نے مجلس منتخبہ کے سامنے یہ بیان کیا تھا کہ جزائر غرب الہند اور موریشس زیادہ تر شکر بنانے والے ملک تھے اور ہندوستان زیادہ تر شکر صرف کرنے والا ملک تھا اور اپنی سالانہ پیداوار کا ایک قلیل جز غیر ممالک بھی بھیجتا تھا اسی لیے شکر کی برآمد میں ہندوستان مدت دراز کے لیے دوسرے ممالک سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لارنپٹ نے یہ بھی کہا کہ دو سنہ ۱۸۳۶ء میں محصول جو مساوی کر دیا گیا تھا وہ محض اس لئے نفع بخش ثابت ہوا تھا کہ اس اثناء میں جزائر غرب الہند کی شکر مقدار میں بہت کم ہوگئی تھی یعنے جہاں تک مجھ کو خیال پڑتا ہے سنہ ۱۸۳۲ء میں یہ شکر ۲۰۰۰۰۰ ٹن ہوئی تھی مگر سنہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء

---

[۱] پہلی رپورٹ۔ پچاس سال قبل یہ صداقت عیاں ہوچکی تھی کہ مطالبات وطن کی تکمیل میں ہر سال جو معاشی بدررو ہندوستان سے جاری تھی اس سے ہندوستان جتنا مال وہ درآمد کر سکتا تھا اس سے زیادہ برآمد کرنے پر مجبور تھا۔ اس طرح انگلستان اور ہندوستان کے درمیان جو تجارت قائم تھی وہ خود اختیاری یا فطری نہ تھی بلکہ جبراً تھی۔ نصف صدی کے بعد سے تو حالات پہلے سے بدتر ہوگئے ہیں۔ ہندوستان کی مصنوعات انحطاط پر ہیں درانحالیکہ مطالبات وطن تیس لاکھ پونڈ سے ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ تک پہنچ گئے ہیں۔ ہندوستان اس ہولناک مطالبے کی تکمیل بیشتر گیہوں اور چاول یعنے اہل ہند کے اشیائے خوردنی کی برآمد سے کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بڑھتا جا رہا ہے اور کثرت سے قحط پڑ رہے ہیں۔

میں صرف ۱۱۰۰۰ ٹن رہ گئی تھی۔ یہی بات تھی جس نے ہندوستان میں ایک حرکت ڈال دی اور نفع حاصل کرنے کا ایک اور موقع ہندوستان کے لئے پیدا کر دیا۔ یہاں شکر کی گرانی ہی ایک ایسی وجہ ہے جس سے ہندوستان کے لئے شکر برآمد کرنا نفع بخش ہوتا ہے۔"

ایک سے زیادہ گواہوں نے یہی بیان کیا تھا کہ پیداوار کے تخمینۂ قیمت کے موافق تشخیص مالگزاری کا اثر اراضی پر یہ تھا کہ شکر کی طرح اور دوسری قابل قدر پیداوار کی کاشت کرنے کی لوگوں کو ترغیب نہیں ہوتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر نشین مسمی ہنری سینٹ جورج ٹکر نے کہا تھا کہ "سر ٹامس منرو کا منصوبہ یہ تھا کہ ملک سے حتی المقدور محاصل وصول کیے جائیں۔ اس نے پیداوار کی مختلف چیزوں پر اپنے خیال کے موافق قیمت لگا کر مالگزاری کی تشخیص کر دی تھی اور ان اشیاء پر جن پر زیادہ منافع ملنے کی امید تھی مالگزاری کی رقم میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس میں منرو کو کامیابی ہوئی یا ناکامیابی اس کے متعلق میں اس لئے کچھ نہیں کہتا ممکن ہے تخفیفِ پیداوار کے اسباب دوسرے ہی ہوں۔ لیکن یہ تو میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح محصول لگانے کا نتیجہ مدراس کی عملداری میں یہ ہوا کہ وہاں شکر سازی کے لئے گنے کی کاشت میں کمی ہونے لگی اور نئی نئی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں"

سیلون کے ایک نخلبند قہوہ مسمی رابرٹ کرسچین نے اس جزیرہ کے پہلے نخلستان قہوہ کے دلچسپ حالات حسب ذیل بیان کیے تھے۔

"سنہ ۱۸۳۷ء میں ہم نے پہلے پہل یہ کام شروع کیا تھا اس وقت ہماری ترغیب کا باعث یہ تھا کہ ایک طرف تو جزائر غرب الہند کے قہوہ کی مقدار پیداوار میں روز بروز بیحد کمی ہو رہی تھی اور دوسری طرف اس زمانے میں انگریزوں کے نخلستان تامینی محصول کے زیر اثر موج کر رہے تھے اور ان حالات کا نتیجہ یقینی یہی تھا کہ عام طور پر گرانی پھیلی ہوئی تھی"۔ ہم سے پہلے اہل سیلون بھی یورپی اشخاص کے بلا توسط اور بغیر امداد سرمایہ قہوے کی کاشت اور قہوے کی برآمد بھی کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں اس جزیرے سے ۲۵۰۰ ٹن قہوہ جس کی کاشت کلیتاً اہل سیلون ہی نے کی تھی انگلستان بھیجا گیا تھا۔ اس سے (۹) سال بعد سنہ ۱۸۴۷ء کی

فصل ۲۴۴۲۱۲ ٹن ہوئی تھی جس میں سے ۷۱۷۲ ٹن اہل سیلون کی پیداوار تھی اور ۵۲۰۹ ٹن یورپی نخلبندوں کی۔

مجلسِ منتخبہ نے اپنی آخری رپورٹ میں نیشکر کے نخلستانوں میں غلاموں کو آزادی مل جانے اور آزاد مزدوروں کے نہ ملنے سے جو سخت نقصان اور تکلیف ہوئی تھی اس کو تفصیلی طور پر بیان کیا تھا اور شکر کی طرفداری میں جو برطانوی مقبوضات کی پیداوار تھی۔ اشلنگ "تفریقی محصول" لگانے کی سفارش کی تھی۔

مجلسِ پنبہ

ایک اور اہم مجلس منتخبہ ہندوستانی کپاس کو ترقی دینے کے اسباب دریافت کرنے کے لئے اسی سال مقرر کی گئی تھی۔ قدیم زمانے ہی سے ہندوستان سوتی پارچوں کے لئے جن کی سربراہی ایشیا اور یورپ کی سب منڈیوں کو ہوتی تھی مشہور عالم تھا جب انگلستان نے اپنے بھاپ کی طاقت سے چلنے والے کارگاہوں اور نامعلوم محصولات کے زور پر ہندوستان کی صنعت کو دبوچ ڈالا تو اس پر بھی امید کی جاتی تھی کہ ہندوستان اس خام پیداوار کی کاشت جس کی لنکیشر کے کارخانوں کو ضرورت تھی جاری رکھے گا۔ چنانچہ اس خیال سے کہ یہ خام پیداوار اور صنعت دونوں انگلستان ہی کے قبضے میں رہیں اور اس طرح امریکہ یا دوسرے غیر ممالک کی اس کو محتاجی نہ رہے ہندوستان میں کپاس کی کاشت کو ترقی اور توسیع دینے کے لئے ہر ممکنہ کوشش ہو رہی تھی۔ بنا بریں ۱۸۴۸ء میں جس مجلس منتخبہ کے ذمے یہ اہم ترین کام کر دیا گیا تھا اس کا صدر نشین مشاہیر انگلستان میں سے ایک شخص بنا دیا گیا یعنی جان برائیٹ جس نے "قانون غلہ" کی تنسیخ کے لئے شورش برپا کرنے میں کابڈن کے رفیق کار کی حیثیت سے خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ اسی تحقیقات کے اثنا میں جان برائیٹ نے ہندوستان کے معاملات پر ایسی مکمل اندرونی واقفیت حاصل کر لی تھی کہ مدت العمر اس کی تقریروں میں اس واقفیت کی جھلک نمایاں رہی

بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں 19 صدی کے وسط میں جان برائیٹ کی دار العوام میں وہی حیثیت تھی جو اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری قرون میں ایڈمنڈ برک کی تھی۔ ایک بہت بڑے زبردست مشرقی ملک کے حق میں انصاف کرنے کی ان دونوں نے کوشش کی تھی جس کی یاد چار دانگ عالم میں اس وقت بھی تازہ رہے گی جبکہ برطانوی شاہنشہی کا نام و نشان دنیا میں نہ رہے گا۔ اور ان کی مطبوعہ تقریریں انگریزی نثر کے بہترین نمونوں کی حیثیت سے اس وقت بھی زیر مطالعہ رہیں گی جبکہ غالباً موجودہ انگریزی زبان دنیا میں بولی نہ جائے گی۔

مجلس منتخبہ نے کپاس کی کاشت سے متعلق ابھی بہت زیادہ شہادت قلمبند کی نہ تھی کہ ہندوستان کی اراضی پر تشخیص لگان کے متعلقہ سوال پر بھی نظر ڈالنا اس کے لیئے ناگزیر بن گیا۔

فرانسیس ولیم پریدو نے جو اس وقت تنقیح مراسلات ہند کے صیغے میں ایک مددگار تھا مینچسٹر کے ایوان تجارت کی درخواست سے مالگزاری کے موضوع سے متعلق ذیل کی عبارت پڑھ کر سنائی۔ "وہ کپاس کی بہتر طریقے پر کاشت کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں محصول اراضی ہے یعنے وہ حقیت ہے جو اراضی کی بجائے قبضہ ہے نیز سڑکون اور ذرائع حمل و نقل کی غیر موجودگی۔ آپ کے سائلوں کا خیال یہ ہے کہ خود معزز مجلس کے یہ عقیدہ دل نشین ہے کہ ان مقامات میں جہاں فی زمانہ کپاس کی کاشت ہوتی ہے محصول اراضی بالکل ناقص ہے چنانچہ متعدد بار اصلاحیں شروع کی گئی تھیں مگر شروع کرنے کے ساتھ ہی موقوف کردی گئیں لیکن جب تک بمقابل دوسری چیزوں کی فصل کے کپاس کی فصل پر سنگین محصول لگانا ترک نہ کردیا جائے اور حقیت اراضی معقول اور واجبی اصول پر قائم کی جائے اس وقت تک اعلیٰ درجے کی روئی پیدا کرنے کی سب کوششیں جن سے اس کی ایسی قیمت آنے لگے کہ اور زیادہ کاشت کرنے کی لوگوں کو ترغیب ہو رائیگاں جائیں گی۔"

برطانوی صناعوں کا وہ زور چلا کہ انگلستان میں روئی کی برآمد پر سب

محصولات معاف ہو گئے چنانچہ ۱۸۳۶ء میں بنگالے کی روئی پر ۱۸۳۰ء میں بمبئی کی روئی پر اور ۱۸۴۴ء میں مدراس کی روئی پر کوئی محصول وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن مجلسِ نظماء نے کپاس کی ازدیاد کاشت کی لوگوں کو ترغیب دینے کی غرض سے محصول اراضی میں تخفیف کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر جان فوربز رایل نے شہادت دی۔ یہ شخص سہارنپور کے "نباتی باغ" کا نو سال[9] تک محافظ رہا تھا اور ۱۸۳۷ء میں اس نے "ہندی طب کی قدامت" پر ایک قابل قدر رسالہ بھی شائع کیا تھا جس میں قدمائے ہند کے علم کیمیا اور علم جراحی کے معلومات کے متعلق کہ وہ کیا تھے اور کس نوعیت کے تھے توضیح کی تھی۔ اس نے اپنی شہادت میں یہ بیان کیا تھا کہ لورپول میں سورت کی روئی بمقابل امریکہ کی روئی کے ۳۰ فی صدی سستی بکتی تھی اور ہندوستان کی روئی عموماً نہایت کثیف حالت ہی میں جہازوں پر لاد دی جاتی تھی۔ امریکہ کی کپاس ہندوستان میں جہاں سرخ مٹی ہو وہاں بہتر نشو و نما پاتی تھی اور ہندوستان کی روئی سیاہ مٹی میں۔ الاباما اور لوئیانہ نامی امریکہ کی ریاستوں میں فی ایکڑ چار سو پونڈ (وزنی) صاف روئی نکلتی تھی درآنحالیکہ ہندوستان میں سو یا ڈیڑھ سو پونڈ (وزنی) سے زیادہ نہیں نکلتی تھی۔ شمالی ہند میں ۱۸۳۳ء کے جدید بندوبست سے جس میں کاشتکاروں کو طویل المیعاد پٹے دئے گئے تھے کپاس کی کاشت میں بہت کچھ اضافہ ہوا تھا۔ ہندوستان میں بنولے نکالنے کی مشین رائج کرنا مناسب خیال کیا گیا تھا مگر امریکہ کی روئی سستے داموں ملتی تھی اس لئے مینچسٹر کے سوت کاتنے والے ہندوستان کی روئی کام میں لاتے تھے۔ ہندوستان کی روئی دو طریقوں سے انگلستان میں کام میں لائی جاتی تھی۔ ایک تو اس کے کپڑے بنے جاتے تھے دوسرے لحاف کی طرح ملبوسات میں وہ بھری جاتی تھی یعنے موسم سرما میں لوگ کوٹ کے استر میں روئی بھر کر پہنتے تھے۔ سال بسال انگریزی سوتی کپڑوں کی کی ہندوستان میں درآمد ترقی پر تھی اور ہندوستانی سوتی مصنوعات ایک ایک کر کے مفقود ہو رہے تھے۔

مینچسٹر کے ایوانِ تجارت کے ممبر مجلس مسمی ٹامس بیزلی نے ایک نقشہ پیش کیا تھا

جس میں امریکہ اور ہندوستان کی روئی کا انگلستان میں تناسب درآمد بتایا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جملہ برطانوی درآمد کے ساتھ ہندوستان کی روئی کا تناسب کم و بیش ۸ اور ۱۵ فی صدی کے درمیان تھا۔ ملکۂ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی تاریخ سے دس سال کے اعداد ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

انگلستان۔ اسکاٹلنڈ اور آئرلنڈ میں روئی کی درآمد

سنہ عیسوی	ممالک متحدہ امریکہ سے	برطانوی مشرقی مقبوضات سے
	پونڈ (وزنی)	پونڈ (وزنی)
۱۸۳۷	۳۲۰۳۵۱۷۱۶	۵۱۵۸۷۱۴۱
۱۸۳۸	۴۳۱۴۳۷۸۸۸	۴۰۲۲۹۴۹۵
۱۸۳۹	۳۱۱۵۹۷۷۹۸	۴۷۱۷۰۶۴۰
۱۸۴۰	۴۸۷۸۵۶۵۰۴	۷۷۰۱۰۹۱۷
۱۸۴۱	۳۵۸۲۱۴۹۶۴	۹۷۳۶۸۳۱۲
۱۸۴۲	۴۰۵۳۲۵۶۰۰	۹۶۵۵۵۱۸۶
۱۸۴۳	۵۵۸۷۳۵۶۰۰	۶۸۸۲۰۵۷۰
۱۸۴۴	۵۱۷۲۱۸۶۲۲	۸۸۶۳۹۶۰۸
۱۸۴۵	۶۲۶۶۵۰۴۱۲	۵۸۴۳۷۴۲۶
۱۸۴۶	۳۸۲۵۲۶۰۰۰	۳۴۲۷۰۸۰۰

اسی گواہ نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ سوت کاتنے والے کو ایک پونڈ (وزنی) سورت کی روئی سے ۱۲ اونس دھاگا ہاتھ آتا تھا مگر ایک پونڈ (وزنی) امریکہ کی روئی سے ۱۳½ اونس تاگا نکلتا تھا۔ اسی لیے موخر الذکر کی قیمت ۳½ اور ۶ پنس کے

مابین تھی جب کہ ہندوستانی روئی کی قیمت ۳ اور ۵ پنس کے درمیان تھی
ٹامس بیزلی نے اپنی شہادت کے آخر میں ہندوستان اور انگلستان کے مابین تجارت کے بارے میں ایک انگریز کا کیا خیال ہو سکتا ہے اس کی چند الفاظ میں یوں توضیح کی تھی کہ "ہندوستان کی عملداری بہت وسیع ہے اور برطانوی مصنوعات کی ایک کثیر مقدار ہندوستان کی آبادی اپنے صرف میں لاسکتی ہے ہماری ہندوستانی تجارت کے متعلق صرف سوال یہی ہے کہ ہم جو بھی اپنے مصنوعات بھیجنے کے لئے تیار رہیں کیا وہ لوگ ان کی قیمت اپنی پیداوار اراضی سے ادا کرنے کے قابل رہیں؟"

رابرٹ کرافرڈ نامی ایک تاجر ساکن بمبئی نے اس صوبے کے چند مقامات میں روئی کی کاشت کس قدر ہوئی تھی اس کے متعلق ۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۵ء تک ان بارہ سال کے اعداد پیش کیے تھے۔ بروچ میں روئی کی کاشت ان اراضی کی (جن پر مالگزاری مقرر تھی) جملہ کاشت کی ۳۴ فی صدی، سورت میں ۲۲ فی صدی، خاندیس میں ۱۰ فی صدی اور شولاپور میں ۳ فی صدی ہوئی تھی۔ گجرات میں مالگزاری کی نوعیت کے متعلق جب اس سے سوال کیا گیا تو اس گواہ نے یہ جواب دیا کہ "جب سرکار اور سرکاری عہدہ دار بالکل بجا طور پر اس بات کو قابلِ تعریف سمجھتے ہیں کہ حتی الامکان جس قدر محاصل ان کو مل سکتے ہیں اس قدر سب وصول کرلیں تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اراضی سخت سے سخت اور سنگین سے سنگین لگان پر ان کو دی جاتی ہے" اور اس گواہ نے مسٹر ڈیویس کلکٹر بروچ کی رپورٹ سے ذیل کا اقتباس پڑھ کر سنایا۔ "بدنصیبی سے منڈی کی موجودہ حالت ایسی ہے کہ کاشتکار اپنے سرمایے کی تلافی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ منافع کی توقع کرے۔ لہٰذا اس سے یہ استنباط بالکل بدیہی ہے کہ کاشتکار تباہی سے بچنے کے لئے بالکلیہ معافیات یا پیداوار کی فاضلات پر انحصار کرتا ہے"

اسی گواہ نے "قوانین جہاز رانی" کے برے اثرات کو جن کی رو سے جہازوں پر انگریز ملاحوں اور خلاصیوں کے سوا دوسری قوم کے افرادِ ملازم نہیں رکھے جاسکتے تھے اپنی شہادت میں بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ "مجھ کو معلوم ہے کہ بعض وقت ایسا بھی

ہوتا ہے جب بندرگاہ بمبئی کے کسی جہاز کے لیے یہی باعث سہولت تھا کہ وہ ہندوستانی خلاصیوں کے ساتھ اس ملک کو آئے بشرطیکہ اس کو بھی بحر و بندرگاہ میں وہی حقوق و مراعات حاصل رہیں جو ایک انگریزی جہاز کو حاصل ہیں۔"

ایک اور بہت ہی اہم گواہ میجر جنرل برگز تھا۔ ۱۸۱۸ء میں یہ کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوا تھا اور تینتس ۳۳ سال تک ہندوستان میں کارگزار رہا تھا۔ سر جان میلکم اور ماونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کے سے اشخاص کے زیر حکم رہ چکا تھا اور میسور کا کمشنر اور ناگپور کا ریذیڈنٹ بھی رہا تھا۔ اس نے "مالگزاری ہند" پر ایک نہایت قابل قدر اور مکمل کتاب لکھی تھی اور شمالی ہند کے بندوبست میں لارڈ ولیم بنٹنک کا مشیر بھی رہا تھا۔ تاریخ ہند کا مطالعہ اس نے اصل ماخذ ہی سے کیا تھا۔ اور تاریخ فرشتہ کا ایک ایسا عالمانہ ترجمہ کیا تھا جو آج تک مسلمہ ہے۔

میجر جنرل برگز نے ہندوستان میں روئی کے صرف کثیر کا ذکر کیا اور کہا کہ "تمام دنیا کے صرف کے لئے روئی کافی مقدار میں پیدا کرنے کی" اس ملک میں صلاحیت ہے اس کے خیال میں انگلستان کو اور زیادہ مقدار میں روئی برآمد ہونے میں دو رکاوٹیں تھیں ایک تو محصول اراضی اور دوسرے حمل و نقل کے لئے سڑکوں کا نہ ہونا۔ مقدم الذکر موضوع پر اس سے سوال کیا گیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ "ہندوستان کا محصول اراضی نیز تمام دیگر بلا واسطہ محصولات سب محصول آمدنی کے اصول ہی پر مبنی ہیں آمدنی کا ایک جز جنس کی شکل میں ہو کہ زر کی حسب معمول فرمان روا کا حق سمجھا جاتا ہے" اور ہندوؤں کے عہد حکمرانی میں یہ جز ابتداءً پیداوار کا عشر مقرر کر دیا گیا تھا۔"

شمالی ہند کا بندوبست جس کو لارڈ ولیم بنٹنک نے ۱۸۳۳ء شروع کیا تھا ایسا تھا کہ رعایا کے ادارے اس سے محفوظ ہو گئے تھے اور اگر اس کو دوامی کر دیا جاتا تو اس سے سرکار اور کاشتکار دونوں کو فائدہ پہنچتا۔" برخلاف اس کے مدراس کے بندوبست میں سر ٹامس منرو کے ۱۸۲۷ء میں تخفیف محصول کے بعد بھی حد سے زیادہ محصول تھا۔ سرکاری مطالبہ نہ تو پورا ادا کیا جا سکتا تھا اور نہ کیا جاتا تھا۔ کلکٹر کی قوت تمیزی پر اس بات کا انحصار تھا کہ وہ جو مناسب سمجھے وصول کرے۔

اور جب اس طرح کلکٹر کی قوت تمیزی پر اس کا انحصار رہے تو اس کے یہ معنے ہوئے کہ ذیلی عہدہ داروں کے ایک انبوہ کثیر کی (جو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک پھیلے ہوئے تھے) قوت تمیزی پر در اصل اس کا انحصار تھا"۔ معینہ محصول اراضی کبھی پورا ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر سال معافیات ہوتے تھے اور کسانوں کی حالت مفلس و نادار کی سی تنگی تھی"۔

جنرل برگز نے لگان بہ شکل غلہ لینے کی پُرزور سفارش کی یعنے محصول اراضی ہر سال اسی سال کی پیداوار پر مبنی ہو اور اس کی رائے یہ تھی کہ اس قاعدے کے تحت رعیت واری نظام کارآمد رہ سکتا ہے۔ اور یہ پیداوار کا ۵۰ فی صدی فاصلات پیداوار یا خالص پیداوار سے بشرطیکہ غلے کی شکل میں یہ وصول کیا جائے کچھ زیادہ نہیں ہے "لیکن یہ محصول چونکہ بہ شکل زر وصول کیا جاتا ہے اس لئے اکثر اس کو جملہ پیداوار کے مساوی ہی سمجھنا چاہیئے"۔

"ٹامس وِلیمسن نے جو بمبئی کا کمشنر مالگزاری رہ چکا تھا انگریزوں کے نظام مالگزاری پر سنگین ترین الزام لگایا تھا کہ صرف ایک شخص یعنے محصول اراضی معین کرنے والے کلکٹر کی مرضی اور رجحان طبع پر ساری قوم کی خوشحالی کا انحصار تھا اور اس نے کہا کہ "ضلع بھر کی خوشحالی صرف اس عہدہ دار کی ذاتی قابلیت پر منحصر تھی جس کے زیر انتظام یہ ضلع ہوتا تھا"۔ اضلاع کے کلکٹر ہمیشہ مکمل اور بامروت انسان نہیں ہوتے تھے چنانچہ زمانۂ حال تک گجرات پر نہایت سنگین محصول لگادیا گیا تھا اور اراضی کی ترقی بالکل مسدود ہوگئی تھی۔ بروچ میں بہت بڑا بقایا قابل وصول تھا۔ معافیات محض ذاتیات اور عہدہ داروں کی مرضی پر موقوف تھے اور مالگزاری کی رقم مختلف قسم کی بددیانتیوں سے متاثر ہوتی تھی۔ رعایا عموماً نہایت ہی مفلس و بے مایہ ہوگئی تھی۔ ان کا زرعی سرمایہ بہت ہی کم رہ گیا تھا اور روئی کی پیداوار بھی کم ہوگئی تھی۔ "بے حساب محصول لگادینے کے عام نتائج اور آثار یہ ہی تو ہیں"۔

جورج گبرن گجرات کا کلکٹر رہ چکا تھا اور ۱۸۲۶ء میں ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ۱۸۴۱ء میں بہ حیثیت جڈیشل کمشنر اس ملک کو واپس آیا تھا۔ چودہ سال منقضی ہونے کے بعد بھی اس نے لوگوں کی حالت میں کوئی اصلاح نہیں دیکھی

بلکہ اس کو یہی نظر آرہا تھا کہ "دولتمندوں پر زوال آگیا تھا" اور عام طور پر بہت زیادہ محصول لگا دیا گیا تھا۔ "ان تمام مقامات میں جہاں میں بہ حیثیت کلکٹر رہ چکا ہوں رعیت کے لیے کچھ نہیں بچا کہ پس انداز کیا جائے یا رعیت اصلدار بن جائے۔"

اس گواہ سے یہ پوچھا گیا کہ "کیا آپ ان مقاموں سے بھی واقف ہیں جہاں سنگین محصول لگا دینے سے بادی النظر میں کاشت کم ہو گئی ہے"؟ تو اس نے یہ جواب دیا کہ "میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھکو ایک بھی ایسا مقام معلوم ہے۔ جس مقام کو دیکھئے وہ ترقی کرنے کے بجائے جہاں تھا وہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ رعیت کو کچھ منافع بھی نہ ملے تو کاشت کرتے رہنے کے سوا ان کو چارہ ہی کیا ہے؟ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی تو پرورش کے لئے کاشت کرنا ان کے لئے ضروری ہے وہ اپنے دیس یا گاؤں سے جس کے وہ باشندے ہیں ایسے وابستہ ہیں کہ ایک پائی کے فائدے کے بغیر وہ سرکاری لگان ادا کرنے ہر وقت تیار رہیں بشرطیکہ ان کو اتنا مقدور بھی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ کہیں بھی ترقی کے آثار نمایاں نہیں۔"

فرانسس کارنک براؤن کے والدین انگریز قوم کے تھے مگر اس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی اور اس کو بھی اپنے والد کی طرح ہندوستان کی سوتی صنعت وحرفت کا بہت بڑا تجربہ تھا۔ اس نے مجلس منتخبہ کے سامنے ایک ہندوستانی چرخہ پیش کیا اور یہ توضیح کی کہ صنعت گروں کے ہر چرخے۔ ہر گھر اور ہر دروازے پر نہایت ہی تکلیف دہ "مترفہ محصول" تھا اور اس کی وجہ سے ہندوستان میں بنولے نکالنے کی مشینیں رائج نہیں کی جا سکتی تھیں۔

فرانسس براؤن روئی کی کاشت کے ہندوستانی نظام کے متعلق بڑی اعلےٰ رائے رکھتا تھا چنانچہ اس نے یہ کہا تھا کہ ہندوستانیوں کو اس فن کے سکھانے کے لئے امریکہ سے کھلبندوں کو بلانا ایسا ہی تھا جیسے گیہوں کی کاشت انگریز زمینداروں کو سکھانے کے لئے بلجیم سے کاشت کاروں کو طلب کرنا۔ اس نے اپنی اس رائے کی تائید میں امریکہ کے ایک کھلبند مسمی مرسر کی شہادت پیش کی تھی جو روئی کی کاشت کو ترقی دینے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۵ء کے درمیان مسٹر مرسر نے یہ بیان کیا تھا کہ "حکومت بمبئی کی گشتی مورخہ ۲۸ جنوری ۱۸۴۱ء سے ذیل کی عبارت نقل

کی گئی ہے) "سرکار نے تجربہ کی غرض سے روئی کی کاشت کے لئے اراضی اور عملہ کیا مختص کیا دراصل اپنا روپیہ رائگاں کیا امریکہ کا نظام ہندوستان کے مناسب حال نہیں ہے۔ اور خود دیسیوں کو ہندوستان کی آب وہوا اور زمین کی قوتِ نمو کے متعلق ایسے اچھے معلومات ہیں کہ وہ بمقابل کسی یورپی شخص کے زیادہ کفایت اور عمدگی کے ساتھ یہ کاشت خود کر سکتے ہیں"

تشخیص مالگزاری کے متعلق فرانسیس براون کی شہادت نہایت زوردار تھی مدراس میں کاشت کار کو "مالگزاری ادا کرنے کے بعد قوت بسری سے زیادہ کچھ نہیں بچتا تھا" ایسے لکھو کھا کاشت کار مدراس میں تھے جن کو سدِ رمق یا قوت بسری سے بڑھ کر کچھ نہیں ملتا تھا مقتضائے فطرت اور اسباب معیشت کی محتاجی سے ان کو مجبوراً کاشت کرنی پڑتی تھی اور جہاں وہ اپنے قدم گاڑتے تھے وہیں کے ہو جاتے تھے۔ اور سرکاری مالگزاری سے انہیں کہیں مفر ہی نہ تھا ان پر محصول اراضی اس قدر زیادہ لگا دیا جاتا تھا کہ وہ کبھی پورا نہیں ادا کر سکتے تھے اس گواہ نے یہ بھی کہدیا کہ "مجھ کو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دیسی لوگ ہمیشہ ایسی مخلوق متصور ہوتے ہیں جو صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبات ادا کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہو"

جب فرانسیس براؤن پر حکومت ہند کے خلاف ایسی نکتہ چینی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ تو اس نے یہ جواب دیا کہ "میرا منشا ایسٹ انڈیا کمپنی کو محض بدنام کرنا نہیں ہے مگر ملک کی حالت بھی تو دیکھئے اور میرا کہنا یہ ہے کہ ایک انگریز کی آنکھوں سے اور ایک انگریز ہی کے فہم و ادراک اور ایمانداری کے ساتھ دیکھئے اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے بارے میں فیصلہ کیجئے .... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے ملیبار میں بچشم خود لوگوں کو مرتے دیکھا ہے اور حکومت کی زیر کارروائی ملک کو فلاکت میں گرفتار دیکھا ہے .... عام طور پر ملک کی حکومت رعایا میں افلاس و ناداری و ذلت خواری ہی پھیلا رہی ہے"

امریکہ کے نظام اراضی کا جس کے تحت روئی کی کاشت پھیلائی جا رہی تھی ہندوستان کے نظام اراضی کے ساتھ جس کے تحت روئی کی کاشت جس قدر برآمد کرنے کی غرض سے کی جاتی تھی گھٹ رہی تھی مقابلہ کرنے کے بعد اس گواہ نے کہا کہ

"امریکہ میں اراضی ڈالر کو ایک ایکڑ کے حساب سے فروخت کیجاتی ہے اور خریدنے والے کو ساتھ ہی ساتھ اراضی کے متعلق آیندہ کچھ دینے دلانے سے "معافی دوام" مل جاتی ہے اور اس کے بعد اس پر کسی قسم کی زیر باری عائد نہیں ہوتی دراصل روئی کی پیداوار کی وجوہ محرک یہی باتیں تو ہیں لیکن ہندوستان کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے یہاں حق مالکانہ ہے ہی نہیں اسی لئے کسی شخص کو اپنے فائدے کے لئے یہاں کاشت میں روپیہ لگانے اور حتی الامکان محنت و جانفشانی کرنے کی ترغیب نہیں ہوتی"۔

فرانسیس براون اس لئے بھی قابل ستائش ہے کہ یہ پہلا شخص تھا جس نے ہندوستان کے جنگلوں کے اتلاف کی بناء پر قلت بارش کے خطرے سے آگاہ کیا اس وقت اس بات کا کوئی سمجھنے والا نہ تھا اس لئے اس گواہ نے بیرن ہمبولٹ کی آپنی کہانی" سے ذیل کا فقرہ پڑھکر سنایا۔ "پہاڑوں کے دامن میں اور ان کی چوٹیوں پر جو درخت اُگتے ہیں ان کی بیخ کنی سے ہر ملک میں انسان آیندہ نسلوں کے لئے دو طرح کی آفتیں پیدا کرتا ہے ایک تو ہیزم سوختنی کی محتاجی اور دوسرے پانی کی قلت۔

ہندوستان کے قدیم ذرائع آبپاشی کے متعلق فرانسیس براون نے کہا کہ "تمام جنوبی ہند میں گنجم سے لیکر راس کامورن تک ایسے ایسے تالابوں کے نشان جگہ جگہ نظر آتے ہیں جنکے دیکھنے سے عقل دنگ رہ جاتی ہے"۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے سوائے تنجور کے جہاں آبپاشی کے مفید ترین نتائج ظہور پزیر ہوئے تھے کہیں بھی ان قابل قدر ذرائع آبپاشی کی نگہداشت نہیں کی میجر آرتھر کاٹن نے کمپنی کی حکومت کو متعدد بار ذرائع آبپاشی کی اہمیت سے آگاہ کیا تھا مگر محض بے سود اور فرانسیس براون کا خیال تھا کہ آبپاشی کے ذریعہ سے ہندوستان کا بہت سا حصہ مصر کی وادئ نیل کی طرح سرسبز و شاداب ہو سکتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظماء بلاشک وشبہ فرانسیس براؤن کو آگ لگانے والا نہ سہی تو ایک جوشیلا آدمی تو سمجھتے تھے لیکن نصف صدی سے زیادہ مدت کے بعد اب کوئی بھی اس شہادت کو پڑھ کر انکار نہیں کر سکتا کہ اس تیز نظر انگریز نے جس کی پیدائش اور تربیت ہندوستان ہی میں ہوئی تھی ان بعض بڑی بڑی خرابیوں کو اس وقت تاڑ لیا تھا جب کہ ہندوستان کے منتظمین مملکت ان کو محسوس نہیں کر سکتے تھے یا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ بھی قرین قیاس نہ تھا کہ ہندوستان کے سرکاری عہدہ دار فرانسیس براؤن کے سے شخص کی شہادت پر اعتراض کرنے کے بغیر خاموش

بیٹھے رہیں گے مسٹر براؤن کی شہادت پیش ہونے کے تین ہی دن بعد راس منگل نے جو حکومت ہند کا معتمد مالگزاری رہ چکا تھا اور اس وقت پارلیمنٹ کا رکن اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناظم بھی تھا اظہار دینے کیلئے خود کو پیش کیا اس زمانے میں غالباً انگلستان میں کوئی اور شخص ایسا نہ تھا جو کمپنی کے انتظامِ مالگزاری کی ایسی پیچ کرسکتا جیسی منگل کرسکتا تھا۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کی شہادت پڑھے اور اس کے یقین کامل کے جذبے اور اظہار خیالات کی صفائی کو محسوس نہ کرے۔ مگر بایں ہمہ راس منگل ہندوستان کی مالگزاری کے صرف نظریہ کی پیچ کرسکا کیونکہ اس کی عملی خرابیوں سے درحقیقت اس سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا۔

منگل نے بیان کیا کہ صوبہ بنگالہ میں جہاں دوامی بندوبست تھا زمیندار لوگ جو مالگزاری سرکار کو ادا کرتے تھے وہ اوسطاً ان کی جاگیروں کے لگان کی تقریباً نصف ہوتی تھی ان خطوں میں جہاں دوامی بندوبست نہ تھا سرکاری مطالبہ لگان کا ۷۵ فیصدی ہوتا تھا۔ مدراس میں رعیت ہی مالک اراضی بھی تھی اور سرکار کو براہ راست مالگزاری ادا کرتی تھی لیکن رعیت واری نظام میں خرابی یہ تھی کہ دوامی مداخلت اور ہر سال تشخیص لگان ہوتا تھا۔ اس سے رشوت ستانی و استحصال ناجائز اور ظلم کا ایک رستہ پڑ گیا تھا۔

شہادت دینے کے دوسرے روز راس منگل کی جان برائیٹ صدر نشین مجلس منتخبہ اور جورج ٹامسن رکن مجلس کے ساتھ بڑی بحث ہوئی جس کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

جورج ٹامسن۔ کیا آپ یہ ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں کہ کسی حکومت کا خواہ وہ انگریزوں کی ہو یا کسی اور کی ہندوستان کی اراضی پر اگر سارے ہندوستان پر اسی حکومت کا تسلط مان لیا جائے تو مالکانہ حق رکھنے کا دعویٰ کرنا اخلاقی وجوہ سے بالکل درست ہے؟

راس منگل۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ سوال مالگزاری سے متعلق ہے۔ میں نے کبھی یہ نہ تو فرض کیا ہے اور نہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں حکومت ہی اراضی کی مالک تھی اور نہ میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ ہندوستان میں حکومت ہی اراضی کی مالک ہے۔

جورج ٹامسن۔ کیا درا صل یہ واقعہ نہیں کیونکہ ملک اس سرے سے اس سرے تک اراضی کے فطری لگان کے ۷۵ فی صدی کا مطالبہ حکومت اپنے اوپر فرض سمجھتی ہے۔

راس منگل۔ خارج از حافظہ زمانے ہی سے لگان کا ایک حصہ سرکاری اغراض کیلئے حق سرکار سمجھا جاتا ہے

جان برائیٹ۔ کلکٹروں کے ذریعہ لگان وصول کرنے کے طریقے کے متعلق کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں

کہ بالفرض اراضی کے ایک مختص ٹکڑے کی پیداوار ۱۰۰ اہوتی ہو تو آیا کوئی معینہ تناسب ایسا ہے جس کے لحاظ سے کلکٹر بطور مالگزاری سرکاری رقم کی ایک خاص تعداد مقرر کر دینے کا مجاز سمجھا جاتا ہے یا نہیں ؟

راس منگل بیں نے اس سے پہلے مجلس کے سامنے اس کی توضیح کر دی ہے کہ چند سال سے پیداوار کے اصول پر بندوبست کرنا نہایت خطرناک ثابت ہو رہا ہے اسی لئے کلکٹروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ہر موقع پر وہ لگان معلوم کرنے کی کوشش کریں اور بندوبست کے لئے اسی کو اپنا اصول قرار دیں۔

جان برائیٹ۔ اگر تشخیص مالگزاری ہر سال کی جاتی ہے جیسا کمپنی کی زیر حکومت ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں ہوتا ہے تو پھر ایسی صورت میں کہ کاشتکار نے خود ترقی و اصلاح کی ہو کیا مالگزاری میں اضافہ اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ کاشت میں اور بھی ترقی و اصلاح ہو یا اس مقصد سے کہ ترقی و اصلاح کرنے کے لئے کاشتکار کی ہمت پست ہو جائے ؟

راس منگل۔ مقتضائے فطرت تو یہی ہے کہ اس سے پست ہمتی پیدا ہو گی ہیں بھی اس سالانہ تجدید بندوبست کے اسی قدر خلاف ہوں جس قدر معزز صدر نشین صاحب خود ہو سکتے ہیں۔

یہ رد و قدح اس لئے اہم ہے کہ اس سے ان اصول پر روشنی پڑتی ہے جن کو ۱۸۵۳ء ہی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔

(۱) حکومت نے مالکِ اراضی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ زمیندار و رعیت ہی مالکِ اراضی تسلیم کیجاتی تھی۔

(۲) حکومت صرف لگان کے ایک حصے کا بطور مالگزاری مطالبہ کرتی تھی۔

(۳) یہ حصہ معیّن نہ تھا۔ ان جاگیروں میں جہاں دوامی بندوبست ہو چکا تھا مطالبۂ سرکار لگان کا نقصف رہا۔ ۵ فی صدی اور جہاں دوامی بندوبست نہیں ہوا تھا وہاں قریب قریب ۷۵ فی صدی ہوتا تھا۔

باقی باتوں میں راس منگل بھی جان اسٹوارٹ مل کا ہم خیال تھا یعنے ہندوستان کی مالگزاری جزو لگان ہونے کی وجہ سے پیداوار اراضی کی لاگت میں شامل نہ تھی اس لئے روئی کی کاشت کی یہ بالکل مانع نہ تھی۔

جان سلیون نے بھی جو مدراس میں ایک محکمے کا وزیر اور مجلس مالگزاری کا میر مجلس رہ چکا تھا ہندوستان کے نظام مالگزاری کی تائید کی مگر ہندوستان سے سالانہ جو معاشی نقصان ہوتا تھا اس کا وہ شاکی تھا۔ "موجودہ نظام مالگزاری کے متعلق اہل ہند کو جو شکایت ہے وہ میرے خیال میں اس لئے نہیں ہے کہ مالگزاری کی رقم اس قدر زیادہ ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس رقم کا مصرف موجب تکلیف ہے۔ ان کے اپنے بادشاہوں

کے عہد حکومت میں ضمناً محاصل ملک سے وصول ہوتا تھا وہ سب کا سب ملک ہی میں صرف ہوتا تھا لیکن ہماری حکومت میں محاصل کا بہت بڑا حصہ بلا کسی معاوضے کے ہر سال ملک سے سوت لیا جاتا ہے۔ اور دولت کا یہ سوتا ساٹھ ستر سال سے جاری ہے اور بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے .... ہمارا انظام اسفنج کا کام کرتا ہے یعنے لب گنگا اچھی اچھی چیزیں پانی کی طرح چوس لیتا ہے اور دریائے ٹمز پر پہنچکر پانی ہی کی طرح ان کو نچوڑ دیتا ہے ..... آنکو (ہندوستان کے لوگوں کو) محصولات لگانے میں جن کے ادا کرنے کا ان سے مطالبہ ہوتا ہے رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے ان کو قانون وضع کرنے میں بھی جس کی تعمیل ان پر فرض ہے رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ خود ان کے ملک کے نظم و نسق میں ان حقیقی طور پر شریک نہیں کیا جاتا اور ان سب حقوق سے ان کو اس تہتک آمیز و گستاخ حیلے سے محروم کردیا جاتا ہے کہ ایسے فرائض کی انجام دہی کے لئے ان کے دماغی اور اخلاقی قوی درست نہیں ہیں۔

باقی دوسرے گواہوں کی شہادت کم اہم ہے اس لئے یہاں اس کی تشریح غیر ضروری ہے۔ مجلس منتخبہ کے سامنے کس نوعیت کی شہادت پیش ہوئی تھی اس کے معلوم کرنے کے لئے یہاں تک جو کچھ قلمبند ہوا وہ کافی ہے۔ اس شہادت پر جان برائٹ اور اس کے رفقائے کار نے ۷ اجولائی ۱۸۴۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کردی۔

اس رپورٹ میں انھوں نے بیان کیا تھا کہ ساٹھ سال تک یعنے ۱۷۸۸ء سے مجلس نظما نے روئی کی کاشت پھیلانے اور اس کی برآمد میں اضافہ کرنے کے لئے ہندوستان میں مختلف تجربے کیے تھے۔ امریکہ سے مشینیں منگوائی تھیں۔ اور وہیں سے روئی کے کاشتکاروں کو بھی ہندوستان بھیجا تھا اور اسی غرض سے تجربے کے لئے کچھ اراضی بھی مختص کردی تھی۔ اب بھی نظما کو یہی یقین تھا کہ ہندوستان میں روئی کی کاشت میں جو کچھ بھی رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوسکتی ہیں۔

ان تجربات کے نتائج دیکھ کر مجلس منتخبہ کو اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ ہندوستان ایک غیر محدود مدت تک بہت اچھے درجے کی روئی کی سربراہی کرسکتا ہے لیکن

اس مجلس کی رائے میں جو ذرائع کہ اختیار کیے گئے تھے اُن سے اس کام کے سرانجام کی توقع نہ تھی۔ امریکہ کی روئی جن کا تار لمبا ہوتا تھا ہندوستانی مصنوعات کے لئے ایسی موزوں نہ تھی جیسی خود ہندوستان کی روئی تھی اور غیر ممالک کے مطالبے کی ہر وقت کی کمی و بیشی ایک نئی قسم کی روئی کی کاشت کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں سمجھی جاتی تھی بالخصوص جبکہ اس کا منشاء دور و دراز بدیسی منڈیوں کی سربراہی کرنا تھا۔

ہندوستان کے کاشتکاروں کی خستہ حالی پر بھی مجلس منتخبہ نے توجہ مبذول کی۔ مدراس اور بمبئی میں کثیر التعداد کاشتکاروں کے پاس وہ کچھ سرمایہ نہ تھا اور نہ وہ ذرائع اُن کو حاصل تھے جو صرف سرمائے ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں اور جن سے حرفت میں نئی نئی اصلاحیں کی جا سکتی ہیں اور اس کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ درحقیقت کاشتکاروں کے اس طبقے کی بہت ہی بری حالت ہے۔"

اس سوال پر کہ کاشتکاروں کی خستہ حالی کس حد تک سرکار کے مطالبۂ مالگزاری کا نتیجہ ہے اختلافِ رائے تھا۔ ایک طرف تو یہ اصول پیش کیا گیا تھا کہ جب تک مطالبۂ سرکار معاشی رگان کے ایک جز تک محدود رہتا ہے اس وقت تک کاشتکاروں پر کوئی ایسا خراب اثر نہیں پڑتا جس سے ان کا افلاس بڑھے۔ دوسری طرف یہ شہادت پیش ہوئی تھی کہ انھیں مقامات کا انتظام عملی طور پر خراب تھا جن کی آبادی بہت بڑی تھی اور جو صرف ایک عہدہ دار کی زیر نگرانی تھے۔ اور یہ کہ ناعاقبت اندیشانہ جوشِ کارگزاری یا عدم کارگزاری یا سنگین غلطیوں ہی سے ان مقامات کی خوش حالی پر مضر اثر پڑا تھا اور یہ کہ "دراصل یہ نظام اگر سراپا زرعی آبادی کے لئے اصلاح کی امنگوں کا ناس کرنے والا نہیں تو کم سے کم ہمت پست کرنے والا تو ضرور تھا۔"

"مطالبہ سرکار میں اعتدال پیش نظر رکھنا اور رقم مالگزاری اور حقیت اراضی بالکل معیّن کر دینا" ان ہر دو اصول کو ہندوستان کے بندوبست اراضی کی بنیاد بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔

آخر میں مجلسِ منتخبہ نے ہندوستان میں سڑکوں کی ضرورت اور ان کے نہ ہونے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خود اس سنگل کی (جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناظم

تھا) شہادت کا حوالہ دیا جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ اندرونی ذرائع آمدورفت کی اصلاح وترقی کے لئے کس قدر کم کام ہوا تھا اور کس قدر باقی تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے گواہوں نے درآمد و برآمد کے مرکزوں سے اندرون ملک آمدورفت کے لئے ریلیں بنانے کی بھی سفارش کی تھی۔

نواں باب

چائے ۔ نمک اور افیون

جان برائیٹ نے ۱۸۴۸ء میں رپورٹ پیش کردی۔ اس کے پانچ سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا منشور تجدید کے لیے پیش ہوا اور حسب معمول دارالامرا اور دارالعوام دونوں کی مجالس منتخبہ نے ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۳ء میں کمپنی کے نظم ونسق ہند کی مکمل تحقیقات کی جب ہم کمپنی کے عام نظم ونسق سے بحث کریں گے اس وقت اس تحقیقات کا حوالہ بھی دیں گے۔ سردست اس تحقیقات کے اثناء میں چائے۔ نمک اور افیون کی پیداوار کے متعلق جن دلچسپ واقعات کا انکشاف ہوا تھا ان کو اس باب میں ہم بیان کرتے ہیں:-

چائے

چائے کی کاشت پر اہم ترین شہادت "نباتی باغ" سہارنپور کے محافظ مسمی ڈاکٹر رائل کی تھی جس نے روئی کی مجلس منتخبہ کے سامنے بھی (جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے) شہادت دی تھی۔ اس نے ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۲ء میں حکومت ہند کے پاس چائے کی کاشت کرنے کی سفارش کی تھی۔ حکومت ہند نے ۱۸۳۵ء میں اس کاشت کی ابتدا کی

اور سب سے پہلے ۱۸۴۲ء میں چائے کی پتی بنائی گئی۔ اس گواہ کی شہادت کے وقت دسمبر ۱۸۵۳ء میں ہمالیہ کے شمالی مغربی حصے میں اور آسام میں بھی اس سرے اس سرے تک چائے کی کاشت بڑے پیمانہ پر ہو رہی تھی۔

اب تک تو ..... پونڈ (وزنی) سے زیادہ چائے کوماؤں میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر کاشت پھیل رہی تھی کیونکہ وہ سب پہاڑی علاقہ جو سکم سے لیکر نیپال اور کوماؤں ہوتے ہوئے وادی کنگرا تک پھیلا ہوا تھا چائے کی کاشت کے لیے بہت موزوں تھا۔ ڈاکٹر جیمسن نے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی یہ کام لے رہی تھی اطلاع دی تھی کہ جیسا وادی کنگرا میں چائے کا پودا سرسبز و شاداب ہوتا ہے ویسا کسی اور زمین پر نہیں ہوتا .... ہندوستانی عموماً چائے استعمال نہیں کرتے۔"

حکومت ہند نے آسام میں چائے کی کاشت کا سب کاروبار ایک کمپنی کے تفویض کر دیا تھا ایک اور کمپنی کوماؤں میں چائے کی تمام کاشت حکومت سے خرید لینے کی تجویز کر رہی تھی۔

نمک

ہندوستان میں کمپنی کے ذرائع آمدنی میں نمک اور افیون کا اجارہ کچھ کم اہم نہ تھا۔ کمپنی کے کارپرداز اور گماشتے نمک لیتے، نمک بناتے اور فروخت کے لئے منڈی میں بھیجنے سے پہلے اس کی اصل لاگت پر ۵ شلنگ فی من (۸۲ سیر) محصول لگا دیتے تھے۔ پنجاب کی کانوں سے جو نمک نکلتا تھا اس پر ۴ شلنگ فی من محصول لیا جاتا تھا اور دیسی ریاستوں میں جو نمک بنتا تھا اس پر انگریزی عملداری میں داخل ہونے کے وقت ۴ یا ۵ شلنگ محصول وصول کیا جاتا تھا۔

مدراس میں دریا کے کنارے ایک مقام پر آب شور جمع کر کے حرارت آفتاب سے بخارات بنکر اڑ جانے کے لئے اس کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس طرح جو نمک بنتا تھا وہ بنگالی نمک سے سستا بھی ہوتا تھا اور فی من ۲ شلنگ کے حساب سے اس کو بیچنے سے کمپنی کو خوب آمدنی بھی ہوتی تھی۔ بمبئی میں فی من ڈیڑھ شلنگ محصول ادا کرنے

پر نمک سازوں کو خاص قسم کے اُتھلے برتنوں میں سے جس میں وہ بنتا تھا نمک نکال لینے کی سرکار اجازت دیتی تھی۔ انگلستان یا دوسرے ممالک سے ہندوستان کو جو نمک آتا تھا اس پر فی من ۵ یا ۶ شلنگ محصول لیا جاتا تھا تاکہ بازار میں اس کی قیمت ہندوستانی نمک کی قیمت سے جس پر محصول تھا کم نہونے پائے۔

نمک سازی سے کمپنی کو جو ۱۷۹۳ء میں ......۰ پونڈ خالص آمدنی ہوئی تھی وہ بڑھکر ۱۸۴۴ء میں ......۱۳۰۰۰۰ پونڈ ہوگئی تھی اور اس باون (۵۲) سال کی مدت میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس قدر نمک بنایا تھا اس کا تخمینہ بیس کروڑ من سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور اس نمک سے جس قدر آمدنی ہوئی تھی اس کا اندازہ چھ کروڑ پونڈ انگلیسیہ کیا جاتا ہے۔

مذکورالصدر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جس قدر نمک کمپنی خود بناتی تھی اور جس قدر برطانیۂ عظمیٰ سے ہندوستان میں درآمد کرتی تھی ان دونوں میں ایک توازن قائم رکھنے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ اس حکمت عملی کی بانی دراصل دارالعوام کی مجلس منتخبہ تھی جس نے ۱۸۳۶ء میں اس طرح عمل کرنے کی تجویز منظور کی تھی اور کمپنی فقط اسی حکم کی تعمیل کر رہی تھی لیکن اس اصول پر عمل کرنے میں کمپنی نے اس حکم سے بطور خود کسی قدر تجاوز بھی کیا تھا جس سے برطانوی نمک سازوں کو ناجائز مگر مفید مطلب موقع ہاتھ آگیا تھا کیونکہ کمپنی نے اصل لاگت میں محاصل کی وصولیابی اور تامین کے مصارف بھی لگا دیے تھے اور اس طرح بنگالی نمک کی قیمت فروخت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس سنگین غلطی سے برطانی نمک سازوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور برطانوی نمک کی فروخت دن دونی رات چوگنی ہونے لگی۔ دوگواہوں نے جن کو ہندوستان میں برطانوی نمک کی فروخت سے خاص دلچسپی تھی مجلس منتخبہ کے سامنے ذیل کے اعداد پیش کیے تھے:-

برطانوی نمک جس کی درآمد کلکتے میں تھی						
۱۸۴۵ء-۱۸۴۶ء	۱۸۴۶ء-۱۸۴۷ء	۱۸۴۷ء-۱۸۴۸ء	۱۸۴۸ء-۱۸۴۹ء	۱۸۴۹ء-۱۸۵۰ء	۱۸۵۰ء-۱۸۵۱ء	۱۸۵۱ء-۱۸۵۲ء

من (۱۴) سیر	من (۱۴) سیر	من (۱۴) سیر	من (۱۴) سیر	من (۱۴) سیر	من (۱۴) سیر	من (۱۴) سیر
۵۰۲۱۶	۳۵۲۸۳۵	۷۵۲۹۹۸	۴۵۹۸۰۳	۶۹۴۴۴۷	۱۰۱۲۶۹۸	۱۸۵۰۷۶۲

برطانوی نمک جس کو ہندوستان ارسال کیا گیا تھا

سنہ ۱۸۴۷ء	سنہ ۱۸۴۸ء	سنہ ۱۸۴۹ء	سنہ ۱۸۵۰ء	سنہ ۱۸۵۱ء
ٹن	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن
۲۵۷۵۴	۱۵۵۰۷	۲۷۶۴۰	۳۶۳۴۱	۶۱۷۱۱

برطانوی نمک کی درآمد میں اتنا بڑا اضافہ جو ہوا تو بنگالے کی مجلس مالگزاری پریشان ہوگئی اور اس نے ایک طول طویل مگر نہایت ہی سنجیدہ مراسلہ لکھا جس میں بنگالی نمک کی اصلی لاگت میں مختلف مصارف شامل کر کے جو درحقیقت لاگت کے جزو نہ تھے اس کی قیمت میں اضافہ کرنے کی ناواجبیت بتائی تھی۔

ہندوستان کے گورنر جنرل وقت لارڈ ڈلہوزی نے اپنی یادداشت میں اس اہم معاملے پر جو کچھ لکھا تھا اسی سے ذیل کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"میری ناچیز رائے میں مجلس مالگزاری کے نمایندے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ نظام کے تحت نمک درآمد کنندہ کے حق میں کوئی ناانصافی نہیں ہوتی بلکہ دراصل دیسی نمک سازوں ہی کے حق میں بہت بڑی اور روز افزوں ناانصافی ہو رہی ہے"

"اس کا سیدھا سادہ نتیجہ یہ ہے کہ اس دیس کے نمک کے ساتھ برطانیہ کے ساختہ نمک کا مقابلہ ایسا کامیاب رہا ہے کہ دیسی نمک اب منڈیوں میں کم آنے لگا برخلاف اس کے اگر دیسی نمک کی قیمت فروخت بھی اسی قدر رہے جس قدر دیسی تاجروں کے ہاتھ میں

تعین قیمت رہنے پر ہوتی تو پھر دیسی نمک بھی برطانوی نمک کا ایک طرح مدِّمقابل بن سکتا تھا"۔

"میری رائے میں حکومت کو اپنی غلطی کے اعتراف میں اس قدر شرمانا نہیں چاہئے جس قدر اس ناانصافی کو دور کرنے میں اس خیال سے ذرا بھی پس و پیش کرتے ہیں کہ کہیں اس طرح غلطی کرنے کی وجہ سے کلنک کا ٹیکا ان کے ماتھے نہ لگ جائے"۔

"یہ ممکن ہے کہ نئی قیمت مقرر کرنے کے بعد بھی دیسی نمک کا بازاروں میں بکنا اس لئے بند ہو جائے کہ بدیسی نمک کو دوسرے اشیائے درآمد پر تجارتی برتری حاصل ہے۔ اگر تجربے سے یہی ثابت ہو جائے تو پھر حکومت کو اس صورتِ حال پر مکرر غور کرنا ہو گا لیکن اس وقت حکومت کا فریضہ کیا ہے وہ تو بالکل عیاں ہے"۔

"اتنا بڑا تغیر معزز مجلس نظماء کی اطلاع کے بغیر قوت سے فعل میں لانا نامناسب ہو گا۔ اس لئے آئندہ ڈاک سے انہیں اطلاع کر دی جائے اور چونکہ یہ معاملہ اشد ضروری ہے اس بنا پر جلد سے جلد جواب دینے کی ان سے استدعا کی جائے"۔

چنانچہ مجلس نظماء کو ہندوستانی نمک کے بارے میں جو ناانصافی ہوئی تھی وہ سب کچھ لکھ دیا گیا اور اس کے تدارک کی منظوری ان سے طلب کی گئی۔

جب ہندوستان کے حکام ہندوستانی نمک کی اصل لاگت کچھ ایسی مقرر کر دینے کی کوشش کر رہے تھے جس سے ہندوستانی نمک واجبی طور پر بدیسی نمک کا مقابلہ کر سکے تو اس وقت برطانوی نمک کے درآمد کرنے والے بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار نہیں بیٹھے تھے۔ برطانوی نمک سازوں نے یہ احسان جتا کر کہ اپنا بہتر نمک اہل ہند کو کھلانے کی انہیں آرزو ہے نمک پر محصول درآمد ہی ہندوستان میں اٹھا دینے کی دار العوام کے پاس درخواست پیش کی تھی اور یہ بھی توقع ظاہر کی تھی کہ اگر یہ طریقہ اختیار کر لیا جائے تو پھر ہندوستان کے کثیف اور گندہ نمک کا بازاروں میں بکنا بند ہو جائے گا اور ہندوستان کی کل آبادی برطانوی نمک ہی استعمال کرنے لگے گی۔

شہر مینچسٹر کے تاجروں، نمک سازوں اور بیوپاریوں کی رائے یہ تھی کہ "ہندوستان کی کثیر آبادی کے لئے ایک واجبی قیمت پر عمدہ نمک کا ہمیشہ دستیاب ہونا انتہائی اہمیت رکھتا ہے"۔

ہندوستان میں نمک کی درآمد پر فی ٹن ۷ پونڈ محصول تھا اور یہ اصل لاگت سے ۲۰۰۰ فی صدی زیادہ اور "ہندوستان کے حق میں سراسر ظلم تھا"۔ اسی بنا پر یہ استدعا کی گئی تھی کہ برطانوی نمک بلا محصول ہندوستان میں درآمد کرنے کی اجازت دی جائے یا اس پر محصول لینا ہی منظور ہو تو وہ برائے نام لیا جائے۔

نارتھ وچ علاقہ چیسٹر کے باشندوں نے بیان کیا تھا کہ چیسٹر کے ان اضلاع میں جہاں نمک سازی ہوتی تھی سالانہ ۶۰۰۰۰۰ ٹن نمک بنتا تھا اور اس میں ۵۰۰۰ انگریز روزی پر لگے ہوئے تھے اگر ہندوستان میں برطانوی نمک پر بھی وہی محصول لیا جائے جو دوسری چیزوں پر تھا تو ہندوستان کے صرف کیلئے چیسٹر سے بھی ایک خاص مقدار میں ایسا نمک بھیجا جا سکتا تھا "جو غیر مخلوط اور صاف ستھرا ہو۔ کافی مقدار میں ہمیشہ برابر ملتا رہے اور قیمت میں بھی کم ہو"۔

ڈرائیٹ وچ کے باشندوں نے شکایت کی کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمک بنانا "قانون ۳ و ۴ عہد ولیم رابع باب ۸۵ کی بدیہی خلاف ورزی اور عدول حکمی تھی کیونکہ اس قانون کی رو سے کمپنی پر سب تجارتی کاروبار بند کر دینا لازمی تھا۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں نمک کی درآمد پر ۷ پونڈ محصول عائد ہونے کی وجہ سے ۵۰۰۰ ٹن سے بڑھکر اس کی سالانہ درآمد نہ تھی حالانکہ یہی نمک ہندوستان میں ۸۰۰۰۰ ٹن سے بھی زیادہ مقدار میں صرف ہونا چاہیئے اور یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا فریضہ تھا کہ "وہ برطانوی تاجروں کو ایسی تجارت کے فوائد سے محروم کرنے کے بغیر جس پر اُن کو سب پر مقدم ایک فطری حق حاصل تھا" اپنے محاصل وصول کرے۔

ووسٹر کے علاقے میں ڈروچ (جس کا دوسرا نام ڈرویٹ وچ بھی تھا) واقع تھا جس کے میئر بلدیہ شہر کائے ہیر بلدا اور ممتاز شہریوں نے شکایت کی تھی کہ فی ٹن ۷ پونڈ محصول کثیر لگا کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے "برطانوی نمک کا ہندوستان کی منڈیوں میں آنا بند کر دیا تھا"۔

شہر گلوسٹر کے ایوان تجارت نے بھی یہی شکایت کی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمک بنانا "قانون ۳ و ۴ عہد ولیم رابع باب ۸۵ کی بدیہی خلاف ورزی اور عدول حکمی تھی" اور برطانوی تاجروں کو "ایسی تجارت کے فوائد سے جس پر ان کو سب پر

مقدم ایک فطری حق حاصل تھا محروم کر دینے پر" سخت اعتراض کیا تھا۔
سینٹ ہیلینیر کے تاجروں صنعت گروں اور بیوپاریوں کی رائے یہ تھی کہ "عمدہ نمک کی قیمت اور اسکا وافر مقدار میں ملنا" اہل ہند کی فلاح و بہبود کے لئے بے انتہا اہمیت رکھتا تھا"۔ نیز یہ کہ ہندوستانی نمک خراب بھی تھا اور گراں بھی۔ اور یہ کہ "انگلستان کا ساختہ نمک ہندوستان میں اگر بلا محصول درآمد ہو یا کم سے کم دوسری اشیاء کی طرح اس پر محصول بحساب قیمت لیا جائے گر باقی سب محصولات ملکی پیداوار معاف ہوں تو پھر اُس ملک کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے معقول مقدار میں نمک بھیجا جاسکتا ہے"۔
ونسفرڈ (جو چیسٹر کے علاقے میں واقع ہے) کے باشندوں نے بھی ایک مختصر پیش کیا تھا جس میں نارتھوچ کے لوگوں کی درخواست سے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے لفظاً بہ لفظ اُن کو اتفاق تھا۔
ووسٹر کے ایوان تجارت نے شکایت کی تھی کہ ووسٹر کے لازوال قدرتی چشموں کے پانی سے نمک کا بننا اس لئے کم ہو گیا تھا کہ اس نمک کی درآمد کے لئے ہندوستان کی سب بندرگاہیں بند تھیں۔ وہ ایک سنجیدہ اور انسانیت پر مبنی حکمت عملی یہ تھی کہ صرف آمدنی کی غرض سے ایک واجبی محصول لینے کے بعد بلا مزاحمت مزید نمک کی درآمد کرنے کے لئے ہماری حوصلہ افزائی کی جائے برخلاف اس کے حکومت ہند نے اپنے خراب نمک کا اجارہ محفوظ رکھنے کی غرض سے ایسے قیود عائد کیے ہیں جن سے معتبر قانونی مشورے کے موافق سائلوں کی نظروں میں قانون ۳ و ۴ عہد ولیم رابع باب ۸۵ کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے"۔
برسٹل کے ایوان تجارت نے نمک پر محصول عائد ہونے سے ہندوستان میں جو تکلیف لوگوں کو محسوس ہو رہی تھی اس کے متعلق بہت اچھے استدلال کے ساتھ ایک زوردار درخواست پیش کی تھی "ہندوستان میں نمک کی قیمت فی ٹن ۲۱ پونڈ ہے درآنحالیکہ انگلستان میں وہی نمک ۳۰ شلنگ فی ٹن بکتا ہے۔ جبکہ خود انگلستان میں یہ محصول نمک کا موقوف کر دینا ضروری خیال کیا جاتا ہے تو چہ جائیکہ ہندوستان میں جہاں ملکہ معظمہ کی لکھوکھا رعایا انگریزوں سے بڑھ کر اس بات کی مستحق ہے

کیونکہ ایک طرف تو ان پر افلاس طاری ہے اور دوسری طرف نمک روزانہ استعمال کے علاوہ ایسی آب و ہوا میں امراض کی روک تھام کے لیے بھی نہایت ضروری ہے۔"

لورپول کے تاجروں - مالکان جہاز اور بیوپاریوں کی رائے یہ تھی کہ "حکومت کا نہایت اہم اور متبرک فریضہ یہ ہے کہ ہندوستان کی رعایا کے نشو و نما میں وہی احتیاط پیش نظر رکھے جو اس ملک کے لوگوں کے نشو و نما میں پیش نظر ہے اور ہونی چاہیئے۔" اور انھوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ "برطانوی ہند میں نمک پر محصول اٹھا دینے سے نہ صرف وہاں کی رعایا کے حال پر بڑا اکرام ہوگا کیوں کہ انصاف اور انسانی ہمدردی کے نقطۂ نظر سے وہ اس کی مستحق بھی ہے بلکہ اس سے عام طور پر اس ملک کے تجارتی تعلقات بھی زیادہ اچھے اور مستحکم ہو جائیں گے اور خصوصاً انگلستان کے سوتی مصنوعات وغیرہ کی مانگ بھی وہاں زیادہ ہو جائے گی۔"

مذکورالصدر اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے تاجر اور نمک ساز دونوں اس موقع پر زیادہ تر مفاد ذاتی ہی کے لیے اس تحریک میں شریک ہوئے تھے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس موقع پر ان کے اغراض محصول ادا کنندگان ہند کے اغراض سے علٰحدہ نہیں ہیں۔ ہندوستان کے لئے بڑی مسرت کی بات ہوتی اگر اس عام استدعا کی شنوائی ہوتی اور ہندوستانی اور انگریزی نمک دونوں پر ہندوستان میں محصول اٹھا دیا جاتا مگر یہ بھی یاد رہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا نتیجہ غالباً انگلستان کے نمک سازوں کی توقعات کے خلاف ہی نکلتا۔

ہندوستان میں نمک پر محصول وصول کرنے کے لیے کیا کارروائی کی جاتی تھی اس کے متعلق دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے بہت کچھ شہادت پیش ہوئی مدراس کے حالات انجمن اہل مدراس کی درخواست سے جس پر ٹی۔ راما سوامی وغیرہ کے دستخط تھے خوب ظاہر ہوتے ہیں۔

"یہ کہ ۱۸۰۵ء میں نمک کے انتظام اور نگرانی کے لئے سرکار نے ایک محکمہ قائم کیا تھا جس کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ نمک کی قیمت دوچند ہو گئی یعنے اس وقت ۷۰ روپئے (۷ پونڈ) فی گارس مقرر کر دی گئی اور اس حساب سے بعد کے تین۳ سال کی مدت

میں نمک کا اوسط صرف ۳۱۶۰۰۵ گارس ہوا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۰۹ء میں پھر قیمت ۷۰ روپے سے ۱۰۵ روپے (۱۰ پونڈ ۱۰ شلنگ) فی گارس کردی گئی اور یہ حکومت کے اجارۂ نمک لینے کے قبل کی قیمت سے سہ چند زیادہ تھی لیکن قیمت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے چونکہ نمک کا صرف کم ہو گیا تھا اس لئے سنہ ۱۸۲۰ء میں نمک کی قیمت پھر ۷۰ روپے (۷ پونڈ) فی گارس کردی گئی۔ مگر آٹھ سال تک مسلسل یہی قیمت رہنے کے بعد پھر ۱۰۵ روپے (۱۰ پونڈ ۱۰ شلنگ) مقرر کردی گئی اور سنہ ۱۸۴۴ء میں بڑھا کر اس کو ۱۸۰ روپے (۱۸ پونڈ) کر دیا گیا تھا مگر پھر گھٹا کر ۱۲۰ روپے اور جیلر فروش تو اس پر اپنا منافع لگا کر اور زیادہ قیمت پر نمک بیچتے ہیں تاکہ صارف کی جیب ہی سے یہ سب کچھ ادا ہو۔"

"اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یا تو لوگ نمک کے بغیر ہی گزارتے ہیں یا اس کے بجائے نمک سازی کے مقام کی آب و شور سے تر معمولی مٹی جن میں نمک کے ریزے ملے ہوئے ہوتے ہیں بلاخوف سزا یا بی استعمال کرتے ہیں جن سے ان کی صحت پر مضر اثر پڑتا ہے۔ اجارے کئے نمک کے سوا کوئی اور نمک چوری چھپی سے لینا ممنوع ہے اور خلاف ورزی حکم پر کلکٹر یا تحصیلدار حسب صوابدید ملزم کو سزائے تازیانہ دینے کا مجاز ہے۔"

اس طرح نمک کی کارروائیوں میں جو سختی کی جاتی تھی اس کا پورا پورا انکشاف کلکتے کی انجمن برطانوی ہند کی درخواست سے بھی جس پر راجہ رادھا کنٹ دیب بہادر وغیرہ کے دستخط ثبت تھے ہوتا ہے۔

"سرکار اپنی مرضی کے موافق نمک کی قیمت فروخت کا تعین کر دیتی ہے اور ہر وقت یہ قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ملک میں نمک سازی کا سب کچھ سامان رہنے کے باوجود انگریز تاجروں کے لئے برطانوی نمک کی درآمد نفع بخش ہوتی ہے نمک کی گرانی کی وجہ سے وہ لوگ تک جو نمک سازی کے مرکز کے پاس ہی رہتے ہیں نمک خرید نہیں سکتے بلکہ نمک جہاں بنتا ہے وہاں کی اوپر اوپر کی مٹی کی پرت لیکر استعمال کرتے ہیں اور جو لوگ ملک کے اندرونی حصے میں بود و باش رکھتے ہیں وہ تو صرف ترکاریاں وغیرہ جلا کر ان کی راکھ کا کھار اس کام میں لاتے ہیں۔ عدل و انصاف اور حکمت عملی کے اصول کے خلاف محکمۂ نمک کے عہدہ داران۔۔۔

کو عدالتی اختیارات بھی عطا ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ حکام اختیارات حاصلہ کے استعمال میں اگر بے ضابطگیاں نہ کریں اور لوگوں کو تکلیف نہ دیں تو کیا تعجب ہے۔ ذیلی عہدہ داروں کو بھی اس حیلے سے کہ محصول ادا کیے بغیر مال چھپا کر لانے کا انسداد کیا جائے ہر وقت نمک کے باربرداروں اور شورہ صاف کرنے والوں کو ستانے کا موقع مل جاتا ہے۔ سائلوں کی رائے یہ ہے کہ اس محکمے میں اور ضروری اصلاحوں کے علاوہ یہ اصلاح بھی حکومت کو کرنا مناسب ہے کہ اگر حکومت اس نامقبول ذریعۂ آمدنی سے فوراً دست بردار ہونا نہیں پسند کرتی تو اس کو چاہئے کہ کم سے کم نمک پر ایک مستقل اور غیر تغیر پذیر شرح محصول مقرر کر دے مثلاً ۱۰۰ من (۴۱۰۰ سیر) پر ۲۰۰ روپے (۲۰ پونڈ) جس سے نہ صرف غربا کو بڑا فائدہ پہنچے گا بلکہ خود قانون سے بھی محصول اندرون ملک وصول کرنے والوں کی ایک طرح کی عدالتی بے ضابطگی مٹ جائے گی اور نمک کی چوکیوں کے ذیلی عہدہ داروں کا نمک کے بیوپاریوں کو ستانا بند ہو جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نمک بھی ضروریات زندگی میں داخل ہے اس لئے جس قدر جلد ممکن ہو اس پر محصول بالکل اٹھا دینا چاہئے۔"

بمبئی کے کاشتکاروں نے حکومت بمبئی کی خدمت میں محصول نمک کے ظلم و تشدد کے خلاف ۲۶ نومبر ۱۸۵۲ء میں ایک درخواست پیش کی۔ اس کے بعد کے دارالعوام کی مجلس منتخبہ نے رستم جی ویکاجی کی شہادت قلمبند کی۔ اس گواہ نے مذکورالصدر درخواست کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا جس میں درخواست گزاروں نے بیان کیا تھا کہ ان کے کھیتوں کی پیداوار سال میں آٹھ ماہ کے لئے ان کو کفاف کرتی تھی۔ باقی چار مہینوں کے لئے ترکاریوں پر ان کی گزراوقات تھی جس میں "وہ نمک مرچ ڈال کر پکا لیتے تھے بشرطیکہ نمک پر محصول نہ ہو اور محصول ہو تو پھر اپنے ذائقہ کی اتنی معمولی چیز کو بھی خریدنے کا ان کو مقدور نہ تھا۔"

متعدد ممتاز و تجربہ کار عہدہ داروں نے جو پُرزور شہادت دی تھی وہ اس شہادت سے جو بنگالے۔ مدراس اور بمبئی کے باشندوں نے دی تھی کسی حال کم نہ تھی۔

رابرٹ برڈ سے جس نے تینتس سال تک عدالت اور مالگزاری کے سررشتہ جات

میں خدمت انجام دی تھی جب محصول نمک کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا وہ ایسا ہی زحمت دہ ہے جیسا بیان کیا جاتا ہے تو اس نے حسب ذیل جواب دیا۔

"مجھکو معلوم نہیں کہ اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے مگر اس میں تو شک نہیں کہ یہ محصول نہایت سنگین ہے اور نمک کی اصلی لاگت پر تقریباً ۳۰۰ یا ۲۵۰ فی صدی ہوتا ہے لیکن صرف سرحد پر یہ وصول کیا جاتا ہے۔ جس زمانے میں لارڈ ڈیم آکلنڈ ممالک مغربی میں اپنی حسب عادت ان کارروائیوں میں جن میں مصروف تھا مجھ سے تبادلہ خیالات کرنے آئے تھے تو انھوں نے اس محصول کے متعلق بھی گفتگو کی تھی اور یہ کہا تھا کہ اس سے لوگوں پر بہت کچھ سختی ہوتی ہے۔ بالخصوص نمک کے لئے سرحد پر ڈولیوں اور میانوں کی جن میں مستورات ہوتی تھیں تلاشی لینے سے حکومت پر برا اثر پڑتا ہے اور بدنامی اس کے سوا ہوتی ہے...... میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر تلاشی لینا موقوف کر دیا جائے تو پھر دوسری ملکوں کے مقابل ممالک مغربی میں بہت سی لوٹ کی بویاں آنے لگیں گی یعنے ہر زنانی میانے میں نیچے سے اوپر تک نمک بھرا ہوا ہوگا"۔

فریڈرک ہیلی ڈے نے جو حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کا معتمد اور اس کے چند ہی دنوں کے بعد بنگالے کا لفٹنٹ گورنر مقرر ہوا تھا اس تمام رشوت ستانی اور استحصال ناجائز کی تفصیل بیان کر دی تھی جو ہندوستان میں کمپنی کے نمک کے اجارہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اگر یہ اجارہ اٹھا لیا جائے اور اہل ہند کو نمک بنانے کی اجازت دیدی جائے تو پھر ہندوستان میں درآمد نمک کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

"بنگالے میں سرکار جو نمک بناتی ہے اس کی موجودہ قیمت بازار میں خریدنے والوں کے لئے اتنی گراں اس وجہ سے ہے کہ نمک سازی میں کفایت سے کام لینا تو کجا بے انتہا فضول خرچی کی جاتی ہے جو ایک سرکاری نظام نمک سازی میں لازمی ہے اور رشوت ستانی و استحصال ناجائز اور خورد برد ہوتی رہتی ہے۔ جس کا ایسے نظام میں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں سارا کاروبار رہنے سے وقوع پذیر ہونا بھی لازمی ہے۔ ان حالات میں باخبر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اگر سرکار یہ محصول اٹھا دے اور کوئی دوسرا محصول کہیں کے نمک پر بھی نہ لگائے تو بھی بنگالی نمک ساز

درآمدشدہ نمک کی بہ نسبت اتنے کم داموں اپنا نمک فوراً بیچ سکتے ہیں کہ آیندہ بنگالے میں باہر سے نمک کا ایک ریزہ بھی درآمد نہیں ہوسکتا۔"

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ محصول نمک کے خلاف جتنی درخواستیں گزریں اور کھلبلی مچی وہ سب ناکام ثابت ہوئی کیونکہ سرکار کو محاصل نمک سے دست بردار ہونا کسی حال منظور نہ تھا۔

افیون

نمک کے علاوہ صرف ایک ہی چیز میں کمپنی کا اجارہ باقی رہ گیا تھا اور وہ افیون تھی اس سے محاصل پیدا کرنے کے طریقے کی توضیح اف۔ ڈبلیو پریدو نے جو محکمۂ ہند کے صیغہ تنقیح مراسلات میں ایک مددگار تھا مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں کی تھی۔

بنگالے میں خشخاش کی کاشت قطعی ممنوع تھی بجز اس صورت کے کہ خشخاش کا عرق صرف سرکار کو بیچنے کا منشا ہو جن کاشتکاروں کو خشخاش بونے کی خواہش ہوتی تھی اُن کو اس شرط پر اجازت دی جاتی تھی کہ وہ ایک مقررہ قیمت پر اُس کا عرق صرف سرکار کو فروخت کریں۔ اس کے بعد یہ عرق پٹنہ اور بنارس کے دو اہم کارخانوں کو بھیجدیا جاتا تھا جہاں اس سے افیون بنائی جاتی تھی اور یہ افیون کلکتہ بھیجدی جاتی تھی۔ کلکتے میں یہ نیلام ہوتی تھی اور سرکار کو اُس سے منافع ملتا تھا جس کی نوعیت یہ تھی کہ اصل لاگت میں اور افیون چین بھیجنے والے تاجر نیلام میں جو اُس کی قیمت دیتے تھے اس میں جو تفاوت ہوتا تھا بس وہی منافع تھا۔

بمبئی میں نہ تو خشخاش کی کاشت تھی اور نہ افیون بنائی جاتی تھی۔ مالوے کی دیسی ریاست میں جو افیون بنتی تھی اس سے کمپنی کو اس مد کے تحت آمدنی ہوتی تھی۔ مالوے کے تاجر افیون بمبئی کی بندرگاہ ہی سے چین بھیجتے تھے اور انگریزی سرکار افیون کے اپنی عملداری سے ہوکر گزرنے پر فی صندوق (۱۴۳ پونڈ وزنی) ۴۰ پونڈ محصول وصول کرلیتی تھی۔ ۱۸۴۳ء کے قبل مالوے کی افیون سندھ کی راہ سے

ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھی لیکن اس سال انگریزوں نے سندھ فتح کر لیا تھا اور اس کے بعد افیون غیر ممالک کو بھیجنے کے لئے انگریزی علمداری میں سے ہو کر گزرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ یہی محصول راہداری تھا جس سے حکومت بمبئی کو افیون کی مد میں آمدنی ہوتی تھی اس طرح سندھ کی فتح میں حکومت بمبئی کا کچھ مالی فائدہ بھی مضمر تھا۔

مدراس میں افیون نہیں بنتی تھی۔

انگلستان میں اس موضوع پر بڑی بڑی بحثیں ہوئی تھیں کہ آیا محصول افیون درحقیقت اہل ہند پر ایک قسم کا محصول سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں کیا اس محاصل کے برقرار رکھنے کے لئے چین سے وہاں جا کر لڑائیاں کرنا جیسا کیا گیا تھا جائز تھا یا نہیں اور کیا حکومت ہند کا افیون کا اجارہ موجودہ زمانے میں بھی بحالہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ اس تالیف کا مطمح نظر یہ ہے کہ ناظرین کے روبرو ایسے صحیح واقعات پیش کر دئے جائیں جن پر وہ خود رائے قائم کر سکیں اس لئے ان مباحث میں پڑنا ہمیں پسند نہیں۔ ہمارے خیال میں معاشیات کا کوئی حقیقی ماہر فن ایسا نہ ہوگا جو اس سے انکار کرے کہ ایک ایسا سرکاری اجارہ جس کی وجہ سے ایک نفع بخش حرفت سے لوگ محروم ہو جائیں اور ایک نفع خیز شئے کی کاشت وساخت اور تجارت موقوف ہو جائے لوگوں پر بالکل حقیقی معنی میں محصول نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے کوئی غیر جانبدار مورخ ایسا نہیں ہے جس نے چین کی حکومت کی مرضی کے خلاف وہاں کی بندرگاہوں میں ہندوستانی افیون داخل کرنے کی غرض سے جو لارڈ پالمرسٹن نے چین سے لڑائیاں کی تھیں ان کی تائید کی ہو۔ اور کوئی مدبر وسنجیدہ شخص ایسا نہیں ہے جس کو افیون کا سرکاری اجارہ بشرطیکہ وہ بغیر کسی قسم کے خطرے کے اٹھا دیا جا سکتا ہے پسند آتا ہو۔

باایں ہمہ چونکہ افیون عام طور پر جزء غذا نہیں ہے اس لئے ہندوستان کے لوگ افیون کے سرکاری اجارے کو اپنے لئے اس قدر مضر نہیں سمجھتے جس قدر نمک کے اجارے کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے عام طور پر مقدم الذکر پر ہندوستان میں وہ غیظ وغضب نہیں ہوتا جو موخر الذکر پر کیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگوں کی رائے یہی ہے

کہ اس اجارے کو بحیثیت اجارہ برخاست کردینا ہی حکومت کے لیے بہتر ہے اور اس کے بجائے اس شئے کے بنانے اور بیچنے پر جائز آمدنی کی خاطر سنگین سے سنگین محصول لگا دیا جا سکتا ہے جیسا دوسرے منشیات مثلاً شراب وغیرہ کے بنانے اور بیچنے پر اب ہے۔ انجمن برطانوی ہند نے اپنی درخواست میں جو دارالعوام کو دی تھی ہندوستان کے لوگوں کے خیالات کی خوب ترجمانی کی ہے۔

مقتضائے انصاف یہی ہے کہ خشخاش کی کاشت میں سرکاری مداخلت بند کردی جائے اور افیون کے بنانے اور غیر ممالک کو بھیجنے پر جیسا مالوے کی افیون کے بارے میں ہوتا ہے جو معینہ محصولات ہیں اور ان سے جو آمدنی ہوتی ہے وہی محاصل افیون کا دوسرا نام سمجھا جائے۔ ان اصول کے اختیار کرنے سے خشخاش کے کاشتکاروں کو وہی آزادی عمل مل جائے گی جو ان حکومتوں میں جن کے اساسی اصول خودسری اور مطلق العنانی نہیں ہیں ہر شخص کو حاصل ہے اور اس انتظام میں جو بھی کچھ نقصان محاصل ہوگا اس کی تلافی یوں ہو جائے گی کہ فی الوقت جو بیش مصارف عملہ افیون کے لئے ضروری ہے اس کے برخاست کر دینے سے آیندہ بچت نکلے گی۔

یہ عاجزانہ التجا بھی یونہیں رائگاں گئی۔ نہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی اور نہ حکومت ہند ہی (جو ۱۸۵۸ء میں کمپنی کی قائم مقام ہوئی تھی) اس بات پر آمادہ تھی کہ افیون کے اجارے سے دست برداری اختیار کرلی جائے یا اس کے بجائے صرف افیون کی پیداوار اور برآمد پر محصول لگا دیا جائے۔

دسواں باب

نرخنامۂ محصول۔ درآمد اور برآمد

ہندوستان کے محکمۂ قانون نے ۱۸۳۳ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان تجارت اور جہاز رانی کو ایک ضابطہ کے تحت لانے اور محصول کا نرخنامہ مقرر کردینے کے لئے مختلف قوانین وقتاً فوقتاً نافذ کیے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں چند اہم اشیائے درآمد پر محصول لیا جاتا تھا جن کی تفصیل درج ذیل ہے:-

اشیاء	محصول درآمد
کتب (برطانوی)	بلا محصول
کتب (ممالک غیر)	۳ فی صدی
قہوہ	۷½ ,, ,,
سوتی اور ریشمی پارچے (برطانوی)	۵ ,, ,,
سوتی اور ریشمی پارچے (ممالک غیر)	۱۰ ,, ,,
سوتی دھاگا (ڈوریاں) اور سوت (برطانوی)	۳½ ,, ,,
سوتی دھاگا (ڈوریاں) اور سوت (ممالک غیر)	۷ ,, ,,

گھوڑے اور بہائم و مویشی	بلا محصول
بحری سامان (برطانوی)	۵ فی صدی
بحری سامان (ممالک غیر)	۱۰ 〃 〃
فلزات (برطانوی)	۵ 〃 〃
فلزات (ممالک غیر)	۱۰ 〃 〃
بیر۔ ایل اور دیگر تخمیری شراب	۵ 〃 〃
نمک	۵ شلنگ فی من (۸۲ سیر) بنگالے میں ۲ شلنگ فی من مدراس میں
دارو	۴ شلنگ فی امپیریل گیلن لنڈن کے معیار کے برابر تیز
چائے	۱۰ فی صدی
انگوری شراب اور دیگر قسم کی شراب	۲ شلنگ فی امپیریل گیلن
اونی پارچے (برطانوی)	۵ فی فیصدی
اونی پارچے (ممالک غیر)	۱۰ 〃 〃
دیگر مصنوعات	۵ 〃 〃
اشیائے متفرق	۳½ فی صدی

دار العوام کی سنہ ۱۸۵۲ء کی رپورٹ کے ضمیمہ (۳) میں جس سے مذکورہ بالا صدر اعداد اخذ کیے گئے ہیں بمبئی مدراس اور بنگالے کے متعلق سنہ ۳۵-۱۸۳۴ء سے سنہ ۵۰-۱۸۴۹ء تک سولہ سال کی درآمد و برآمد کی قیمت درج ہے۔ ذیل کے دو نقشوں میں ہم نے ایک پونڈ انگلیسیہ ۱۰ روپے کے مساوی قرار دیا ہے۔

درآمد

سنہ عیسوی	مال تجارت و خزانہ طلا و نقرہ وغیرہ			
	در بنگالہ	در مدراس	در بمبئی	جملہ
۳۵-۱۸۳۴	۲۶۴۵۳۵۵	۶۵۶۴۰۵	۲۸۵۲۳۶۹	۶۱۵۴۱۲۹

۱۸۳۵ - ۳۶	۲۸۵۷۵۳۰	۵۸۵۰۸۸	۳۴۸۵۶۹۴	۶۹۲۸۳۱۲
۱۸۳۶ - ۳۷	۳۳۹۵۴۲۳	۶۷۲۹۸۵	۳۵۰۴۷۴۷	۷۵۷۳۱۵۵
۱۸۳۷ - ۳۸	۳۵۱۲۷۸۸	۷۳۲۴۶۶	۳۴۲۷۳۱۷	۷۶۷۲۵۷۲
۱۸۳۸ - ۳۹	۳۸۵۱۱۸۳	۷۷۸۵۳۶	۳۶۲۱۸۷۶	۸۲۵۱۵۹۶
۱۸۳۹ - ۴۰	۴۵۶۸۳۷۸	۷۹۵۷۱۴	۲۴۱۲۴۰۸	۷۷۷۶۵۰۱
۱۸۴۰ - ۴۱	۵۵۰۹۵۶۳	۸۳۷۰۷۹	۳۸۵۵۵۵۱	۱۰۲۰۲۱۹۳
۱۸۴۱ - ۴۲	۵۲۵۲۵۲۷	۷۴۸۸۸۷	۳۶۳۱۴۸۵	۹۶۲۹۹۰۰
۱۸۴۲ - ۴۳	۵۵۶۳۸۹۷	۶۶۰۵۹۳	۴۸۲۲۴۰۳	۱۱۰۴۶۸۹۴
۱۸۴۳ - ۴۴	۶۲۲۶۸۴۸	۷۶۷۵۰۴	۶۶۱۸۱۲۲	۱۳۶۱۲۴۷۵
۱۸۴۴ - ۴۵	۷۵۱۵۳۵۵	۱۲۳۵۴۵۵	۵۷۵۵۷۲۷	۱۴۵۰۶۵۳۷
۱۸۴۵ - ۴۶	۶۲۲۳۶۲۳	۱۰۲۲۲۱۱	۴۳۳۷۶۰۳	۱۱۵۸۳۴۳۸
۱۸۴۶ - ۴۷	۶۶۴۹۶۷۱	۱۰۲۹۰۰۳	۴۱۵۷۹۱۱	۱۱۸۳۶۵۸۶
۱۸۴۷ - ۴۸	۵۴۱۸۵۸۴	۱۱۰۸۸۱۷	۴۰۴۳۹۰۶	۱۰۵۷۱۰۰۸

سنہ عیسوی	از بنگالہ	از مدراس	از بمبئی	جملہ
۴۹-۱۸۴۸	۵۷۷۰۶۲۳	۱۰۶۵۲۷۱	۵۷۰۳۴۰۲	۱۲۵۴۹۳۰۷
۵۰-۱۸۴۹	۶۴۹۸۰۳۵	۱۰۲۷۴۴۱	۶۱۷۱۲۱۸	۱۳۶۹۶۶۹۶
برآمد				
سنہ عیسوی	مال تجارت وخزانۂ طلاء ونقرہ وغیرہ			
	از بنگالہ	از مدراس	از بمبئی	جملہ
۳۵-۱۸۳۴	۴۱۵۸۵۹۸	۹۹۲۴۸۵	۳۰۳۷۰۷۷	۸۱۸۸۱۶۱
۳۶-۱۸۳۵	۵۵۹۳۸۹۶	۱۱۵۲۹۶۸	۴۴۶۷۷۴۰	۱۱۲۱۴۶۰۴
۳۷-۱۸۳۶	۶۸۴۹۵۲۷	۱۳۵۱۴۱۶	۵۳۰۳۱۷۳	۱۳۵۰۴۱۱۷
۳۸-۱۸۳۷	۶۹۰۵۸۰۹	۱۰۷۲۶۴۰	۳۶۰۴۹۸۶	۱۱۵۸۳۴۳۶
۳۹-۱۸۳۸	۶۹۵۴۳۸۱	۱۱۱۱۷۱۹	۴۰۵۶۵۷۳	۱۲۱۲۲۶۷۵
۴۰-۱۸۳۹	۷۰۰۰۹۴۳	۱۳۵۵۹۱۴	۲۹۷۶۴۱۱	۱۱۳۳۳۲۶۸
۴۱-۱۸۴۰	۸۲۰۶۷۷۱	۱۱۳۳۴۶۶	۴۴۸۱۸۳۲	۱۳۸۲۲۰۷۰
۴۲-۱۸۴۱	۸۲۲۵۵۳۹	۱۴۲۳۰۶۴	۴۶۹۱۶۸۹	۱۴۳۴۰۲۹۳

۱۸۴۲-۴۳	۷۴۳۶۳۶۹	۱۳۲۷۳۰۸	۵۰۰۳۹۴۲	۱۳۷۶۷۶۲۱
۱۸۴۳-۴۴	۱۰۰۷۶۹۰۴	۱۲۳۰۲۵۵	۶۶۹۲۳۹۳	۱۷۹۹۹۵۵۳
۱۸۴۴-۴۵	۱۰۲۱۸۷۴۰	۱۷۰۶۵۱۶	۵۷۷۱۷۹۶	۱۷۶۹۷۰۵۲
۱۸۴۵-۴۶	۱۰۱۰۲۷۵۵	۱۴۷۶۹۸۱	۶۲۶۴۹۶۵	۱۷۸۴۴۷۰۲
۱۸۴۶-۴۷	۹۵۱۹۷۹۶	۱۵۸۴۳۱۶	۴۹۶۵۱۹۲	۱۶۰۶۹۳۰۷
۱۸۴۷-۴۸	۸۰۶۶۹۲۸	۱۴۹۱۵۵۸	۴۳۷۹۹۴۷	۱۴۷۳۸۴۳۵
۱۸۴۸-۴۹	۹۸۱۹۷۴۲	۱۹۴۶۳۱۱	۶۸۶۲۱۹۰	۱۸۶۲۸۲۴۴
۱۸۴۹-۵۰	۱۰۵۰۲۲۴۴	۱۳۴۵۵۲۲	۶۴۳۵۷۷۶	۱۸۲۰۳۵۴۳

ان نقشوں کے اعداد پر غائر نظر ڈالنے سے چند باتیں فوراً ظاہر ہوتی ہیں مثلاً
یہ معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی اور بنگالے میں درآمد برآمد دونوں جلد جلد بڑھ رہی تھیں لیکن مدراس میں
ان کا اضافہ کچھ ایسا نمایاں نہیں تھا۔ چنانچہ بمبئی اور بنگالے میں درآمد اشیاء پچیس لاکھ سے
ساٹھ لاکھ ہوگئی تھی مگر مدراس میں ۶ لاکھ سے صرف دس لاکھ ہوئی تھی۔ بمبئی سے
برآمد اشیاء تیس لاکھ سے ساڑھے ساٹھ لاکھ ہوگئی تھی اور بنگالے سے ۸۰ لاکھ سے
ڈیڑھ کروڑ ہوگئی تھی مگر مدراس سے برآمد اشیاء دس لاکھ سے صرف پندرہ لاکھ ہوئی تھی۔
یہ نمایاں اضافہ بمبئی اور بنگالے کی علداری میں کسی قسم کی توسیع حدود کے باعث نہیں ہوا تھا
کیونکہ ۱۸۳۴ء اور ۱۸۴۹ء کے درمیان ان صوبوں کے رقبے میں کوئی اہم اضافہ

نہیں ہوا تھا بلکہ محض مدراس کے بدتر نظام اراضی کے تحت جس کی تفصیل ہم نے کسی اور باب میں بیان کی ہے مدراس کی جو حالت بن گئی تھی تمامتر اسی وجہ سے تھی۔

مذکورالصدر اعداد کے معائنہ سے ایک اور بات قابل ذکر یہ نظر آتی ہے کہ برطانوی ہند کی درآمد برآمد کے تناسب میں تفاوت عظیم تھا اور یہ ٣٥-١٨٣٤ء میں ٢٠ لاکھ تھا مگر ٥٠-١٨٤٩ء میں ٤٥ لاکھ سے بھی زیادہ ہوگیا تھا ان اعداد سے نہ صرف برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ برطانوی ہند کی تجارت جو تھی وہ ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہ تجارت بھی جو برطانوی ہند کی دنیا کے اور تمام ممالک سے تھی۔ دوسرے ممالک جو کچھ لیتے تھے اس کا واجبی معاوضہ بھی دیتے تھے لیکن برطانیہ عظمیٰ ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا جس کا کوئی تجارتی معاوضہ نہیں دیتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کی درآمد و برآمد میں ٢٠ لاکھ سے لیکر ٤٥ لاکھ تک کا تفاوت ہوتا تھا اور یہی تفاوت دولت کا سالانہ سوتاؤ تھا۔

مذکورالصدر نقشوں میں ١٨٥٠ء تک کی ہندوستان کی تجارت کے اعداد بتائے گئے ہیں مگر اب ہم ناظرین کے سامنے ١٨٥١ء سے ١٨٥٨ء تک کمپنی کے ہشت سالہ عہد حکمرانی کے اعداد جو ایک حالیہ نقشے سے اخذ کیے گئے ہیں پیش کرتے ہیں۔ پہلے پانچ سال میں ہندوستان سے برآمد اشیاء میں فاضلات ہی رہی لیکن باقی تین ٣ سال میں جو غدر کا زمانہ تھا برآمد اشیا سے بھی درآمد زیادہ ہوئی۔

تمام ممالک غیر سے ہندوستان کی تجارت

سنہ عیسوی	درآمد مال تجارت پونڈ	درآمد طلاء و نقرہ پونڈ	جملہ درآمد پونڈ	جملہ برآمد پونڈ	تفاوت برآمد پونڈ
١٨٥١	١١٥٥٨٧٨٩	٣٨١١٨٠٩	١٥٣٧٠٥٩٨	١٨٧٠٥٤٣٩	٣٣٣٤٨٣٩
١٨٥٢	١٢٢٤٠٤٩٠	٥٠٥٢٠٥٩	١٧٢٩٢٥٤٩	٢٠٧٩٨٣٤٢	٣٥٠٥٧٩٣
١٨٥٣	١٠٠٧٠٨٦٣	٦٨٣١٣٧٧	١٦٩٠٢٢٤٠	٢١٥١٩٨٦٣	٤٦١٧٦٢٣
١٨٥٤	١١١٢٢٦٩٥	٤٨٧١٥٤	١٥٩٩٤٦١٣	٢٠٧٧٨٤٣٥	٤٧٨٣٨٢٢

۱۸۵۵	۱۲۷۴۲۶۷۱	۲۰۲۸۲۵۶	۱۴۷۷۰۹۲۷	۲۰۱۹۴۲۵۵	۵۴۲۳۳۲۸ تفاوت درآمد
۱۸۵۶	۱۳۹۴۳۴۹۳	۱۱۳۰۱۲۸۸	۲۵۲۴۴۷۰۴	۲۳۶۳۹۴۳۵	۱۶۰۵۳۳۷
۱۸۵۷	۱۴۱۹۴۵۸۷	۱۴۴۱۳۶۹۷	۲۸۶۰۸۲۸۴	۲۶۵۹۱۸۷۷	۲۰۱۶۴۰۷
۱۸۵۸	۱۵۲۷۷۶۲۹	۱۵۸۱۵۴۳۶	۳۱۰۹۳۰۶۵	۲۸۲۷۸۴۷۴	۲۸۱۴۵۹۱

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ برآمد سے درآمد کا ہندوستان میں زیادہ ہونا محض عارضی تھا۔ ۱۸۶۴ء تک جیسا ہم کسی آئندہ باب میں بتائیں گے ہندوستان کی درآمد سے برآمد پھر بڑھ گئی اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ تفاوت اور بھی زیادہ ہوتا گیا۔

ہندوستان کی نصف سے بھی زیادہ تجارت برطانیۂ عظمیٰ سے تھی اس طرح ۱۸۴۱ء سے ۱۸۵۵ء تک جب ہندوستان کی درآمد ایک کروڑ سے لیکر ۲ کروڑ تک ہوئی تھی اس وقت صرف ممالک متحدۂ برطانیہ سے درآمد اشیاء ۵۰ لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان ہوئی تھی اور باقی تین سال میں یعنی ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۸ء تک جبکہ درآمد میں ڈھائی کروڑ اور تین کروڑ دس لاکھ کے درمیان اضافہ ہوا تھا تو اس وقت ممالک متحدۂ برطانیہ سے درآمد میں ایک کروڑ اسّی لاکھ کے درمیان اضافہ ہوا تھا ہندوستان کی برآمد میں اور ممالک کے مقابل برطانیۂ عظمیٰ کا حصہ کسی قدر کم تھا۔ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۵۵ء کے درمیان ہندوستان سے جملہ برآمد ایک کروڑ تیس لاکھ اور دو کروڑ دس لاکھ کے درمیان ہوئی تھی جس میں سے برطانیۂ عظمیٰ کو ۵۰ لاکھ اور ۸۰ لاکھ کے درمیان برآمد ہوئی تھی۔ بقیہ تین سال میں ہندوستان کی جملہ برآمد دو کروڑ تیس لاکھ اور دو کروڑ اسّی لاکھ کے درمیان ہوئی تھی اور ممالک متحدۂ برطانیہ کو اس میں سے ایک کروڑ ہوئی تھی۔

ہمارے پاس اتنی گنجائش صفحات نہیں ہے جس میں ہم یہ بتا سکیں کہ ان سنین میں کس طرح مختلف اشیائے تجارت کی درآمد و برآمد بڑھتی گھٹتی رہی ہے لیکن چند

اہم اشیائے تجارت کا بیان اس لئے ضروری ہے کہ اس سے اہل ہند کی اس زمانے کی حرفت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان کے اہم ترین اشیائے درآمد میں سوتی دھاگہ اور ڈوریاں۔ سوتی کپڑے۔ ریشمی پارچے۔ اونی پارچے مشینیں اور گرنیوں کے مصنوعات کا شمار تھا اور ان اشیاء کے صرف میں دس سال میں جو کمی وبیشی ہوتی رہی ہے وہ ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتی ہے:

تمام ممالکِ غیر سے ہندوستان میں درآمد اشیاء

سنہ عیسوی	سوتی دھاگہ ڈوریاں پونڈ	سوتی مال پونڈ	ریشمی مال پونڈ	اونی مال پونڈ	مشینیں پونڈ	گرنیوں کے مصنوعات پونڈ
۱۸۴۹	۹۰۹۰۱۶	۲۲۲۲۰۸۹	۱۲۳۵۰۵	۱۱۱۸۱۵	۱۸۰۶۴	۲۰۳۹۹۷
۱۸۵۰	۱۱۳۱۵۸۶	۲۳۷۱۶۱۸	۱۱۲۶۰۱	۱۵۶۱۵۴	۸۰۷۹	۱۶۶۱۳۹
۱۸۵۱	۱۰۳۹۳۲۹	۳۶۴۲۳۶۱	۱۱۱۵۵۴	۲۱۸۸۴۸	۲۰۶۶۶	۲۴۵۳۹۳
۱۸۵۲	۱۳۹۱۲۴	۴۷۷۰۷۷۹	۱۲۶۶۰۶۴	۲۰۵۵۰۵	۱۴۳۳۷	۲۴۶۷۰۱
۱۸۵۳	۱۱۳۰۵۰۰	۳۶۶۷۴۳۳	۱۱۰۵۴۶۲	۱۴۲۰۲۷	۲۶۴۵۷	۲۱۷۱۸۷
۱۸۵۴	۱۳۰۶۹۱۳	۴۴۳۲۵۲۵	۱۱۶۹۵۵	۱۴۴۴۷۳	۵۲۷۸۸	۲۸۶۶۷۱
۱۸۵۵	۱۲۷۴۰۹۸	۵۴۰۳۲۴۴	۱۹۷۵۱۰	۱۷۱۰۶۵	۱۲۶۳۰۳	۳۱۲۲۰۴
۱۸۵۶	۱۴۱۴۲۷۴	۴۹۴۸۰۰۵	۱۳۸۷۶۸	۱۳۳۹۹۸	۴۳۵۵۱۲	۷۸۸۸۵۹

۱۸۵۷	۱۱۹۱۹۷۴	۴۹۴۱۲۵۳	۱۰۶۲۳۳	۱۴۲۷۹۷	۲۴۴۴۳۳	۵۵۸۳۲۹
۱۸۵۸	۹۴۳۹۲۰	۴۷۸۲۶۹۸	۱۰۸۰۲۳	۲۶۱۵۸۹	۴۶۵۴۵۳	۳۷۸۹۸۹

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۵ء تک یعنے چھ ۶ سال کی مدت میں سوتی مال کی درآمد دوچند سے بھی زیادہ ہوئی تھی اور غدر کی وجہ سے اس میں اضافہ ہوتا بند ہوگیا تھا مگر ۱۸۵۹ء میں آناً فاناً ۸۰ لاکھ کی مالیت اس کی ہوگئی۔ مشینوں اور گرنیوں کی مصنوعات کی درآمد میں بھی نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

دس ۱۰ سال کی مدت میں ہندوستان کی برآمد میں جو کمی وبیشی ہوئی وہ ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتی ہے:-

ہندوستان سے تمام ممالکِ غیر کو برآمد

سنہ عیسوی	سوت پونڈ	سوتی مال ڈوریاں اور دھاگہ پونڈ	خام ریشم پونڈ	ریشمی مال پونڈ	کچا اون پونڈ
۱۸۴۹	۱۷۷۵۳۰۹	۶۹۰۵۸۴	۷۱۳۶۳۲	۳۰۲۳۲۲	۵ ۵۵۹۱
۱۸۵۰	۲۲۰۱۱۷۸	۷۴۲۳۲۰	۶۶۶۰۹۴	۴۴۱۷۴۹	۴۸۹۲۵
۱۸۵۱	۳۴۷۴۴۸۹	۹۷۳۵۴۹	۶۱۹۳۱۹	۳۵۵۲۲۳	۶۸۳۳۵
۱۸۵۲	۳۶۱۹۹۸۹	۸۱۹۰۴۹	۶۸۸۶۴۰	۲۶۰۲۲۵	۱۰۰۶۱۲
۱۸۵۳	۳۶۲۹۴۹۴	۹۳۰۸۷۷	۶۶۷۵۴۵	۳۱۵۳۰۵	۱۷۲۱۱۰
۱۸۵۴	۲۸۰۴۱۵۰	۷۶۹۳۴۵	۶۴۰۴۵۱	۳۲۶۵۷۱	۲۰۵۶۰۱

۱۸۵۵	۲۴۲۸۷۶۴	۸۱۷۱۰۳	۵۰۰۱۰۵	۲۶۳۴۵۳	۲۰۷۲۶۳
۱۸۵۶	۳۳۱۴۹۵۱	۷۷۹۶۴۷	۷۰۷۷۰۶	۳۴۱۰۳۵	۲۷۲۹۴۲
۱۸۵۷	۱۴۳۷۹۴۹	۸۸۲۲۴۱	۷۸۲۱۴۰	۲۸۱۴۵۰	۳۱۴۲۱۶
۱۸۵۸	۴۳۰۱۷۶۸	۸۰۹۱۸۳	۷۶۶۶۷۳	۱۵۸۲۲۴	۳۸۷۱۰۴

ہندوستان سے تمام ممالک غیر کو برآمد

سنہ عیسوی	غلہ واجناس	شکر	افیون	نیل	سن
	پونڈ	پونڈ	پونڈ	پونڈ	پونڈ
۱۸۴۹	۸۵۸۶۹۱	۱۸۱۴۴۰۴	۵۷۷۲۵۲۶	۲۰۹۳۴۷۴	۶۸۷۱۷
۱۸۵۰	۷۵۷۹۱۷	۱۹۲۵۶۰۳	۵۹۷۳۳۹۵	۱۰۳۸۴۷۴	۸۸۹۸۹
۱۸۵۱	۷۵۲۲۹۵	۱۸۲۴۷۸۹	۵۴۵۹۱۳۵	۱۹۸۰۸۹۶	۱۹۶۹۳۶
۱۸۵۲	۸۶۹۰۰۲	۱۸۰۱۶۶۰	۶۵۱۵۲۱۴	۲۰۲۵۳۱۲	۱۸۰۹۷۶
۱۸۵۳	۸۸۹۱۶۰	۱۷۲۹۷۶۲	۶۰۳۴۰۷۵	۱۸۰۹۶۸۵	۱۱۲۶۱۷
۱۸۵۴	۱۴۱۳۶۵۳	۹۴۸۵۸۲	۶۴۳۷۰۹۸	۲۰۶۷۷۶۹	۲۱۴۷۶۸
۱۸۵۵	۱۷۴۲۵۳۰	۱۱۳۵۶۹۹	۶۲۳۱۲۷۸	۱۷۰۱۸۲۵	۲۲۹۲۴۱

۱۸۵۶	۲۸۹۶۲۶۲	۱۳۵۹۱۰۴	۶۲۰۰۸۷۱	۲۴۲۴۳۳۲	۳۲۹۰۷۶
۱۸۵۷	۲۵۸۷۴۵۶	۱۷۸۶۰۷۷	۷۰۵۶۶۳۰	۱۹۳۷۹۰۷	۲۷۴۹۵۷
۱۸۵۸	۳۷۹۰۳۷۴	۱۱۷۵۷۷۱	۹۱۰۶۶۳۵	۱۷۳۴۳۳۹	۳۰۳۲۹۲

ان اشیائے برآمد کی کمی و بیشی معنی خیز ہے کچے سوت کی برآمد اس دہ سالہ مدت میں ۲۰ لاکھ کی جو تھی اس میں چالیس لاکھ سے کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوا تھا۔ ہندوستان میں روئی کی کاشت پھیلانے اور اس کو ترقی دینے کی خواہش انگلستان کے اس لئے دامنگیر تھی کہ اس کے کارخانوں اور کارگاہوں کی ضرورتوں کی تکمیل بجائے امریکہ کے اس طرح خود اس کے مقبوضات ہی سے ہوسکتی تھی، ہم کسی آئندہ باب میں بتائیں گے کہ مدت دہ سالہ (۱۸۶۰ تا ۱۸۷۰) کے ابتدائی سالوں میں امریکہ میں خانہ جنگی گویا خدا کی طرف سے ان کوششوں کی تائید ہی کے لئے شروع ہوئی اس خانہ جنگی کے زمانے میں امریکہ سے روئی نہ آسکی اس لئے سنہ ۱۸۶۳ء میں ہندوستان روئی کی برآمد میں تین کروڑ ساٹھ لاکھ کا اضافہ ہوا اور اس کے بعد کے سال اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا لیکن ممالک متحدہ امریکہ میں جب صلح و امن قائم ہوا تو پھر یہ بات باقی نہ رہی۔ برطانوی کارخانوں میں ہندوستانی روئی کے بجائے امریکہ کی روئی پھر استعمال ہونے لگی اور ہندوستان کی برآمد جیسے آناً فاناً بڑھ گئی تھی ویسے آناً فاناً گھٹ گئی۔

اس صدی میں ابتدا سے انتہا تک ہندوستان میں کپڑا بُننے کی حرفت کے نشوونما یا بھاپ سے چلنے والے کارگاہوں پر اہل ہند کو اپنے لئے پارچہ بُننا سکھانے یا اپنے قدیم دستی کارگاہوں میں کوئی اختراع کرنے کا کسی کو کچھ خیال نہ تھا اگر اس وقت ایک حقیقی قومی حکومت ہوتی جس کو قومی فلاح و بہبود کا بھی خیال ہوتا تو وہ ہندوستان کی اس قدیم قومی حرفت کو قائم اور محفوظ رکھنے کے لئے جدید اور ترقی یافتہ طریقے ضرور اختیار کرتی اور ہندوستان کے ماہر اور قانع جفاکش اور ہنرمند

کاریگروں اور صنعت گروں کو بھی ایک اچھا سبق ملتا اور ان جدید طریقوں کے اختیار کرنے سے ان کی قدیم حرفت ضرور قائم و محفوظ رہتی۔

مذکورالصدر نقشے میں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ خام ریشم کی برآمد ہی بحالہ تھی اور کچے اون کی برآمد میں اضافہ ہوا تھا مگر سنہ ۱۸۵۰ء سے سنہ ۱۸۵۸ء تک ہندوستان کے ریشمی مصنوعات جن پر انگلستان کے پارچہ بافوں کو اس قدر رشک و حسد تھا ایسے انحطاط میں گرفتار ہو گئے تھے جس سے ان کو پھر کبھی نجات ہی نہیں ملی۔ برخلاف اس کے غلہ و اجناس کی برآمد میں مسلسل ایسا خطرناک اضافہ ہوتا رہا تھا کہ دس سال میں کچھ کم دس لاکھ سے چالیس لاکھ کو یہ برآمد پہنچ گئی تھی۔ دستکاری اور مصنوعات کے انحطاط کا یہ فطری نتیجہ تھا کہ انگلستان کا خراج سالانہ ادا کرنے کے علاوہ اس کے اشیاء درآمد کے معاوضے میں ہندوستان اپنی رعایا کو محروم کر کے روز افزوں غلہ و اجناس مسلسل باہر ارسال کرنے پر مجبور تھا۔ اس صدی کے آخر تک چاول گیہوں اور دیگر اجناس کی برآمد سالانہ ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ انگلیشیہ کی کثیر رقم کو پہنچ چکی تھی۔

کمپنی کی حکمرانی کے آخر سال میں ہندوستانی شکر کی برآمد سے آثار انحطاط نمایاں ہو رہے تھے اور اس صدی کے ختم پر اس قدر کم شکر برآمد ہونے لگی تھی کہ اس کی مجموعی قیمت ...... پونڈ انگلیشیہ سے بھی کم تھی برخلاف اس کے ٹاٹ روئی وغیرہ بنانے کے لئے سن کی برآمد میں بالخصوص جنگ کریمیا کے زمانے سے مسلسل اضافہ ہوتا رہا تھا کیونکہ اس جنگ سے پہلے انگلستان میں روسی سن کی بہت بڑی درآمد تھی جو اس جنگ کی وجہ سے بند ہو گئی تھی اور اس طرح ہندوستانی سن کو انگلستان کی منڈی میں آنے کا ایک موقع مل گیا جو آج تک بحالہ قائم ہے۔ اس صدی کے ختم تک خام سن اور اس کے مصنوعات کی ہندوستان سے برآمد ایک کروڑ پونڈ انگلیشیہ کو پہنچ چکی تھی۔

نیل کی برآمد بھی بہت زیادہ تھی لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس حرفت پر ظلم و تعدی اور بے ضابطگی کا دھبہ لگا۔ بنگالے کے نیل کے یورپی نخلبندوں نے وہ وہ کام کیے تھے کہ لوگوں کو طیش آگیا جس سے آخر کار بنگالے کے اکثر حصوں میں ان خرابیوں کا خود بخود انسداد ہو گیا۔ کاشتکاروں نے ہڑتال کر دی۔ نیل کے کئی کارخانے ڈوب گئے اور نیل کی صنعت پر انحطاط آگیا اس کے متعلق آئندہ کسی باب

میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ مزید برآں اس صدی کے قریب الختم جرمانیہ نے نیل کے مماثل ایک کیمیائی شئے دریافت کر لی تھی جس سے اس قدیم حرفت کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

محصول محترفہ

ہندوستان کی حرفت و صنعت کے متعلق یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۲ء میں سیاہ بخت صوبہ مدراس" کے سوا ہندوستان میں سب جگہ اہل حرفہ اور اہل پیشہ پر جو تکلیف دہ اور پُرزحمت محصول محترفہ تھا وہ اٹھا دیا گیا۔ انجمن اہل مدراس نے دار العوام کو جو درخواست دی تھی اس میں اس محصول کے متعلق یہ بیان کیا گیا تھا کہ یہ "محصول تمام اہل پیشہ اور اہل حرفہ پر لگا دیا گیا ہے اور جن میں جولاہے۔ بڑھئی کسار۔ بیوپاری خواہ ان کی دو کانیں ہوں (جن پر ایک علیحدہ محصول لیا جاتا تھا) خواہ وہ سر راہ بیٹھے اشیاء بیچتے ہوں سب شامل ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے آلات و اوزار پر یا محض بیوپار کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے یہ محصول ادا کرتے تھے۔ غرض یہ محصول تجارت کی معمولی سی معمولی چیز اور یہ مشین درست کرنے والے کے کم قیمت سے کم قیمت آلے پر جس کی لاگت محترفہ محصول کی وجہ سے کیونکہ اس محصول کے ادا کرنے پر اس کے بیچنے یا استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ شش گونہ زیادہ ہو جاتی ہے"۔ اس انجمن نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ "اس محصول کا اثر بہ نسبت مالداروں اور دولتمندوں کے غربا اور کم مایہ لوگوں پر زیادہ پڑتا ہے۔ محترفہ محصول وصول کرنے والوں کو ایسے اختیارات تمیزی حاصل ہیں کہ ان کی بنا پر محصول وصول کرنے والوں کو ہمیشہ بہت بڑا موقع رہتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے لالچ کے مارے جب چاہیں لوگوں کے گھروں پر تحقیقات کے حیلے سے ظلم و تشدد اور استحصال ناجائز کرنے کی غرض سے چلے جائیں اور ان کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ اخذ بیجا کے لیے جبراً سزائے قید دیں اور لوگوں کو بیڑیاں پہنا دیں"۔ اور یہ سب کچھ اسی محصول کی آمدنی کی خاطر حالانکہ "اس محصول سے

جس قدر آمدنی ہوتی ہے وہ صرف ...... ا پونڈ سے کچھ زیادہ ہے"

مذکورالصدر بیان میں کچھ مبالغہ نہ تھا جے ڈبلیو۔ بی ڈائیکس نامی ایک گواہ نے جو مجسٹریٹ اور عہدہ دار مالگزاری بھی تھا اور مدراس میں خود اس نے محصول وصول کیا تھا اس ظلم و تشدد کے متعلق نہایت پُر زور الفاظ میں شہادت دی تھی۔

سوال۔ کیا یہ محصول انھیں اشخاص پر لگایا گیا ہے جو تجارتی کاروبار میں مشغول ہیں؟

جواب۔ یہ محصول قریب قریب اُن سب اشخاص پر ہے جو کاشت نہیں کرتے ...... اگر کوئی بڑھیا منڈی میں ترکاری خرید کر گلی کے نکڑ پر بیچتی ہے تو اس سے ترکاری بیچنے والی کی حیثیت سے یہ محصول وصول کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کپڑے بیچتا ہے تو اس سے بھی محصول لیا جاتا ہے لیکن یوروپی تاجروں سے یہ محصول کوئی وصول نہیں کرتا۔ اس غریب کا جو سال بھر میں دو چار روپے کما لیتا ہے شاید کوئی یوروپی تاجر ہمسایہ ہو جو سینکڑوں روپے تو پیدا کرتا ہے مگر ایک پائی بھی محصول نہیں دیتا۔

۱۸۵۲ء کی پارلیمنٹی تحقیقات کے بعد اس طرح کا حسد انگیز محصول ہندوستان کے کسی حصے میں بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ وہ اٹھا دیا گیا۔ اور ہندوستان کی زمام حکومت سرکار برطانیہ کے ہاتھ میں آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد محصول آمدنی سب پر لگا دیا گیا جو زیادہ واجبی اور مبنی بر انصاف اس لئے تھا کہ یہ طبقۂ رعایا پر برابر لگا دیا گیا تھا اور آگے چل کر اس سے وہ سب غریب مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے جن جن کی آمدنی بہت ہی قلیل تھی۔

گیارھواں باب

آبپاشی اور ریلیں

اٹھارھویں صدی عیسوی کی لڑائیوں کی بنا پر آبپاشی کی بڑی بڑی نہریں جو شمالی ہند میں مسلمان بادشاہوں کی یادگار تھیں بلا مرمت یونہی پڑی تھیں ۱۸۰۳ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر قبضہ شمالی ہند آیا تو اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد کمپنی کے عاملوں نے ان نہروں پر اپنی توجہ مبذول کرنی شروع کی ۱۸۱۰ء میں لارڈ منٹو کے عہد حکومت میں ایک مجلس پیمائش یہ دریافت کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی کہ جمنا کے مشرقی اور مغربی دونوں جانب قدیم نہروں کی اس وقت حالت کیا ہے۔ چیف انجینیر اور صدر افسر پیمائش دونوں کی رائے میں بہت کچھ اختلاف تھا۔ انھوں نے "اپنے اپنے علم و تجربے سے پیمائش رپورٹ میں وہ متضاد طومار باندھ دیا تھا" کہ اس کے وزن کے نیچے دب کر نہروں کی درستی و مرمت کا منصوبہ مٹی میں مل گیا۔

لارڈ ہیسٹنگز نے زیادہ عملی طور پر پھر سے یہ سوال اٹھایا اور ۱۸۱۵ء میں شمالی ہند میں دورہ کرنے کے بعد اس نے اس قدیم نہر کی جو جمنا کے مغربی کنارے پر واقع تھی ترمیم و درستی کے منصوبے کے متعلق بڑی توقع کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ "میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس شکستہ نہر کے معائنہ کے بعد اس اعلے کام کی تکمیل میں ہم کو جو سہولت

حاصل ہے اور جو حکمت عملی اس میں مضمر ہے وہ سب میرے ذہن نشین ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے ملک کے وہ وسیع خطے جو اب افتادہ ہیں زیر کاشت آ جائیں گے اور اس طرح معزز کمپنی کی مالگزاری میں بھی اضافہ ہو گا۔ اس نہر کی آبپاشی پر جس قدر پن کی رقم وصول ہو گی وہ خود ایک خاصی آمدنی ہو گی۔"

چنانچہ لفٹننٹ بلین نے جمنا کی مغربی نہر کی مرمت و درستی شروع کر دی اور نصف صدی کے وقفے سے دہلی تک اس نہر کا پانی پھر آ گیا لیکن یہ کام اس سے آگے نہیں بڑھا تھا کہ ۱۸۲۳ء میں کرنل جان کالون دہلی میں آبپاشی کا صدر مہتمم مقرر ہوا پھر یہ کام سرعت کے ساتھ تکمیل کے قریب پہنچنے لگا۔ ۱۸۳۷ء کی خشک سالی میں اس نہر کے پانی سے سیراب ہونے کی وجہ سے فصل تلف ہو جانے سے بچ گئی تھی اس کی قیمت خام ۱۵ لاکھ پونڈ تخمینہ کی گئی تھی۔ اصل نہر اس کی سب شاخوں کو چھوڑ کر ۴۴۵ میل لمبی تھی۔

اس کے بعد جمنا کی مشرقی نہر پر توجہ مبذول ہونے لگی۔ اس نہر کو بھی مسلمان شہنشاہوں ہی نے بنایا تھا اور اس کو دوبارہ رواں کرنے والے رابرٹ اسمتھ اور کرنل بیرڈ اسمتھ نامی دو مشہور انجینیر گزرے ہیں ان میں سے اول الذکر عہدہ دار مسمی رابرٹ اسمتھ نے اس نہر کے سابقہ اصل نقشے کے موافق ۱۸۳۰ء میں اس کام کی تکمیل کر دی تھی لیکن ابھی تک بہت کچھ کرنا باقی تھا کیونکہ اس میں اہم نقائص پائے گئے تھے۔ کپتان کاٹلی نے ان غلطیوں کی اصلاح کی۔ اس کے بعد بیرڈ اسمتھ اس کا قائمقام مقرر ہوا جس نے دوسرے محکمے میں بھی نظم و نسق کے وہ اعلیٰ خدمات انجام دیے تھے جن کا ذکر کسی آیندہ باب میں آئے گا۔ کرنل برڈ اسمتھ نے تعمیر نہر میں ضروری اصلاحیں اور اضافے کیے اور تکمیل کار کے بعد خود اس نے اس نہر کے متعلق جو (۱۵۵) میل لمبی تھی "انڈین ریویو" نامی رسالے میں بجا طور پر نہایت فخریہ لکھا تھا کہ یہ "درحقیقت تمام اقطاع میں خوشنما ترین نہر ہے اس کے کنارے پر ایک کشادہ سڑک انگلستان کے رہریاول کی طرح ہموار، اس کی دونوں جانب درختوں کی قطاریں نہر پر سایہ فگن اس کے دیدہ زیب پیچ و خم کا دور تک نظر آنا نہایت سرسبز کھیتوں کا دونوں کنارے لہلہانا خوشنما چوکیاں اور خاص احتیاط کے ساتھ ان سب کی حفاظت و نگرانی غرض ان وجوہ سے اس نہر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے اور مناظر میں سب سے

زیادہ دلفریب اور نظروں کو بھانے والا اس کا منظر ہے"۔

نہر گنگا کی تعمیر کمپنی کی حکمرانی کے آخری زمانے سے متعلق ہے۔ اس کار عظیم کی ابتدا لارڈ آکلینڈ نے کی مگر بدنصیبی سے اس کے قائم مقام لارڈ ایلنبرو نے اس کام کو ملتوی کر دیا لیکن بعد کو لارڈ ہارڈنگ نے اس عظیم الشان منصوبے کی حسن و خوبی کو تسلیم کر کے اظہار پسندیدگی کے ساتھ اس کی منظوری دیدی اور مجلس نظماء نے بھی جمنا کی مشرقی اور مغربی نہروں کے مالی نتائج سے خوش ہو کر اس عظیم الشان تعمیر پر دس لاکھ پونڈ انگلیشیہ سے بڑھکر صرف کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کام کی تکمیل سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن کمپنی کے عہد حکومت میں جتنا کام ہوا تھا اس کی حسب ذیل تفصیل کمپنی کی یادداشت میں درج ہے:

"نہر گنگا کا طول اس کی سب شاخوں کو ملا کر $\frac{1}{2}$ ۸۹۸ میل ہو گا اور اس سے ساڑھے چالیس لاکھ ایکڑ رقبے کی خاطر خواہ آبپاشی ہو سکتی ہے۔ شمال مغربی ممالک کے لفٹنٹ گورنر کے لفظوں میں یہ نہر" دراصل آبپاشی کا وہ وسیع نظام ہے جس کی مثال دنیا بھر میں نہیں ملتی اصل نہر کا عرض و طول و عمق اور بعض جگہ پتھر اور اینٹ کی بندش بالخصوص روڑکی اور ہردوار کے درمیان ایسی حیرت انگیز ہے کہ اس سے قوم کے غرور و افتخار میں اضافہ ہوتا ہے' یکم مئی ۱۸۵۶ء تک اس کام پر ۱۵۶۰۰۰۰ پونڈ صرف ہو گئے تھے۔ اور تکمیل تک جملہ مصارف (بیس ۲۰ لاکھ پونڈ سے کم نہیں ہوتے تھے۔ اس نہر سے ابھی ابھی آبپاشی شروع ہوئی تھی اس کے باوجود کرنل بیرڈ سمتھ ناظم آبپاشی کے تخمینے میں ان اراضی کی (جن کی امسال آبپاشی ہوئی تھی) سالانہ پیداوار کی قیمت ۵۰۰۰۰۰ پونڈ اور ۲۰۰۰۰۰۰ پونڈ کے درمیان تھی اور اس نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس نہر سے جب پوری آبپاشی ہونے لگے گی تو اس وقت ۷ لاکھ پونڈ انگلیشیہ کی کثیر رقم تک پیداوار یا لگانی پہنچ جائے گی۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۶ء سے اب تک یہ نہر اتنی دور پہنچ چکی تھی کہ اصل نہر اور اس کی اس سرے کی شاخوں کو ملا کر $\frac{1}{2}$ ۴۹۴ میل تک اس کا پانی بہتا تھا"

۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کا الحاق کر لیا اس زمانے میں وہاں دو قسم کی نہریں تھیں ایک سیلابی نہریں دوسری مستقل اور پختہ نہریں۔

"سیلابی نہروں میں دریاؤں کا پانی کاٹ کر لایا جاتا ہے اور موسم سرما میں

یہ بالکل خشک ہو جاتی ہیں کیونکہ اس زمانے میں دریاؤں میں اتنا اونچا پانی نہیں ہوتا کہ بہکر ان میں آئے لیکن موسم بہار میں جب پہاڑوں سے برف پگھل کر بہتی ہے تو ان دریاؤں کا پانی اونچا ہو کر ان نہروں میں بھر جاتا ہے اور موسم خزاں کے ختم تک بھی یہ نہریں یونہی بھری رہتی ہیں۔ پنجاب کے جنوب مغربی حصے کی سرسبزی کا انحصار زیادہ تر انھیں نہروں پر ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ زمانے میں یہ نہریں سب دریاؤں سے کاٹی گئی تھیں اور سب دریاؤں کا پانی ان میں آتا تھا۔ جہاں جہاں سے ہو کر یہ نہریں بہتی تھیں اس کے آثار اب بھی موجود ہیں اور نہ صرف گاؤں کے کھنڈروں کے پاس بلکہ شہروں اور سرکاری عمارتوں کے بھی جن کا انحصار زمانہ سابق میں کُلیتاً اراضی کی (جن کی ان نہروں سے آبپاشی ہوتی تھی) زرخیزی پر تھا۔ الحاق کے زمانے میں جو نہریں قابل کار تھیں ان میں اور اصلاح کی گئی ان کو طویل و کشادہ بھی کیا گیا اور بہر حال قائم رکھا گیا۔ شکستہ نہروں میں پانی از سر نو رواں کرنے کے منصوبے سوچے گئے اور تخمینۂ مصارف بھی کیا گیا۔ اس کام پر جو خزینہ صرف کیا جا سکتا تھا اس کا زیادہ تر حصہ اس وقت تک مستقل پختہ نہروں کی تعمیر و ترمیم ہی میں لگا دیا گیا۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی نے پنجاب میں جو اہم ترین نہر بنائی تھی وہ بڑی نہر "دوآبہ" کہلاتی تھی اور ۴۵۰ میل لمبی تھی۔ اس عظیم الشان نہر کی تعمیر کے لئے ہندوستان جان لارنس اور لارڈ ڈلہوزی کا ممنونِ احسان ہے۔ جان لارنس بالاصرار حکومت ہند سے ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ ہندوستان میں نہروں اور سڑکوں کی سخت ضرورت ہے اور اس کا دعوہ یہ تھا کہ ان سے مالگزاری میں اتنا اضافہ ہو جائے گا جس سے مصارف کے وہ چندہ رقم فوری واپس مل جائے گی۔ لاہور کی مجلس نے لکھا تھا کہ "اگر ہم ہزاروں آدمیوں کی پرورش کرنا چاہتے ہیں جو انقلاب حکومت کی وجہ سے لازمی طور پر بے روزگار ہو گئے ہوں گے تو ہم اس سے بہتر کام نہیں کر سکتے کہ نئی نہریں کاٹی جائیں اور قدیم نہروں کی تہ سے مٹی اور ریتی نکال کر ان کو درست کیا جائے۔" لارڈ ڈلہوزی نے جواب دیا کہ میں نے وسیع رقبے کی زمینیں ہر جگہ ایسی دیکھی ہیں جو کسی زمانے میں نہایت سرسبز و زرخیز ہوں گی لیکن اب پانی کی محتاجی کی وجہ سے بنجر سی نظر آتی ہیں۔ اگر ان کو پانی ملے تو یہ نہایت ہی زرخیز ہو جائینگی۔" مجلس نظماء نے "خوشی خوشی" اس کام کی منظوری

مادر کی یعنی "بڑی نہر دوآبہ" بنانے کی لیکن اس تنبیہ کے ساتھ کہ یہ کام "نہایت کفایت کے ساتھ" انجام دیا جائے۔

بیرڈ اسمتھ شمالی ہند کی آبپاشی کا ایک ممتاز ترین اور مستند ماہر فن مانا جاتا تھا جب وہ اپنی رخصت کے زمانے میں یورپ گیا تو لمبارڈی اور پیڈمانٹ کی عظیم الشان نہروں کا معائنہ کرنے کے لئے اطالیہ بھی گیا اور بعد میں اسی غرض سے جب وہ ممالک متحدہ امریکہ گیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے سب مصارف کا حقہ ادا کیے۔ یہ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "بڑی نہر دوآبہ" کا کام زور و شور کے ساتھ چلنے لگا۔ ۱۸۵۶ء تک ۲۵۰ میل سے بھی زیادہ دور تک نہر کھودی گئی اور توقع کی جاتی تھی کہ یہ کام ۱۸۵۹ء تک تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس کے جملہ مصارف دس لاکھ پونڈ انگلستانیہ کیے گئے تھے اور توقع تھی کہ اس سے ۳۰۰۰۰۰ پونڈ سالانہ آمدنی ہوگی یعنی جملہ مصارف پر ۱۲ فی صدی وصول ہوں گے۔

صوبۂ بمبئی میں نربدا اور تاپتی کے سوا جن سے صرف چند اضلاع سیراب ہوتے تھے کوئی اور بڑے دریا نہ تھے اور دکن کی سطح زمین ایسی مرتفع تھی کہ وہاں نہروں کے ذریعہ آبپاشی کرنے کا موقع نہ تھا۔ باؤلیوں اور تالابوں سے آبپاشی کرنے کی طرف کمپنی کے عاملوں نے معقول توجہ نہیں کی تھی۔ سندھ میں دریائے سندھ کی طغیانی پر کاشت کا انحصار تھا اور وہاں قدیم نہریں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جن سے اس دریا کا پانی اراضی میں تقسیم ہوتا تھا ان نہروں کی نگہداشت پر کمپنی سالانہ ۲۵۰۰۰ پونڈ صرف کرتی تھی۔

مدراس میں قدیم راجاؤں اور زیالی گانڈوں نے متعدد تالاب اور پانی کے خزانے تعمیر کیے تھے جن کے اب صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس بکانن نے ۱۸۰۰ء میں مدراس سے مغربی ساحل تک اپنی سیاحت کے اثنا میں ان کے متعلق تفصیلی طور پر لکھا ہے۔ ان قدیم ذرائع آبپاشی کی بالالتزام مرمت و درستی جس سے یہ از سر نو کارآمد بن جائیں اور حفاظت ضروری نیز جہاں جہاں ان کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی وہاں سے تالابوں کا کھودنا اور خزانہ ہائے آب تعمیر کرنے سے پچاس ساٹھ سال کے بعد ملک کی حیثیت میں تغیر عظیم ہونا لازمی تھا۔ اور اس طرح

جب سرکار برطانیہ کو اس صوبے کی تفویض عمل میں آئی اس وقت تک یہاں کی زراعت اور آبادی قحط امساک باراں کے اثرات سے بالکل محفوظ ہوگئی تھی لیکن کمپنی نے آبپاشی سے بالکل بے اعتنائی برتی اور جب کبھی کسی کلکٹر نے کسی قدیم خزانہ آب کی مرمت کی بھی تو محض اس غرض سے کہ اپنے ضلع کے سنگین محصول اراضی میں اس سے اور اضافہ ہو جائے۔

صوبۂ مدراس میں چند خطے ایسے بھی ہیں جہاں نہروں سے اعلیٰ پیمانے پر آبپاشی ممکن ہے اور یہ خطے گوداوری کرشنا اور کاویری کے دہانے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے ابتدا ہی میں اصحاب غور و فکر اس بات سے واقف تھے کہ ان دریاؤں سے آبپاشی ممکن تھی۔ جس طرح شمالی ہند کی آبپاشی بیرڈ اسمتھ اور اس کے رفقائے کار کی طرف منسوب کی جاتی ہے اسی طرح جنوبی ہند کی عظیم الشان نہروں کی تعمیر سر آرتھر کاٹن کے نام نامی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور ابدالآباد تک کیجائے گی۔

کولرون دریائے کاویری کی ایک شاخ ہے اور تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کولرون کے ذرائع آبپاشی کی ابتدا جن کو قدمائے ہند نے تعمیر کیا تھا سنہ عیسوی کی دوسری صدی سے ہوئی ہے۔ جب ۱۸۰۱ء میں یہ ملک انگریزوں کے زیر انتظام آیا اس وقت ان قدیم ذرائع آب پاشی کی حالت ناگفتہ بہ تھی دریا کی تہہ میں مٹی اور ریتی آ آکر جم گئی تھی اور آبپاشی کی زمینوں کا رقبہ روز بروز کم ہو رہا تھا۔ شمالی ہند میں جمنا کی نہریں ایسی کامیاب ثابت ہوئیں کہ جنوبی ہند میں کولرون کے ذرائع آبپاشی کی اصلاح و ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء سے زور و شور کے ساتھ یہ کام مسلسل جاری رہا کولرون کی بالائی اور زیرین چادروں کی تعمیر پر ......۸ پونڈ سے کچھ زیادہ ہی صرف کیے گئے اور ضلع تنجور نیز ترچناپلی اور جنوبی ارکاٹ کے کچھ حصے میں ذرائع آبپاشی کو توسیع دینے میں .....۱ پونڈ کی مزید رقم خرچ ہوئی تھی۔ کولرون اور کاویری سے جو اراضی سیراب ہوتی تھی اس کا رقبہ ۶۳۰۰۰۰ ایکڑ سے ۷۱۶۰۰۰ ایکڑ ہو گیا تھا اور مالگزاری میں بھی سالانہ ۴۴۰۰۰ پونڈ کا اضافہ ہوا تھا۔ اس حساب سے مصارف پر ۴۲ فی صدی سے بھی زیادہ وصول ہوتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کار عظیم کی کامیابی اور اس کے نفع بخش نتائج کو اپنے ہی طرف منسوب کر لیا حالانکہ سب کچھ سر آرتھر کاٹن نے کیا تھا کیونکہ سب سے پہلے اسی کو اس کا خیال پیدا ہوا تھا چنانچہ اس نے کولرون کے بالائی پشتے کی تعمیر باوجود کمپنی کی مخالفت کے شروع کی تھی کاٹن کی پیدائش ۱۸۰۳ء میں ہوئی تھی اور ۱۸۲۱ء میں وہ مدراس آیا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں خدمت سے سبکدوش ہو کر ہندوستان سے وطن جانے کے قبل ہی اس نے وہ شہرت حاصل کر لی تھی جو ہندوستان کے کسی دوسرے انجینیر کو کبھی حاصل ہی نہیں ہوئی شمالی ہند کے ناظم آبپاشی مسمی بیرڈ اسمتھ نے لکھا تھا کہ "جس وقت سخت مشکلیں درپیش تھیں۔ اس کے ذرائع بالکل محدود تھے۔ اور بہت کچھ مخالفت ہو رہی تھی اس وقت صرف اپنی ذاتی ذمہ داری پر کرنل کاٹن نے بڑی ہمت کی جو کولرون کے بالائی پشتے کی تعمیر شروع کر دی اور اب تنجور کی دوامی خوشحالی زیادہ تر اسی دریا کی آبپاشی پر مبنی ہے۔"

کولرون کے ذرائع آبپاشی کی تعمیر پر آرتھر کاٹن کا بڑا نام ہو گیا اسی لئے گوداوری کے ذرائع آبپاشی کی تعمیر کے وقت (جن پر اس شہرت کا زیادہ تر انحصار ہے) اس کام کی ذمہ داری لینے کا سب سے زیادہ اہل یہی شخص سمجھا گیا اس نے راجمندری سے (جو قدیم زمانے میں ہندو راجاؤں کا پائے تخت رہا تھا) چند میل کے فاصلے پر ایک مقام کا انتخاب کیا اور دریا پر ایک عظیم الشان چادر تعمیر کی جس کو چار حصوں میں منقسم کیا تھا اور جن کی تعمیر میں دو ٹاپوؤں کو جو دریا کے بیچ میں واقع تھے کام میں لایا تھا۔ اس تعمیر کا تخمینہ مصارف ۲۶۴۰۰۰ پونڈ ہوا تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی اس کام کو نفع بخش سمجھتی تھی اور توقع کرتی تھی کہ اس سے مالگزاری میں ۳۰۰۰۰۰ پونڈ یعنی سالانہ ۱۰۰ فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا۔[1]

---

[1] یادداشت دربارۂ اصلاحات وغیرہ بابتہ ۱۸۵۸ء عیسوی۔
آخر کو اس تعمیر وغیرہ کے مصارف بہت زیادہ ہو گئے تھے اور آبپاشی کے ان مفید و نفع رساں کاموں کے لئے سرمایہ فراہم کرنے پر نہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی رضامند تھی اور نہ نظم و نسق تاج جو کمپنی کے بعد قائم ہوا راضی تھا در ان حالیکہ ریلوں پر بے حساب روپیہ لٹایا جا رہا تھا۔ جب ۱۸۵۸ء عیسوی

اب صرف دریائے کرشنا رہ گیا تھا۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں اس دریا پر بھی ایک چادر تعمیر کی گئی۔ ابتدائً اس کا تخمینہ مصارف ۱۵۵۰۰۰ پونڈ ہوا تھا۔ اور مالگزاری میں ۶۰۰۰۰ پونڈ یعنی بجنسلہ رقم مصارف پر ۳۹ فی صدی سالانہ اضافے کی توقع کی جاتی تھی۔

سنہ ۱۸۵۸ء سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے جن ذرایع آبپاشی کی تعمیر اپنے ذمے لی تھی وہ مذکورالصدر رہی ہیں۔ ان کے مصارف کثیر ہوئے تھے اس لئے کمپنی ایک ایسی واجبی آمدنی کی توقع رکھنے میں تو حق بجانب تھی جو ان کی ایک مبنی بر اعتدال شرح مقرر کر دینے سے ہو سکتی تھی۔ لیکن مذکورالصدر اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ کمپنی نے اس سے بھی تجاوز کیا تھا بالخصوص سیاہ بخت صوبۂ مدراس میں، مالگزاری میں جس قدر اضافہ ممکن تھا اس قدر کر دیا تھا جس کی وجہ سے کمبخت کاشتکاروں کی حالت ویسی ہی افلاس زدہ رہی جیسی پہلے تھی۔ اگر کوئی مالک اراضی اپنی اسامیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے تو بمشکل اس کو فیاض اور دانشمندی کہا جائے گا چہ جائیکہ ایک مملکت عظیم کی حکومت ایک کثیر زرعی آبادی کے ساتھ۔ ہر روشن رائے اور صاحب بصیرت حکومت کا مقصد اولین یہی ہونا چاہئے کہ رعایائے ملک کی ترقی دولت ہو، اور ملک میں اجتماع اصل ہوتا ہے۔

ذرائع آبپاشی کی سرگزشت سے ہندوستان کی ریلوں کی سرگزشت بالکل

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کی مجلس منتخبہ نے سر آرتھر کاٹن کی شہادت قلمبند کی اس وقت کاٹن نے ان امور کا بھی ذکر کیا۔ بتیس ۳۲ سال کی لگاتار کوششوں کے بعد آبپاشی کے لئے صرف سات لاکھ پونڈ منظور ہوئے تھے یعنی سالانہ بیس ۲۰ ہزار پونڈ کے حساب سے اور وہ بھی ایسے کام کے لئے جو ابتدا ہی سے بے انتہا کامیاب ثابت ہوا تھا...... جو مابہ البحث ہے وہ صرف یہی ہے کہ آبپاشی سے ۲۷ فی صدی آمدنی ہو گی یا ۴۰ فی صدی اور بتیس ۳۲ سال کے بعد بھی منجملہ دس لاکھ ایکڑ کی آبپاشی اب ہو رہی ہے .... اسی زمانے میں ناگپور تک ۶۰ میل ریل کی سڑک تعمیر کرنے کے پانچ لاکھ پونڈ مصارف ہوئے تھے اور یہ مسئلہ تھا کہ ۴ فی صدی آمدنی بھی اس سے نہ ہو گی لیکن کسی کو اس پر اعتراض نہ تھا۔"

("جنرل سر آرتھر کاٹن۔ اس کے سوانح حیات اور کارنامے" مولفہ لیڈی ہوپ صفحہ ۲۷۶)

مختلف النوع ہے۔ ذرائع آبپاشی کی ابتدائے تعمیر ہی سے سرکار کو منافع ملتا تھا اور خوب ملتا تھا لیکن ریلوں پر جو مصارف ہوتے تھے ان کا واجبی معاوضہ تک حاصل نہ ہوتا تھا۔ سرکار نے ذرائع آبپاشی کو آمدنی کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا لیکن ریلوں سے سال بسال سرکار کو نقصان ہی نقصان ہو رہا تھا۔ آبپاشی سے فصل ہوتی تھی۔ پیداوار میں اضافہ ہوتا تھا اور امساک باراں کی بناء پر قحط کی کبھی نوبت نہیں آتی تھی ریلوں سے قحط کے زمانے میں قحط زدہ مقامات کو غلہ وغیرہ لیجانے میں مدد ملتی تھی مگر پیداوار میں تو کچھ اضافہ نہیں ہوتا تھا۔

ان حالات کے لحاظ سے ہندوستان کے سے ایک زرعی ملک کی حکومت سے فطرتاً یہی توقع ہو سکتی تھی کہ وہ بمقابل ریلوں کے ذرائع آبپاشی کی زیادہ طرفدار ہوگی، لیکن انگریز خود اپنے ملک میں نہروں کے بہ نسبت ریلوں سے زیادہ واقف تھے اور انھوں نے ہندوستان کی ضرورتوں کے سمجھنے میں یہی غلطی کی۔ برطانوی صناعوں کا بھی یہی خیال تھا کہ بمقابل نہروں کے سے ان کے تجارتی مال کی کھپت کے لیئے ہندوستان میں اندرون ملک نکاس نکل آئے گی اور ہندوستان میں ریلوں کی توسیع اور ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیئے خواہ اُس سے ملک کے محاصل کا نقصان ہی کیوں نہو ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرکار برطانیہ دونوں کے نظم ونسق پر پارلیمنٹ مسلسل دباؤ ڈالتی رہی تھی اور رعایائے ہند اس بارے میں بالکل بے دست و پا تھی کیونکہ نہ تو رعایا کو حق انتخاب حاصل تھا اور نہ حکومت عاملانہ میں رعایا کا کوئی نمایندہ شریک تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ذرائع آبپاشی سے بے اعتنائی برتی اور ملک کی فوری ضرورتوں اور مقدور سے بڑھکر ریلوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہی پسند کیا۔

ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی اور گریٹ انڈین پننشیولا ریلوے کمپنی کے نام سے دو غیر سرکاری انجمنیں ۱۸۴۹ء میں قائم ہوئیں لیکن ان انجمنوں کے بانیوں نے دیکھا کہ بلا امداد سرکار اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیئے سرمایہ فراہم کرنا ان کے لیئے ناممکن تھا اس لیئے حکومت کمپنی سے انھوں نے استدعا کی۔ بڑی ردّ و قدح کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظماء اس شکل میں امداد دینے پر راضی ہو گئے کہ ریلوں کے

سرمائے پر صرف سود کے وہ ذمہ دار و کفیل ہوں گے، اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر ریلوے کمپنی کے صرف شدہ اصل پر خالص آمدنی ۵ فی صدی سے کم ہو تو حکومت ہند ہندوستان کے محاصل سے اس کی تکمیل کر دے گی۔ برخلاف اس کے اگر خالص آمدنی ۵ فی صدی سے زیادہ ہو تو اس اضافے کا نصف ریلوے کمپنی کو اور نصف سرکار کو ملے گا۔ مثلاً ریلوں کی آمد و رفت سے صرف شدہ اصل پر صرف ۴ فی صدی اگر آمدنی ہو تو حکومت ہند شرح سود کی جس کی وہ کفیل ہے گی تکمیل کے لئے اپنی طرف سے ایک فی صدی ادا کرے گی۔ برخلاف اس کے اگر ۷ فی صدی آمدنی ہو تو ریلوے کمپنی کے حصہ دار اس میں سے ۶ فی صدی خود لے لیں گے اور ایک فی صدی سرکار کو دیں گے۔ ریلوے کمپنی کا تمام انتظام خود اسی کے ہاتھ میں رہے گا۔

یہ بھی قرار داد ہوا تھا کہ اگر کمپنی چاہے تو چھ ماہ قبل باضابطہ اطلاع دینے کے بعد اپنے تمام کاروبار سے دست بردار ہو جائے اور پھر حکومت پر یہ لازم تھا کہ وہ تمام صرف شدہ سرمایہ کمپنی کو واپس دیدے۔ حکومت اس بات کی مجاز تھی کہ پچیس اور پھر پچاس سال کی میعاد کے انقضا پر ریلوے کمپنی کے حصص کی رائج الوقت قیمت دیکر لائن خود خرید لے۔ ننانوے (۹۹) سال کے بعد کمپنی کا کارخانہ اور اراضی خود بخود سرکار پر منتقل ہو جاتی تھی لیکن اس وقت انجن اور ریل کے گاڑیوں کو ایک قیمت مقررہ پر سرکار کو خریدنا پڑتا تھا۔

ایسٹ انڈین ریلوے ۱۸۵۴ء میں آمد و رفت کے لئے صرف ۳۷½ میل تک اس ریل کا افتتاح ہوا تھا اور فروری ۱۸۵۵ء میں کلکتے سے رانی گنج تک ۱۲۱ میل تک گاڑی چلتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس زمانے میں ہندوستان کے لئے ایک ایسے عام نظام کا منصوبہ سوچا تھا کہ ریلیں گاڑیوں کو بدلے بغیر ایک مقام سے دوسرے مقام کو سیدھی چلی جائیں اس کے بعد دوسرا اقرار کمپنی اور سرکار کے مابین یہ ہوا تھا کہ کمپنی دہلی تک ریل کی توسیع کرے گی اور اس پر جو کچھ مصارف ہوں گے ان پر ۴½ فی صدی سود کی حکومت کفیل و ذمہ دار رہے گی لیکن آمد و رفت کے لئے اس لائن کے افتتاح سے پہلے غدر ہو گیا اور غدر کے بعد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم ہو گئی۔

گریٹ انڈین پننسیولا ریلوے۔ بمبئی سے کلیانی یعنی ۳۲ میل تک سنہ ۱۸۵۴ء میں پٹریاں بچھانے کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اسی سال نومبر میں اسی ریلوے کمپنی نے مصارف پر ۴½ فی صدی سود کی کفالت پر اس لائن کی توسیع کرنا قبول کر لیا تھا لیکن جدید حصص اجرا کیے گئے سود بھی ۵ فی صدی کر دیا گیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے مزید ۴۵ میل تک ریل کی سڑک تیار ہو چکی تھی۔

مدراس کی ریلیں۔ اس لائن کا پہلا حصہ جو مدراس سے ارکاٹ تک ۶۵ میل لمبا تھا جولائی سنہ ۱۸۵۶ء میں لوگوں کی آمد و رفت کے لئے کھول دیا گیا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختتام نظم و نسق تک اس لائن میں مزید توسیع نہیں ہوئی۔ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء تک جب شہنشاہی ہند کا نظم و نسق براہ راست سرکار برطانیہ کے قبضے میں آگیا تو ان مذکورالصدر تین ۳ کمپنیوں کی ریلوں کے سوا ہندوستان میں کوئی اور ریل نہیں تھی۔

مذکورالصدر تینوں ریلوں میں نقصان ہی نقصان ہو رہا تھا۔ حکومت ہند نے جس حد تک سود کی کفایت قبول کر لی تھی اور اس کی تکمیل میں ریلوے کمپنیوں کو سال بسال جس قدر رقم اس کو دینی پڑتی تھی اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

کفالت سود کے حساب میں حکومتِ ہند نے جس قدر رقم ادا کی

سنہ عیسوی	ایسٹ انڈین ریلوے	گریٹ انڈین پننسیولا ریلوے	مدراس ریلوے
	پونڈ	پونڈ	پونڈ
۱۸۴۹	۵۶۰۲	۰	۰
۱۸۵۰	۱۷۴۷۱	۳۰۶۴	
۱۸۵۱	۳۷۱۸۵	۶۳۱۹	
۱۸۵۲	۴۵۲۳۴	۱۶۳۱۰	
۱۸۵۳	۵۲۰۷۱	۲۲۸۲۵	
۱۸۵۴	۸۸۸۸۴	۲۵۰۰۲	۹۷۰۳
۱۸۵۵	۱۹۵۷۳۰	۳۰۲۵۹	۱۸۱۱۵

۱۸۵۶	۲۹۷۳۹۰	۶۰۳۷۰	۴۲۵۱۰
۱۸۵۷	۳۵۳۵۱۱	۱۱۶۶۱۲	۸۱۱۳۹
۱۸۵۸	۴۳۳۹۶۸	۱۷۵۲۸۹	۱۰۹۲۶
	پونڈ	پونڈ	پونڈ
جملہ	۱۵۲۸۰۴۶	۴۵۶۰۴۹	۲۶۰۷۳۴

ہندوستان میں سال بسال ریلوں میں جیسی جیسی توسیع ہوتی گئی ویسے ویسے رعایا کا نقصان ہوتا گیا۔ لیکن جب تک حکومت سود کی کفیل رہی اس وقت تک ریلوے کمپنیوں کو آمدنی ہوتی رہی اور ہندوستان کے ہر حصے میں ریلیں چلانے کے لئے نئی نئی کمپنیاں قائم ہوتی گئیں۔ مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختتام نظم ونسق سے پہلے سندھ ریلوے کمپنی جس کے حلقۂ عمل میں پنجاب بھی داخل تھا۔ بمبئی بڑودہ اینڈ سنٹرل انڈین ریلوے کمپنی۔ ایسٹرن بنگال ریلوے کمپنی گریٹ ساؤتھ آف انڈیا ریلوے کمپنی۔ کلکتہ اینڈ ساؤتھ ایسٹرن ریلوے کمپنی غرض یہ سب کمپنیاں قائم ہوچکی تھیں لیکن ان کی لائنوں کا افتتاح نہیں ہوا تھا۔

برطانوی صناعوں اور تاجروں کو یہ تعویق بڑی شاق گزر رہی تھی۔ آخرکار ۱۸۵۸ء میں دارالعوام نے "اس تعویق کے اسباب دریافت کرنے کے لئے" ایک مجلس مقرر کی تحقیقات کے بعد اس مجلس نے رپورٹ پیش کی کہ اس تعویق کے حسب ذیل وجوہ تھے :- اس کام پر نگرانی سرکار کا التزام۔ انگلستان سے ہندوستان کی بعد مسافت، فتنہ وفساد اور بغاوت وغدر ملک میں فطری سوانحات ومشکلات وغیرہ۔ اس مجلس نے یہ بھی بیان کیا کہ

"(۱) تعمیرات عامہ کے ایسے عظیم الشان کاموں کا سرانجام سرکار نے جو خانگی کمپنیوں کے سپرد کردیا بہت بڑی عقلمندی کی"۔

(۲) عامۃ الناس کی ترغیب کے لئے تاکہ وہ اس پیمانے کے جدید کاروبار میں اپنا سرمایہ لگائیں حکومت کا اس سرمایے پر جس کی ضرورت تھی سود کی کفالت قبول کرلینا ایک لازمی امر تھا۔

"(۳) ہندوستان کے محاصل کو صرفِ بیجا سے بچانے اور خود حصہ داروں کے اغراض کی حفاظت کے لئے ریلوے کے کاروبار پر سرکاری نگرانی بھی نہایت ضروری ہے۔"

یہ قرینِ قیاس ہے کہ اگر اس مجلس میں رعایائے ہند کی طرف سے کوئی نمایندہ شریک رہتا یا کم سے کم کثیر التعداد ہندوستانیوں کی شہادت ہی اس مجلس نے لی ہوتی تو پھر اس مجلس کی رائے بھی بالکل بدل گئی ہوتی اور ممکن تھا کہ یہ نتیجہ نکالا جاتا کہ ہندوستان کے محاصل کو صرفِ بیجا سے بچانے کے لئے کفالتِ سُود کے نظام کے تحت ہندوستان میں ریلیں نہ بنائی جائیں بجز اس کے کہ کوئی سیاسی اشدّ ضرورت درپیش آئے۔ نیز یہ کہ دوسری سب ریلیں خانگی کمپنیوں ہی پر چھوڑ دی جائیں اور اہم ترین یہ کہ ہندوستان میں نہریں ہی عام طور پر مگر بالخصوص قحط و امساکِ باراں کے زمانے میں حمل و نقل کا ایک کم مصارف ذریعہ ہونے کی بناء پر دراصل رعایا کے زیادہ مناسب حال تھیں ۔

بارھواں باب

نظم و نسق

۱۸۴۳ء میں کمپنی کے جس منشور کی تجدید ہوئی تھی اس کی میعاد ۱۸۵۳ء میں ختم ہونے والی تھی۔ اس کی مکرر تجدید کا مسئلہ زیر غور تھا اور حسب معمول دارالعوام اور دارالامرا کی مجالس منتخبہ نے کمپنی کے سابقہ نظم و نسق کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ ان مجالس منتخبہ نے جو شہادت قلمبند کی تھی اس کو سرکاری رپورٹوں کی شکل میں شائع کیا گیا تھا اور انھیں رپورٹوں میں ملکۂ وکٹوریہ کے ابتدائی عہد کی تاریخ ہند کا نہایت قابل قدر مواد موجود ہے۔

دارالامرا کی مجلس منتخبہ کا انعقاد ۱۸۵۲ء میں ہوا تھا اس مجلس نے کاسمو ملول سر جورج کلارک۔ جان اسٹوارٹ مل کے سے اہم گواہوں کے علاوہ دوسرے اور باوقعت اشخاص کی بھی شہادت لینے کے بعد جون ۱۸۵۲ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی ۱۸۵۲-۵۳ء میں دارالامرا کی ایک اور مجلس منتخبہ کا اجلاس ہوا جس نے اگست ۱۸۵۳ء میں تین رپورٹیں پیش کیں۔ اس مجلس نے جن گواہوں کی شہادت قلمبند کی تھی ان میں ہندوستان کے ایسے مشاہیر بھی شامل تھے جیسے لارڈ ہارڈنگ لارڈ گوف۔ سر چارلس نے پیئر۔ سر ایڈورڈ ریائن۔ سر ارسکن پیری۔ سر چارلس ٹریویلین

فریڈرک ہیلی ڈے ۔ جورج کیمبل ۔ الگزانڈر ڈف ۔ جان مارشمن اور ہارس ہیمن ولسن اسی طرح دارالعوام کی مجلس منتخبہ بھی جو لارڈ جان رسل وزیر مال اور سر چارلس ووڈ کابڈن ۔ گلیڈسٹن وغیرہ ارکان پارلیمنٹ پر مشتمل تھی ۱۸۵۲ء میں منعقد ہوئی اور لارڈ الفنسٹن ۔ لارڈ ایلنبرو ۔ لارڈ ہارڈنگ ۔ سر جورج کلارک ۔ کاسمو ملول ۔ ہنری ٹوبی پرنسپ وغیرہ گواہوں کی شہادت لینے کے بعد جون ۱۸۵۲ء میں اس مجلس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ۔ دارالعوام کی ایک اور مجلس منتخبہ جس کے مذکورالصدر اشخاص کے علاوہ مکالے لارڈ اسٹینلی اور لارڈ پامرسٹن بھی ارکان تھے ۔ پارلیمنٹ کے ۱۸۵۲-۱۸۵۳ء کے اجلاس کے اثنا میں منعقد ہوئی اور اس مجلس نے سر جورج کلارک ۔ سر ایڈورڈ رائن سر ارسکن پری سر چارلس ٹریویلین، فریڈرک ہیلی ڈے ۔ ہے کیمرن ۔ مارٹنر برڈ ڈاکٹر رویل جان سلیون ۔ جان مارشمن وغیرہ گواہوں کی شہادت قلمبند کرنے کے بعد ۱۸۵۳ء میں مئی اور اگست کے درمیان چھ رپورٹیں پیش کیں ۔

اس باب کی مختصر گنجائش میں اس شہادت کا جو چار ہزار صفحوں کی گیارہ رپورٹوں میں پیش ہوئی تھی خلاصہ کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے ۔ البتہ ہم سے یہ ممکن ہے کہ ہم قارئین کے سامنے اس زمانے کے چند اہم ترین مسائل پر اس زمانے کے چند ممتاز و سربرآوردہ اشخاص کے خیالات و آرا پیش کر دیں ۔ ملکۂ وکٹوریہ کے ابتدائی عہد کے نظم و نسق ہند پر ایسے اشخاص کے خیالات و آرا کی مدد سے جنھوں نے خود اس نظم و نسق میں حصہ لیا تھا تبصرہ کرنے میں یہ خاص فائدہ ہے کہ ہمیں صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ نظام کیا تھا بلکہ یہ بھی کہ وہ کس طرح چلتا تھا اور صرف اسی بات سے واقفیت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کیا اصول تھے جو منتظمین مملکت کے رہنمائے کار رہے تھے بلکہ اس سے بھی کہ خود نظم و نسق کی شکل و ہئیت اس وقت کیسی تھی کیونکہ ان لوگوں کے (جنھوں نے شہنشاہی ہند کی کثیر آبادی میں رہ کر نظم و نسق کا کام کرتے کرتے تیس چالیس سال اپنی عمر کے گزار دیئے تھے) بیانات پڑھنے کے بعد نظم و نسق کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے

دو عملی

۱۸۳۳ء کے قانون ہند مرتبہ پٹ کے نفاذ کے بعد ۱۸۳۴ء کا قانون ہند نافذ

ہوا جس کی رُو سے ہندوستان میں دو عملی قائم ہوگئی۔ چنانچہ نظم ونسق کے اختیارات تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے چوبیس (۲۴) نظما ہی کے تفویض رہے لیکن نگرانی کے اختیارات مجلس نظم کو جس کے ارکان کا انتخاب خود سرکار برطانیہ کرتی تھی دے دیئے گئے سنہ ۱۷۸۴ء سے کمپنی کی تاجرانہ حیثیت باقی نہیں رہی تھی بلکہ وہ محض منتظم مملکت ہند بن گئی تھی۔ اور یہ بھی شرط لگا دی گئی تھی کہ نظمائے کمپنی کے تمام اختیارات بجز ان تقررات کے جنکی اس قانون میں تخصیص کر دی گئی تھی۔ مجلس نظم کی نگرانی رہے گی۔ ہر بات کی ابتدا مجلس نظماء کے ہاتھوں میں تھی اور ہر بات پر نگرانی مجلس نظم کے ذمے تھی سہولت کار کے خیال سے چوبیس (۲۴) نظماء نے اپنی تین مختلف مجالس قائم کر لی تھیں جن کے حسب ذیل نام تھے:-

"مجلس مالیات" "سیاسی اور فوجی معاملات کی مجلس" "مالگزاری اور عدالتی معاملات کی مجلس"۔

البتہ ایک اہم امر ایسا تھا جس کے آغاز کرنے کا مجلس نظماء کو کچھ اختیار نہ تھا اور وہ صلح وجنگ تھی جس کو "مجلس نظم" بلا امتزاج نظمائے کمپنی کمپنی کی "مجلس معاملات راز" کے توسط سے خود کرتی تھی۔ "یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام امور جن کی سیاسی اہمیت بہت بڑی تھی اور جن میں صلح وجنگ کا مسئلہ بھی شامل تھا ایک طرح براہ راست وزیر دولت برطانیہ ہی کی زیر ہدایت و نگرانی تھے کیونکہ اس بارے میں جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ صرف ہندوستان کے حکام صدر کی اطلاع سے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی "مجلس معاملات راز" کے توسط سے جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظماء کو کچھ دخل نہ تھا ہوتا تھا"۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مجلس نظم کے میر مجلس کی ایما سے جو برطانوی کابینہ کا رکن ہوتا تھا اور مجلس نظماء کے علم کے بغیر ہندوستان لڑائیوں میں اکثر پھنس جاتا تھا۔ اگر اس معاملے میں مجلس نظماء کو بھی کچھ اختیار ہوتا تو پھر جنگ افغان جس کی لارڈ آکلینڈ نے ابتدا کی تھی اور "جس میں ۰۰۰ ۵ا جانوں کا اتلاف اور ڈیڑھ کھا روپے کے مصارف عائد ہوئے تھے شاید کبھی وقوع ہی میں نہ آتی"۔ سر ٹی۔ ایچ۔ میڈکس نے دارالعوام کی مجلس تحقیق کے سامنے سنہ ۱۸۵۲ء میں اپنی شہادت میں بیان کیا تھا کہ "جنگ برما کے آغاز کے اسباب اس کی وقتاً فوقتاً کیفیت اور موجودہ حالت کا مجلس نظماء کو کچھ بھی علم نہیں۔

میں نے دو مرتبہ اُس کے کاغذات مانگے تھے لیکن مجھ سے دو دفعہ یہی کہا گیا کہ ان کاغذات کا مجلس نظماء کو بھیجنا نامناسب خیال کیا جاتا ہے۔"

یہاں یہ بتانا ضروری نہیں کہ اس غیر اطمینان بخش انتظام سے یہ ہوتا تھا کہ لارڈ پامرسٹن کے سے شہنشاہی پسند وزرائے برطانیہ محض انگلستان کے شہنشاہی اغراض کی خاطر ہندوستان کو جنگ و مہمات میں پھنسا دے سکتے تھے اور دیتے تھے اور مجلس نظماء کو اس جنگ و جدل کے مصارف جو اس کی رضامندی یا علم کے بغیر ہوتے تھے ادا کرنا پڑتا تھا پہلے ہی سے مجلس نظماء متعدد قصور و خطا کی جواب دہ تھی اب اس نے یہ گناہ اور کیا کہ ہندوستان کے ایک قدیم قانون کا غلط منشا نکال کر دیسی ریاستوں کا الحاق کرنا شروع کر دیا جس سے اسکا جلد خاتمہ ہونے کی صورت پیدا ہوگئی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ ملکۂ وکٹوریہ کے ابتدائی عہد کی بد سے بدتر لڑائیوں کی مثلاً جو افغانستان، سندھ اور برما سے ہوئی تھی ازروئے انصاف مجلس نظماء جواب دہ و ذمہ دار نہیں تھی۔

دستورِ حکومت کے اس نقص سے قطع نظر کرکے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلاشبہ یہ دوعملی عملاً کچھ ایسی بری نہ تھی۔ اس سے ایک طرف تو نظمائے کمپنی پر نگرانی رہتی تھی جس کی ضرورت بھی تھی اور دوسری طرف وزرائے دولت برطانیہ کو مطلق العنان اور غیر ذمہ دارانہ اختیارات ملنے سے جو خرابی پیدا ہوسکتی تھی وہ نہیں ہونے پائی تھی۔ لارڈ ہارڈنگ نے جو سب سے زیادہ دانشور و قابل گورنر جنرل گزرا ہے سنہ ۱۸۵۲ء میں دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں کہا تھا کہ "سرکار برطانیہ کو عوام کے سامنے زیادہ نمایاں طور پر ہر وقت پیش کرنے کے بجائے اس دوعملی کا ہونا ہی زیادہ مصلحت اور دانائی پر مبنی ہے" اس کے علاوہ انیسویں (۱۹) صدی عیسوی کے انگریزوں کے سب سے زیادہ پُرمغز و دور اندیش فیلسوف حکیم یعنے جان اسٹوارٹ مل نے اس نظام کو پسند کیا تھا۔ مل سنہ ۱۸۵۸ء تک یعنے تیس (۳۰) سال تک چونکہ ہند کے صیغہ تنقیح مراسلات میں مددگار رہ چکا تھا اس لئے جس نظام کے تحت وہ کارفرما رہا تھا اس کے متعلق زیادہ وثوق اور واقفیت کے ساتھ وہ بیان کرسکتا تھا۔

جان اسٹوارٹ مل کی شہادت

"یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ایک ملک میں کسی غیر ملک کے لئے ایک ایسا عضوِ حکومت

اختراع کیا جائے جس کو جو بی حکومت سے زیادہ دلچسپی ہو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی جماعت قائم کی جائے جس کو ربی حکومت سے اوّل درجہ دلچسپی ہو اور میرا تو خیال یہ ہے کہ ہندوستان معاملات کے تصفیئے کے لئے اس ملک میں جو حکمراں جماعتیں اب موجود ہیں، ان میں ہر قسم کی بدنیتی اور بدباطنی اس طرح مفقود ہے جس طرح دنیا کی کسی اچھی سے اچھی حکومت میں ہو سکتی ہے۔"

"مجلس نظماء صرف تحریک کنندہ جماعت ہے۔ آخری فیصلہ صادر کرنے والی جماعت نہیں اور حکام بالا کی بلامنظوری بطور خود کچھ نہیں کر سکتی اور محض استدلال کے سوا حکام بالا کو اپنی بات منوانے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ ان حالات میں اس قبیل کی جماعت ہی اپنی کارروائی کے تمام دلایل کی کمال احتیاط کے ساتھ چھان بین کر سکتی ہے۔ ورنہ ایسی جماعت کو اختیار تحریک کے ساتھ ساتھ اختیار حکم آخر بھی مل جائے تو پھر یہ بات نہ رہے۔"

"محض ایک وزیر ہند کے توسط سے ہندوستان پر حکمرانی کرنے سے بڑھکر کوئی اور مطلق العنان حکومت اس ملک میں تو ہو نہیں سکتی کیونکہ ایسی حالت میں بحث مباحثہ اور غور و خوض کرنے کا موقع ہی نہیں بجز اس گفتگو کے جو وزیر ہند اور اس کے زیر دستوں میں شاید ہوتی ہو، لیکن وزیر ہند پر اپنے زیر دستوں کی صلاح اور مشورے کا سننا کچھ لازم نہیں ہے اور اگر لازم بھی ہو تو اس کے زیر دست جو کچھ صلاح و مشورہ دیں گے اس کے وہ ذمہ دار ہرگز نہ ہوں گے۔"

جان اسٹوارٹ مل کو اس رائے کا اظہار کیے پچاس سال گزر گیے اور اب ہمارے پنجاہ سالہ تجربے سے بھی اس فیلسوف اعظم کی دوراندیشی اور دانائی ثابت ہوتی ہے۔ ان پچاس برسوں میں جیسے جیسے عام تجربہ وسیع ہوتا گیا ہندوستان کے نظم و نسق میں بھی کئی طرح سے یقیناً اصلاح ہوتی گئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر ہند کی غیر ذمہ دارانہ حکومت سے نہایت ہی مضر نتائج مرتب ہوتے رہے۔ مجلس نظماء پر مجلس نظم کی جیسی نگرانی تھی ویسی حقیقی طور پر وزیر ہند کے افعال پر کسی کی نہ تھی۔ کمپنی کے منشور کی ہر تجدید کے وقت کمپنی کے نظم و نسق کے متعلق جیسی تحقیقات ہوتی تھی ویسی میعادی تحقیقات موجودہ نظم و نسق کے متعلق کبھی نہیں ہوئی۔ کمپنی پر جس طرح بدگمانی اور مفید نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ اس طرح

موجودہ حکومت ہند پر اس کے افعال کی روک تھام اور اصلاح کے لئے کوئی بدگمانی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی۔ اسی لیے غیر ذمہ دارانہ نظم و نسق کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلا۔ صرف معاملات مالیہ ہی کو لیجئے کمپنی کے آخری پچاس سالہ نظم و نسق میں ہندوستان کے محاصل اوسطاً تین کروڑ پونڈ انگلیشیہ تھے اور اس رقم میں سے صرف ۳۵ لاکھ پونڈ مطالبات وطن کی تکمیل کے لئے انگلستان ارسال ہوتے تھے لیکن ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے آخری سال (۱۹۰۰ء - ۱۹۰۱ء) ہندوستان کے محاصل دو چند ہو گئے تھے۔ یعنے ریلوے اور آبپاشی کے وصولات کو چھوڑکر یہ پانچ کروڑ پچاس لاکھ پونڈ تھے حالانکہ شہنشاہی کی وسعت بعینہٖ پہلی سی تھی اور لوگوں کی دولت اور آمدنی میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا تھا اور اس پچ مطالبات وطن کی تکمیل کے لئے ایک کروڑ ستر لاکھ سے بھی زیادہ رقم انگلستان ارسال ہوتی تھی یہ کثیر المقدار معاشی سوتا وجو پچاس سال کے اندر اندر پنچ گونہ بڑھ گیا تھا اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہوتی تو اس کے تحت بالکل ناممکن الوقوع تھا۔

برطانوی تاجروں کے خیالات

برطانوی تجار و صناع کی ہمیشہ خواہش یہی تھی کہ ہندوستان میں اچھا انتظام قائم رہے لیکن ان کو "اچھی حکومت سے زیادہ دلچسپی" نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی اور ظاہر ہے کہ صرف اچھی حکومت ہی سے اچھا انتظام قائم ہو سکتا ہے ان لوگوں کا مقتضائے فطرت ہی یہ تھا کہ فقط اپنے تجارتی اور صنعتی اغراض کو زیادہ تر پیش نظر رکھیں چنانچہ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی برخاست کردی جائے اور ہندوستان کو براہِ راست وزیر دولت برطانیہ کے زیر نگرانی کر دیا جائے تو پھر اس وزیر پر دباؤ ڈال کر برطانوی تجارت کے لئے اس سے بہت کچھ سہولتیں حاصل کی جا سکتی ہیں اس لئے ہمیں اس پر تعجب نہیں ہوتا کہ مینچسٹر۔ برمنگھم اور لورپول کو لارڈ ہارڈنگ اور جان اسٹوارٹ مل سے اختلاف رائے تھا کیونکہ ان شہروں کی صلاح یہی تھی کہ ہندوستان پر وزیر دولت برطانیہ کے توسط ہی سے حکومت کی جائے۔

شہر مینچسٹر کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوا جس میں یہ تحریک منظور ہوی کہ "ہندوستان

میں بدنظمی کی اصلاح اس وقت تک یقینی طور پر نہیں ہو سکتی جب تک کہ حکومت دکن کی مکمل اصلاح نہ ہو لے۔ اور ہماری رائے یہ ہے کہ مجلس نظماء اور مالکان کمپنی کو حکومت ہند سے کچھ سروکار نہیں ہونا چاہئے اور آیندہ اس ملک میں حکومت ہند پر نگرانی رکھنے کے لئے ایک وزیر اور اس کی کونسل سرکار کی طرف سے مامور ہونی چاہئے جو شہنشاہی پارلیمنٹ کو براہ راست جواب دہ رہے۔"

لورپول کی ایک انجمن "ایسٹ انڈیا اینڈ چینا اسوسی ایشن" نے "ہندوستان کی بندرگاہوں سے پیداوار و مال تجارت کے اندرون ملک لانے اور لیجانے کے لئے ذرائع آمد و رفت میں" اصلاح کی ضرورت بتائی تھی۔ ہندوستان کے بے انتہا محصول اراضی اور طلائی معیار کے موقوف کر دینے پر سخت اعتراضات کیے تھے۔ عدالت اور کوتوالی کا اچھا انتظام قائم کرنے کی استدعا کی تھی۔ محکمہ چنگی کی تعویق کے متعلق بہت کچھ کہا تھا اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ یہ صلاح دی تھی کہ "ہندوستان پر مجلس نظم کی براہ راست نگرانی اور اقتدار کو ایک نہ ایک شکل میں زیادہ وسیع کرنے کی سخت ضرورت تھی۔"

برمنگھم کے باشندوں نے ایک عام جلسہ کیا تھا جس میں انھوں نے تکرار نہ مطالبات پیش کیے تھے اور پارلیمنٹ سے درخواست کی تھی کہ "ہندوستان کی دو عملی مسدود کر دی جائے اور خود انگلستان میں ہندوستان کے لئے ایک نظم و نسق الیماقد کم کیا جائے جس کا تقرر حکومت برطانیہ ہی کے ہاتھ میں ہو اور جو شہنشاہی پارلیمنٹ کو براہ راست جواب دہ ہو۔"

برطانوی شہنشاہیت کے نظم و نسق کی حکمت عملی کا تعین حکماء و مدبرین کے ہاتھوں میں نہیں تھا بلکہ برطانیۂ عظمی کے تاجروں صناعوں اور رائے دہندگان کے ہاتھوں میں تھا اور جبکہ برطانیۂ عظمی کے تاجروں اور صناعوں نے ہندوستان کے لئے تاج برطانیہ کی حکومت ہی پسند کی تھی تو پھر آیندہ چل کر کبھی نہ کبھی اس طرح کی حکومت کا آغاز ہونا ایک لازمی امر تھا۔

نیابت کا مطالبہ

اہل ہند کے مطالبۂ نیابت کی بھنک سات سمندروں پار پہلے پہل کانوں میں

پڑنے لگی تھی۔

انجمن اہل مدراس اور صوبۂ مدراس کے اصل باشندوں نے یہ صلاح دی تھی کہ "مدراس کی کونسل میں سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کی تعداد مساوی اور ہر جماعت سے چھ یا سات اشخاص کا انتخاب ہونا چاہئے سرکاری ارکان کا تقرر ان کے عہدے کے لحاظ سے خود سرکار کر سکتی ہے مثلاً صدر وکیل سرکار ایک رکن ہو سکتا ہے مگر غیر سرکاری ارکان کی حد تک گورنر ان اٹھارہ یا بیس اشخاص میں سے جن کو مدراس کے محصول دہندگان نے منتخب کیا ہو یا اُن لوگوں میں سے جن کو چھوٹی اور بڑی جیوری کی خدمت بجالانے کا حق حاصل ہے ارکان کا انتخاب کر سکتا ہے یا جیسا معزز دار العوام کی دانست میں مناسب ہو۔ عند الضرورت سرکاری ارکان گورنر کی فیصلہ کن رائے کی بنا پر کسی اہم معاملے میں حکومت کے حسب منشاء تصفیہ کر سکتے ہیں۔ اس مجوزہ منصوبے کے سرانجام میں کوئی رکاوٹیں نہیں ہیں اور تمام معاملات میں معقول طور پر سب کو معلومات حاصل ہو سکتی ہیں"۔

انجمن بمبئی کے ارکان اور صوبۂ بمبئی کے اصل باشندوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ "اب وقت آچکا ہے کہ ہندوستانی اپنے ملک کے انتظامی معاملات میں بمقابل سابق کے زیادہ حصہ لینے لگیں اور جیسا لارڈ ڈالہنرو۔ لارڈ الفنسٹن وغیرہ کی رائے تھی مقامی حکومت کی کونسلوں میں وضع قوانین کے معاملات اور حکمت عملی کی تشکیل میں جن سے ملک کو بھی عام دلچسپی ہے سمجھدار اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو حصہ لینے اور ان معاملات پر بحث کرنے کا موقع دینا چاہئے"۔

انجمن برطانوی ہند اور صوبۂ بنگالہ کے دوسرے اصلی باشندوں نے پارلیمنٹ کے بغور ملاحظہ کرنے کے لئے یہ تحریک پیش کی تھی کہ کلکتہ میں ایک مجلس وضع قوانین قائم کی جائے جو سات ارکان پر مشتمل رہے ان میں سے تین ارکان تو تین صوبوں کے دیسی باشندوں کی طرف سے وہاں کے قابل اور معزز دیسی اشخاص میں سے منتخب ہونے چاہئیں ایک ایک رکن ہر صوبے کا گورنر اپنے دیوانی تجربہ کار عہدہ داروں میں سے سرکاری اغراض کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کر سکتا ہے اور ایک رکن تاج برطانیہ کی طرف سے بھی مقرر کیا جا سکتا ہے"۔

جس وقت ہندوستانیوں کی انجمنیں نیابت کے لئے ڈرتے ڈرتے کمال احتیاط

کے ساتھ اس طرح دعوے کر رہی تھیں اسی وقت ۱۸۳۳ء کے قانون کی اُس مشہور دفعہ کے موافق جس پر دارالعوام میں زور شور کے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے گیے تھے۔ مگر جس کو ہندوستان میں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا تھا ان انجمنوں نے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کی پُرزور تائید بھی کی تھی۔ انگریز گواہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ اہل ہند کے ساتھ سرکار نے صریح وعدہ خلافی کی ہے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے رکن قانونی (۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۸ء) مسمی ہے کیمرن نے بھی اس پر بہت زور ڈالا تھا۔

لارڈ مونٹ ایگل۔ جس حد تک کسی بات کا اظہار کر دینا ہوتا ہے اس حد تک اُس آخری قانون کی دفعہ ۸۷ کی رو سے عام طور پر دیسیوں کے استحقاق خدمت کے متعلق جو اظہار خیال کر دیا گیا ہے کیا اس سے بھی زیادہ حتمی طور پر اُس خیال کا اظہار کرنا ممکن ہے؟

ہے کیمرن۔ جی نہیں کیونکہ میرے خیال میں یہ نہایت ہی پُرزور اور صاف وصریح طریقے پر کر دیا گیا ہے۔۔۔۔۔

لارڈ مونٹ ایگل۔ اگر اس قانونی دفعہ کو اسی وسیع معنی میں لیں جو معنی اس کے آپ لیتے ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عملی نتائج ایسے واقع ہوئے ہیں جن سے اس دفعہ کو مرتب کرنے والوں کے توقعات پورے ہوتے ہیں؟

ہے کیمرن۔ جی نہیں بلکہ بالکل اس کے برخلاف عمل ہوا ہے۔ میرے علم میں ایک بھی دیسی شخص ایسا نہیں ہے جس کی حیثیت اس قانونی دفعہ کی بنا پر اس سے بہتر ہو گئی ہو جو اس دفعہ کے نافذ نہ ہونے کی صورت میں آج اس کی رہتی۔

سر چارلس ٹریویلین کی شہادت تو اس سے بھی زیادہ پُرزور تھی اس نے گزشتہ زمانے کے شہنشاہی اقوام مثلاً مقدونیہ اور روما کی قوموں کا حوالہ دیا اور بتایا کہ مفتوح اقوام اور فاتحین میں "ہر بات میں بالکل مساوات" قائم رکھنے سے کیسی وسیع شہنشائیاں کتنی طویل مدت تک برقرار رہی تھیں اور اپنی یہ رائے بھی ظاہر کی تھی کہ "ہندوستان پر ہمارا شہنشاہی اقتدار مدت مدید تک قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم دیسیوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر ذمہ دارانہ خدمتوں پر ان کو مامور کریں اور اس کے لئے ان کو تعلیم دی جائے تاکہ وہ اپنے فرائض زیادہ قابلیت اور صلاحیت کے ساتھ بجالائیں"

پہلا "قانون اصلاح" انگلستان میں نافذ ہونے کے صرف ایک سال بعد جب کہ حقیقی "جدت پسندی" بھی عروج ہی پر تھی کہ ۱۸۳۳ء کا قانون جاری کیا گیا۔ اس کے بعد سے انگلستان میں حقیقی "جدت پسندی" کا انحطاط ہونے لگا اور شہنشاہی پسند جماعت جب اقتدار پر پہنچی تو اہل ہند پر وہ پہلا سا التفات باقی نہ رہا تھا۔ فرانسس رابنسن نے بھی جو ہندوستان میں جج اور مجلس مالگزاری کا ایک رکن رہ چکا تھا اس افسوسناک واقعہ کی تصدیق کی تھی۔

چنانچہ اس نے کہا تھا کہ "حکمراں قوم محکوم قوم کو نہایت ہی نفرت کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس بات کو لارڈ ولیم بنٹنک سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا اور اسی نے سب سے پہلے اس جذبے کی روک تھام کی اور دیسیوں کے معاشرتی ترقی مدارج کی کوشش کی تھی"۔

فرانسس رابنسن سے استفسار کیا گیا کہ "کیا آپ اس مجلس کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب سے خود لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل وقت نے اپنی تجاویز سے اس مضمون کی طرف عام توجہ منعطف کرائی تھی اس وقت سے دیسیوں پر جو التفات کیا جاتا تھا آیا اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے یا نہیں"؟

اس کا فرانسس رابنسن نے یہ جواب دیا کہ "میرے خیال میں اس بارے میں اب خیالات بدل گئے ہیں۔ لارڈ ولیم بنٹنک کے زمانے سے یہ تغیر خیالات نمایاں ہے"!

لارڈ ولیم بنٹنک کی اصلاحوں کو دو قرن گزر چکے۔ اس نے اعتماد اور ذمہ داری کی نئی نئی خدمتیں ہندوستانیوں کے لئے قائم کرنے کی کوشش کی تھی مثلاً صدر امنا، حلقہ ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹروں کی خدمتیں اسی نے قائم کی تھیں۔

لیکن بنٹنک کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی نظم و نسق دیوانی میں ہندوستانیوں کی تعداد ۱۸۲۸ء میں یعنے جس سال لارڈ ولیم بنٹنک ہندوستان آیا تھا کیا تھی اور اس کے ۲۵ سال بعد ۱۸۴۹ء میں کیا ہوگئی اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

صدر امناء حلقہ	سنہ ۱۸۲۸ء	سنہ ۱۸۴۹ء
—	—	۶۴
صدر امین	۱۵۷	۸۱
منصف	۸۶	۲۹۴
ڈپٹی مجسٹریٹ	....	۱۱
ڈپٹی اور مددگار کلکٹر	....	۸۶
مددگار سب کلکٹر	....	۲۷
مہتمان آبکاری	....	۱۵
تحصیلدار	۳۵۶	۲۷۶
سررشتہ دار	۳۶۷	۱۵۵
معاملہ دار	۹	۱۱۰
دفتر دار	۳	۱۹
کماوسدار	۵۷	....
عدالتی	....	۵
میر منشی	....	۱
تعلیمات	۱۴	۴۷۹
متفرق	۱۴۹	۹۹۰
میزان	۱۱۹۷	۲۸۱۳

سنہ ۱۸۴۹ء میں تین ہزار سے بھی کم ہندوستانی انگریزی سرکار کے حلقہ ملازمت میں داخل تھے اور ایک ہزار سے بھی کم ہندوستانی اعزاز۔ اعتماد اور ذمہ داری کی خدمتوں پر مامور تھے۔

عاملانہ نظم و نسق

سنہ ۱۸۳۳ء کے قانون کی رُو سے جو اپریل سنہ ۱۸۳۴ء میں نافذ العمل ہوا چند اہم تغیرات

عمل میں آئے۔ مثلاً بنگالے اور آگرے کے انتظام کے لئے علٰحدہ علٰحدہ حکومتیں قائم کی گئیں بنگالہ اب بھی گورنر جنرل ہند لارڈ بنٹنک کے براہ راست زیر انتظام تھا مگر سر چارلس مٹکاف آگرے کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ گورنر جنرل کی کونسل میں رکن قانونی کی ایک جگہ قائم کی گئی اور مکالے پہلا شخص تھا جو اس خدمت پر مامور ہو کر ہندوستان آیا۔ اب تک تو ہر صوبہ مثلاً صوبہ بنگالہ صوبہ مدراس صوبہ بمبئی اپنا اپنا دستور العمل نافذ کر لیتا تھا لیکن اب گورنر جنرل اس بات کا مجاز کیا گیا کہ اپنی کونسل کی مدد سے وہ قوانین نافذ کرے اور اور یہ قوانین تمام ہندوستان کے لئے واجب التعمیل تھے۔

اس زمانے میں بنگالے کے لئے کوئی علٰحدہ گورنر مقرر نہ تھا۔ گورنر جنرل ہند ہی گورنر بنگالہ تھا اور معتمدی حکومت ہند و بنگالہ پر ہنری ٹوبی پرنسپ کے تقرر کا اعلان سرکاری جریدے میں کر دیا گیا۔

مدراس اور بمبئی بھی اصولاً گورنر جنرل ہند ہی کے براہ راست تحت کر دیئے گئے تھے نگران صوبوں کے نظم و نسق کو دراصل جو عملی خودمختاری حاصل تھی اس میں مداخلت کرنے کی طرف بدنصیبی سے کسی کا رجحان نہ تھا۔ "گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کلکتے سے حکومت مدراس اور حکومت بمبئی کے اندرونی انتظامات میں شاذ ہی مداخلت کرتا ہے مثلاً مالیات میں مداخلت اسی وقت کرتا ہے جب رقم صرف کرنے کا سوال ہوتا ہے یا کبھی وضع قوانین سے متعلق معاملات میں بھی مداخلت کرتا ہے لیکن مالگزاری کوتوالی اور عدالت کے معاملات میں تو مداخلت قریب قریب نہیں کرتا۔"

جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق عمل میں آیا تو اس کو پانچواں صوبہ قرار دیا گیا اور ایک مجلس کے زیر انتظام کر دیا گیا جو لارنس نامی دونوں بھائیوں اور منسیل پر مشتمل تھی جیسا پچھلے باب میں بیان ہوا ہے۔ اس کے تین سال بعد یہ مجلس برخاست کر دی گئی اور جان لارنس ۱۸۵۲ء میں پنجاب کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔

ہر صوبے کو اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا اور اضلاع کے عہدہ داران کو فوجداری اور مالگزاری کے اختیارات اور عدالتی فرائض تفویض تھے انھیں نامکمل ابتدائی طریقوں پر جن کو وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس نے گذشتہ صدی عیسوی میں مقرر کیا تھا ملک کا نظم و نسق چلاتے تھے۔ اہم تر فوجداری مقدمات کی جج سماعت کرتے تھے اور یہی

جج اور ان کے زیر دست دیسی ملازمین سرکار تمام دیوانی مقدمات کا تصفیہ کرتے تھے۔

عدالتی نظم ونسق

ہر صوبے میں دو اعلےٰ عدالتیں تھیں ایک صدر عدالت جو کمپنی کے ملازمین دیوانی پر مشتمل تھی اور دوسری بادشاہی عدالت جو ان ججوں پر مشتمل تھی جن کا تقرر تاج کی طرف سے ہوتا تھا۔ عام اتفاق آرا یہی تھا کہ ان دونوں عدالتوں کو ایک کر دیا جائے۔

سر ارسکن پری جو بمبئی کی بادشاہی عدالت کا رکن اور ۱۸۴۱ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیان اس کا میر مجلس بھی رہ چکا تھا اس کی رائے یہ تھی کہ "ان دونوں عدالتوں کو ایک کر دینا نہایت ہی مناسب ہے اور ہندوستان میں سب سے پہلے جس اصلاح کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ تمام عدل وانصاف ملکہ معظمہ کے نام سے ہونا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جس نظام کی صلاح دے رہا ہوں اس سے بڑی حد تک اس تصادم کا انسداد ہو جائے گا جو اب ان عدالتوں میں ہوتا ہے"۔

سر ایڈورڈ رائن جو بنگالے کی بادشاہی عدالت کا رکن اور ۱۸۳۷ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان اس کا میر مجلس بھی رہ چکا تھا اس کی بھی یہی رائے تھی کہ "بادشاہی عدالت اور صدر عدالت دونوں کا ایک کر دینا مناسب ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ملکہ معظمہ کے ججوں اور کمپنی کے ججوں دونوں کے لئے ایک ہی عدالت کر دینی چاہیے اور اس تمام صوبے کے لئے جہاں ایسی عدالت قائم کی گئی ہو یہی عدالت عدالت استغاثہ متصور ہونی چاہیے"۔

سر ایڈورڈ گیمبیر نے جو مدراس کی بادشاہی عدالت کا رکن اور ۱۸۳۶ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان میر مجلس بھی رہ چکا تھا کہا تھا کہ "میری جو کچھ صلاح ہوگی اسمیں اس تجویز کا حوالہ بھی ضرور ہوگا جس کو میں حد درجہ مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ اس صوبے میں 'بادشاہی عدالت' اور 'صدر عدالت' دونوں کو ایک کر دیا جائے"۔

اس بارے میں وکلاء کی رائے بھی اسی قدر غیر متزلزل تھی جس قدر ججوں کی

اور ایک انگریز بیرسٹر مسمی جان فارلی لیتھ نے جو کلکتہ سے مراجعت وطن پر لندن میں مجلس خاصہ کے مقدمات میں وکالت کرتا تھا دونوں عدالتوں کو ایک کر دینے کی تجویز کے فوائد نہایت صاف طور پر بیان کئے تھے "کمپنی کے عہدہ داروں کے ساتھ جو ہندوستان کی ملازمت دیوانی کے ارکان ہیں انگریز جج بھی جنھیں قانون کی خاص تعلیم ملتی ہے شریک ہو جائیں گے یعنی ابتدائی ملازمت کے ججوں کو ملک اور اہل ملک کے ادارات عادات و اطوار۔ رسم و رواج کے متعلق جو تجربہ اور علم ہے اس سے بہت کچھ علمی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں پھر آپ کو ایسے تعلیم یافتہ علمی تجربہ رکھنے والے قانون داں مل جاتے ہیں جو واقعات اور قانون کے متعلق ایسے مقننین کی مدد سے جنھیں صحیح طور پر تحقیقات اور منطقی استدلال کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے صحیح صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔"

بنگالے کی انجمن برطانوی ہند نے بھی ایسی تحریک پیش کی کہ "صدر عدالت" اور "بادشاہی عدالت" دونوں کو جتنا جلد ممکن ہو ایک کر دینا چاہیے" اس قوی اتفاق آرا کے مطابق جب کمپنی کے منشور کی تجدید ہوی تو یہ دونوں عدالتیں ایک کر دی گئیں اور مدراس بمبئی اور کلکتے میں ان کا نام بدل کر "عدالت العالیہ" رکھا گیا۔

۱۸۳۳ء کے قانون کے نفاذ کے بعد ایک "ماموریہ قوانین" منعقد کیا گیا اور میکالے جو گورنر جنرل کی کونسل کا پہلا رکن قانونی تھا اس "ماموریہ" کا پہلا میر مجلس مقرر ہوا۔ اس ماموریہ نے سب سے پہلے ہندوستان کے لئے ایک قانون تعزیرات مرتب کرنا شروع کیا۔ اس کی ترتیب کے وقت نپولین کے مجموعۂ قوانین وغیرہ کے علاوہ اسی طرح کا اور مواد بھی میکالے کے پیش نظر تھا۔ "قانون تعزیرات ہند" کا مسودہ مرتب ہوا اور ۱۸۳۷ء میں پیش کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ مسودہ انگلستان اور ہندوستان کے مستند مقننین کے ملاحظہ میں پیش کیا گیا۔ ہندوستان کی عدالتوں نے اس پر جو کچھ لکھا تھا اس پر ۱۸۴۷ء میں "ماموریہ قوانین" کے باقی ارکان یعنی ایلیٹ اور ہے کیمرن نے ایک تبصرہ لکھا اس کے بعد یہ معاملہ یوں ہی سوتا رہا اور بیتھیون نامی قانونی رکن وقت نے اس مسودے میں ایسی ترمیم کی کہ اس کا نام تک "قانون بتھیون" ہو گیا۔ لیکن پھر بھی کمپنی کے وجود تک تو یہ مجموعۂ قوانین منظور نہ ہوا البتہ اس کے اختتام کے بعد قانون کی شکل میں نافذ ہوا۔

۱۸۶۱ء کے ماموریۂ قوانین نے جس کے اس وقت ارکان صرف ایلیٹ اور سر ہے کیمرن رہ گئے تھے ایک ضابطۂ فوجداری بھی مرتب کیا لیکن یہ بھی کمپنی کے نظم ونسق کے اختتام کے بعد نافذ کیا گیا چنانچہ لارڈ کیننگ نے جو تاج برطانیہ کے زیر اقتدار پہلا وائسرائے مقرر ہوا تھا قانون تعزیرات ہند کے علاوہ ضابطۂ فوجداری اور ضابطۂ دیوانی بھی نافذ کیا۔

منضبطہ قانون کی عدم موجودگی میں کمپنی کے ججوں اور مجسٹریٹوں سے جیسا بہتر ممکن تھا وہ کام چلا لیتے تھے اور ہندوستانی عہدہ داروں نے بھی جن کو سررشتۂ عدالت میں ذمہ داری کی خدمتوں پر مامور کیا گیا تھا۔ عدالتی کام میں ایسی قابلیت۔ اہلیت اور قوت فیصلہ دکھائی تھی کہ اعلےٰ سے اعلےٰ مقننین نے ان کی تعریف کی تھی۔ سر ایڈورڈ رائن کو "اُن کی قابلیت اور مقدمات کے فیصلوں کی قوت پر بہت حیرت ہوتی تھی" اور سر ارسکن پری نے دوسرے اور دہ بیرسٹروں کی رائے جو ہندوستان میں وکالت کرتے تھے بیان کی تھی جس کی وہ بھی تائید کرتا تھا کہ "دیسی ججوں کے فیصلے کمپنی کے ججوں کے فیصلوں سے بھی جو استغاثے کی سماعت کرتے تھے بہتر اور بے حد اچھے تھے"۔

باایں ہمہ ہندوستانی ججوں کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ سر ارسکن نے دارالامرا کی مجلس کے سامنے کہا تھا کہ ایک یوروپی جج کو سالانہ ... ۳ پونڈ تنخواہ ملتی تھی درانحالیکہ ایک منصف کو صرف ۱۲۰ پونڈ ملتے تھے۔ اور اسی سال دارالعوام کی مجلس کے سامنے جب سر ارسکن نے اپنا اظہار دیا تو اس بارے میں اس نے اور زوردار رائے ظاہر کی تھی۔

"میرے خیال میں سررشتۂ عدالت کی ملازمت سے متعلق کوئی عدالتی خدمت ایسی نہیں ہے جو دماغی قابلیت اور اخلاقی صلاحیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی دسترس سے باہر سمجھی جائے۔ ضلع کے ججوں کے اس بارے میں میری رائے انگریز بیرسٹروں کو ان خدمتوں پر مامور کرنے کی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ میرا خیال اب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے مفاد اور ہندوستان میں اچھی حکومت قائم رکھنے کی غرض سے مناسب ہوگا کہ ہندوستانیوں کو بھی انگریز ججوں کا شریک کر دیا جائے ...... میری رائے میں دیسی عہدہ داروں

کو دیانت دار بنانے کا طریقہ آپ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہے جو ہندوستان میں انگریز عہدہ داروں کے لئے آپ نے اختیار کیا۔ ہر شخص کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک وہ انگریز جو دائرۂ ملازمت میں داخل ہیں نہایت قابلِ اعتبار ہیں اور اس کا اصل سبب یہی ہے کہ آپ نے ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دے رکھی ہیں۔ میری رائے میں دیسی ملازموں کے ساتھ بھی یہی اُصول مرعی رکھا جائے تو بالکل یہی نتیجہ حاصل ہوگا۔"

سرارسکن پری کی بڑی تعریف کی بات ہے کہ اگرچہ وہ ہندوستان میں صرف ایک عدالتی عہدہ دار ہی رہا تھا مگر اس کی نظر عدالت کی چار دیواری سے باہر بھی پڑتی تھی چنانچہ عام لوگوں کی کردار کا اندازہ ان کے روزانہ معمولی کاروبار زندگی سے وہ کرلیتا تھا۔ مذکورالصدر اظہار خیال کے بعد ہی سرارسکن نے اہل ہند کی تجارتی دیانت کے متعلق بھی اپنا خیال یوں ظاہر کیا کہ :-

"ہندوستانیوں کی تجارتی دیانت ہمیشہ سے شہرۂ آفاق ہے۔ بڑی حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ تاجرانہ ساکھ اور عزت قائم رکھنے کے اصول اُن میں خوب پھیلے ہوئے تھے مثلاً ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک ان کی ہنڈیاں چلتی تھیں اور نہایت قابلِ اعتبار سمجھی جاتی تھیں۔ تجارتی بہی کھاتوں کا اعتبار ایسا تھا کہ دیسی عدالتوں میں ان بہی کھاتوں کا پیش کردینا ہر مابہ النزاع معاملے کی تصدیق و ثبوت کے لئے کافی تھا۔"

ہمارا دل تو یہی چاہتا ہے کہ ہم سرارسکن پری کے ایک اور معاصر انگریز کی تصدیق یہاں پیش کردیں جس کو ہندوستانیوں سے عدالتوں یا تجارتی کوٹھیوں میں نہیں بلکہ زیادہ تر ان کے دیہی مسکنوں میں دیکھ دیکھ کر خوب واقفیت پیدا ہوگئی تھی۔ کرنل سلیمن کا نام بہ حیثیت ایک ممتاز عہدہ دار ہونے کے اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں اور ایک قصبے سے دوسرے قصبے میں قیام امن انسداد جرائم اور ٹھگی کے استیصال کیلئے اسکے پھرتے رہنے سے آج تک بھی ہندوستان میں زبان زد خلائق ہے کرنل سلیمن نے کہا تھا کہ "میرے روبرو ایسے ہزاروں مقدمات پیش ہوئے جن میں ایک آدمی کی املاک۔ آزادی حتیٰ کہ زندگی کا انحصار صرف ایک دفعہ کے جھوٹ کے بولنے پر تھا مگر اس نے ایسی دروغ بیانی سے صاف انکار کردیا۔" بہت کم انگریز

ایسے ہوں گے جو عدالتوں اور سرکاری محکموں میں دیسیوں کو دیکھنے کے بعد اس رائے کی تائید کریں گے مگر بہت کم ایسے ہوں گے جو دیسیوں کو ان کے دیہی مکنوں میں دیکھنے کے بعد اس سے انکار کریں گے کیونکہ یہ بالکل سیدھی سادی سچی بات ہے جس کی تصدیق ہر شخص کر سکتا ہے کہ روزانہ کاروبار زندگی اور خاندانی تعلقات میں اپنے معاشرتی اور تجارتی معاملات میں ہندوستان کے کثیر التعداد باشندے ایسے ہی سیدھے سادے دیانت دار۔ راست باز۔ اور صادق القول ہیں جیسے روئے زمین پر کہیں اور ہو سکتے ہیں۔

نظم ونسق کوتوالی

انگریز سرکار کے نظم ونسق ہند میں سب سے کامیاب جو بات تھی اور آج تک بھی ہے وہ یہی کوتوالی کا انتظام ہے۔ فریڈرک ہیلی ڈے نے جو اس سے تھوڑے دنوں بعد بنگالے کا پہلا لفٹنٹ گورنر ہوا اپنے زمانے کے ہندوستان کے نظم ونسق کوتوالی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر کوتوالی کے ذیلی عہدہ داروں کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور ترغیب وتحریص میں پڑنے کے ان کو موقعے بہت ملتے رہتے ہیں اسی لئے وہ حد درجہ بددیانت ہیں .... مجسٹریٹ یا ڈپٹی مجسٹریٹ کے تحت داروغہ یا تھانے دار ہوتا ہے جس کو زمانۂ حال تک ۲۵ روپے (۵۰ شلنگ) ماہوار ملتے تھے۔ اس کو وسیع اختیارات حاصل ہیں اور اس کا حلقۂ اختیار ۲۰۰ سے ۳۰۰ مربع میل ہوتا ہے .... داروغہ کے تحت ایک محرر ہوتا ہے جس کا کام لوگوں کے بیان قلمبند کرنا اور تھانے کے اسلحہ وغیرہ کی حفاظت کرنا ہے جب داروغہ حاضر نہیں ہوتا یا محرر کو خاص طور پر اس کام پر متعین کیا جاتا ہے تو اس کو بھی داروغہ ہی کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ اس محرر کی تنخواہ ۸ روپے (۱۶ شلنگ) ماہوار ہوتی ہے۔ ایک جمعدار بھی ہوتا ہے جس کو ۸ یا ۱۰ روپے (۱۶ یا ۲۰ شلنگ) ماہوار ہیں اور داروغہ کی زیر ہدایت وہ لکھنے پڑھنے کے کام کے سوا سب کچھ کرتا ہے۔ اس کے سوا دس سے

پچیس برقنداز (کوتوالی کے جوان) بھی ہوتے ہیں جن کی تنخواہیں ۴ یا ۵ روپے (۸ یا ۱۰ شلنگ) ماہوار ہوتی ہیں۔ اگر کام کی کثرت ہو تو داروغہ کے حکم سے بعض دفعہ تفتیش واردات انہیں کے ذمّے کر دی جاتی ہے اور یہ اکیلے اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ ان سب سرکاری ملازموں سے بھی نیچے کے درجے پر گاؤں کے چوکیدار ہیں"

آگے چلکر ہیلی ڈے نے یہ بھی کہا تھا کہ "میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ جرائم کی تعداد کم ہو رہی ہے البتہ ان کا ظلم وتشدّد کم ہو رہا ہے مثلاً جنوبی صوبوں میں ڈکیتی کی وارداتیں اب بھی ویسی ہی بے شمار ہوتی ہیں جیسے پہلے تھیں اور کلکتے کے مضافات میں تو یہ بہت زیادہ وقوع میں آتی ہیں لیکن ان کے ظلم وتشدّد میں کمی ہو رہی ہے"

ایک اور گواہ مسمی رابرٹ ٹورنس نے جو ہندوستان میں مجسٹریٹ جج اور کوتوال رہ چکا تھا ایک ہی شخص کو عدالت اور کوتوالی کے فرائض تفویض کرنے کے طریقے کو خرابیوں کی جڑ بتایا تھا۔

لارڈ ہیاروبی۔ کیا وہی شخص جرائم کی تفتیش اور مجرموں کی تلاش کرتا ہے جس کو انہیں جرائم کے مقدمات کا بعد کو فیصلہ کرنا ہوتا ہے؟

ٹورنس۔ جی ہاں!

لارڈ ہیاروبی۔ یہ قابلِ اعتراض ہے نہ صرف اُصول کی حد تک بلکہ عملی طور پر بھی اور کیا یہی ثابت ہوا ہے؟

ٹورنس۔ میرے خیال میں تو بلکہ ایسا ہی ہے اور میرے تجربے میں بھی یہی ثابت ہوا ہے۔

دیہی جماعتیں

یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے کے منتظمین مملکت میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے خود رعایا کی یا دیہی جماعتوں کی مدد سے ملک کے انتظام کو توالی یا عام نظم ونسق کی اصلاح کے لئے نہایت سنجیدہ طور پر کوشش کی ہو۔ ابتدائی زمانہ سے ہندوستان دیہی جماعتوں کا مسکن اور مرکز تھا۔ اور یہ خود مختار جماعتیں سیکڑوں اور

ہزاروں سال سے امن و امان قائم رکھتی تھیں اور گاؤں میں نزاعوں کا تصفیہ کرتی تھیں اگرچہ ملک میں اس وقت تاراج ہی کیوں نہ پھیلا ہوا ہو۔

صوبۂ مدراس میں ۱۸۱۲ئ ہی میں یہ معلوم ہوا تھا کہ "اس سیدھے سادے نظام بلدیہ کے تحت اس ملک کے باشندے نہایت ہی قدیم زمانے سے رہے ہیں .... ان باشندوں کو تقسیم سلطنت یا ملک کے تہ و بالا ہونے کی کچھ پروا ہی نہیں جب تک گاؤں صحیح سالم رہے ان کو کچھ پروا نہیں کہ یہ کس طاقت کے تحت چلا گیا یا کس فرمانروا کے زیر نگیں ہے کیونکہ گاؤں کے اندرونی انتظام میں انقلاب زمانہ سے تو کچھ تغیر و تبدل ہوتا ہی نہیں"۔

صوبہ بمبئی میں ۱۸۱۹ئ میں یہ معلوم ہوا تھا کہ "ان جماعتوں کے اندر مختصر سے پیمانے پر مملکت کا سب ساز و سامان موجود ہے اور اگر کسی قسم کی حکومت ان پر مسلّط نہ رہے تو بھی وہ اپنے ارکان کی حفاظت کے لئے خود کافی ہیں"۔

سر چارلس مٹکاف نے شمالی ہند میں ان کے متعلق ۱۸۳۰ئ میں یہ کہا تھا کہ "دیہی جماعتیں چھوٹی چھوٹی جمہوریہ ہیں جن میں ان کی ضرورتوں کا مکمل ساز و سامان موجود ہے اور باہر سے تعلقات پیدا کرنے کی انھیں حاجت ہی نہیں۔ جہاں کسی چیز کو ثبات نہیں وہاں ان کا وجود قائم ہے شاہی خاندان پر شاہی خاندان تہ و بالا ہو گئے۔ انقلاب پر انقلاب رونما ہوئے۔ ملک کے مالک پہلے ہندو تھے پھر پٹھان ہوئے مغل گئے تو مرہٹے آئے اور سکھوں کے بعد اب انگریز ہیں مگر دیہی جماعتیں ایک ہی حال پر ہیں۔ ...... ان تمام تغیرات اور انقلابات میں جو وقتاً فوقتاً ہندوستان پر نازل ہوتے رہے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی بقا میں سب اسباب و علل سے بڑھکر ان دیہی جماعتوں ہی کا حصہ ہے جو ہر ایک گویا ایک علیحدہ علیحدہ مملکت کے برابر ہے اور زیادہ تر انھیں سے لوگوں کو سکھ چین بھی نصیب ہے اور آزادی و خود مختاری بھی"۔

یہ نہایت ہی افسوسناک واقعہ ہے کہ انگریز حکمرانوں کی حد سے زیادہ مرکزی نظم و نسق کے تحت ان خود مختار اداروں میں انحطاط ہو گیا حتّٰی کہ وہ بالکل مفقود ہی ہو گئے اگر گاؤں کے رہنماؤں پر کچھ اعتماد کیا جاتا، اُن کو مالگزاری فوجداری

اور کوتوالی کے کچھ اختیارات دیئے جاتے اور بدنظمی کے انسداد کے لئے محتاط اور ہمدردانہ نگرانی ان پر رکھی جاتی تو پھر یہ جماعتیں آج تک بھی اچھی خدمتیں بجالاتی رہتیں۔ حکومت خوداختیاری کے ان قدیم اشکال کے مٹ جانے کے بعد ان کے بجائے کسی کامیاب خوداختیاری نظام کی ترویج نہیں کی گئی۔ موجودہ زمانے میں گاؤں کے نمائندے ہوتے ہی نہیں جو نظم ونسق کی مدد کرسکیں اور بدیسی حکومت کو وہ ہردل عزیزی حاصل نہیں ہے اور اس کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں ہیں جو ہندو راج اور مغلیہ حکومت میں صدیوں سے چلے آئے تھے۔

تعلیمات

انگریزوں کی حکومت میں مغربی طرز کی تعلیم ہی غالباً سب سے بڑی برکت ہے جو ہندوستان کو حاصل ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما نے بڑے پس وپیش کے بعد اہل ہند کو انگریزی تعلیم دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ سنہ ۱۷۹۲ء میں جب ولبرفورس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس سال کی تجدید منشور کے ساتھ ساتھ اس میں دو اور دفعات کا اضافہ کردیا جائے جن کی رُو سے انگلستان سے معلمین و مدرسین کا بھیجنا کمپنی پر لازم ہو جائے تو مجلس مالکان کمپنی نے اس کی سخت مخالفت کی تھی چنانچہ ان دفعات کو واپس لے لینا ہی پڑا۔ اس تجویز پر نظما میں ایک یادگار مباحثہ بھی ہوا۔

اس موقع پر ایک ناظم نے یہ بیان کیا تھا کہ ہم نے امریکہ میں مدرسوں اور کالجوں کے قیام کی اجازت دیدی تھی اور اسی بے وقوفی سے امریکہ ابھی ابھی ہمارے قبضے سے نکل گیا ہے۔ اب ہندوستان کے متعلق ہم سے ایسی بے وقوفی کا اعادہ تو نہیں ہوسکتا اگر دیسیوں کو تعلیم کی ایسی ہی خواہش ہے تو وہ حصول تعلیم کے لیے انگلستان آسکتے ہیں!!

سنہ ۱۷۹۲ء تک ملک میں جو تعلیمی ادارے قایم کیے گئے تھے ان میں ایک تو کلکتے میں مسلمانوں کا کالج تھا جس کو وارن ہیسٹنگز نے سنہ ۱۷۸۱ء میں قائم کیا تھا اور دوسرا بنارس میں سنسکرت کالج تھا جس کو لارڈ کارنوالس نے سنہ ۱۷۹۲ء میں قائم کیا تھا۔

ان اداروں کا مقصد فصول مقدمات میں انگریز ججوں کو مدد دینے کے لیے لوگوں کو محض "مولوی" اور "پنڈت" ہی بنانا تھا۔ عام لوگوں میں اشاعت تعلیم نہ کرنے کا خیال اور بیس ۲ سال تک قائم رہا۔ ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے پہلی دفعہ ہندوستان کے تینوں صوبوں میں اشاعت تعلیم پر ۔۔۔۔ ایونڈ صرف کرنے کا حکم دیا۔ مگر دس سال تک یعنے ۱۸۲۳ء تک اس رقم سے پھر بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔

اسی اثناء میں غیر سرکاری اشخاص نے ہمت کر کے بنگالے میں انگریزی کی تعلیم شروع کر دی "اس کا سہرہ ۲ دو اشخاص کے سر ہے۔ ایک تو مسٹر ڈیوڈ ہیر کے اور دوسرے رام موہن رائے نامی ایک دیسی آدمی کے۔ ۱۸۱۵ء میں سر شام یہ لوگ بیٹھے چند احباب کے ساتھ مشورہ کر رہے تھے کہ دیسیوں کی کردار اور نفس کی اصلاح کے لیئے کیا تدابیر اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ رام موہن رائے نے تجویز پیش کی کہ ایک سبھا یا انجمن ایسی قائم کی جائے جس میں مقدس وید کے اعلیٰ اور پاک مذہبی مسائل سکھائے جائیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسٹر ڈیوڈ ہیر کلکتے کا ایک گھڑی ساز تھا اور خود ایک معمولی ناخواندہ آدمی ہونے کے باوجود اس میں غضب کی جستی تھی اور کام کرنے کا بھی اس کو خوب شعور تھا۔ اس نے یہ کہا کہ دیسی لڑکوں کی تعلیم کے لئے ایک انگریزی مدرسہ یا کالج قائم کرنے کا منصوبہ زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ اس نے اس موضوع پر ایک گشتی مرتب و جاری کی جس پر رفتہ رفتہ سر آوردہ یورپی اشخاص کی توجہ مبذول ہونے لگی۔ ان اشخاص میں ایک سر ہائیڈ ایسٹ میر مجلس عدالت العالیہ بھی تھا جب اس مجوزہ منصوبے پر غور کرنے کی اس سے استدعا کی گئی تو وہ بھی شوق سے اس تجویز میں شریک ہوا اور مئی ۱۸۱۶ء میں یورپی شرفا کا ایک جلسہ اس نے منعقد کیا جس میں ذی اثر دیسیوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ اس کے بعد سب کے اتفاق آرا سے یہ طے ہوا کہ اعلیٰ طبقوں کے بچوں کی انگریزی تعلیم کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ جس کا نام "ہندو کالج کلکتہ" رکھا جائے۔ یورپی اور دیسی اشخاص کی ایک مشترکہ مجلس اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مقرر کی گئی۔ ۱۸۱۷ء کی ابتدا میں ایک کالج کا جس کو دراصل ایک مدرسہ کہنا چاہئیے۔ افتتاح کیا گیا اور یہ بنگالے میں تو کیا بلکہ ہندوستان بھر میں میرے حد علم تک

انگریزی طرز کی پہلی درس گاہ تھی۔

تعلیمی معاملات پر ۰۰۰۰۰ ۱ پونڈ صرف کرنے کا حکم پارلیمنٹ سے صادر ہونے کے دس سال بعد ۱۸۲۳ء میں حکومت بنگالہ نے ایک "مجلس تعلیمات" مقرر کی۔ اس مجلس نے آگرہ اور دہلی میں مسلمانوں کے کالج قائم کیے جن میں سنسکرت کی مستند کتابوں کے ساتھ ساتھ یورپی حکمت کی کتابوں کا ان زبانوں میں ترجمہ کرکے بہت بڑے پیمانے پر ان کی طباعت شروع کی گئی۔ اس مجلس نے کلکتے کے ہندو کالج کے نام جس کا قیام چھ سال پہلے عمل میں آیا تھا سالانہ امدادی عطیہ منظور کیا جس سے اطمینان ہو گیا کہ یہ کالج ضرور کامیاب اور مفید ثابت ہوگا۔

مونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن انگریزی تعلیم کا حامی تھا۔ اس نے ۱۸۲۰ء میں بمبئی میں ایک جلسۂ عام کی صدارت کی تھی جس کے بعد وہاں اشاعتِ تعلیم کی غرض سے ایک انجمن قائم کی گئی اس نے اس انجمن کی طرف سے طباعت کتب اور انعامات کے لئے ۰۰۰ ۵ پونڈ کے عطیہ کی منظوری حاصل کی۔ اس کے بعد سولہ سال تک دیسی زبانوں میں جو تعلیم دی گئی وہ سب اسی انجمن کے توسط سے دی گئی۔ بمبئی کی تعلیمی حالت کے متعلق تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا کہ ۱۸۲۳ء میں اس صوبے میں ۱۷۰۵ مدارس اور ۳۵۱۴۳ طلبا تھے۔

الفنسٹن کی یہ بھی تجویز تھی کہ بمبئی میں نوجوان ملازمین دیوانی کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک کالج کھولا جائے جس میں دیسی عہدہ داروں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی ایک شعبہ قایم کیا جائے مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظماء نے اس کو نامنظور کیا۔ بمبئی میں پہلا انگریزی مدرسہ ۱۸۲۴ء میں جب کہ الفنسٹن کو ہندوستان سے رخصت ہوئے ایک سال گزر چکا تھا کھولا گیا اور بمبئی کے ادارۂ اعظم کا جو الفنسٹن کے نام سے موسوم تھا ۱۸۳۴ء تک افتتاح نہیں ہوا۔

مدراس میں چند تعلیمی ادارے جن کے مصارف صرف پادری لوگ برداشت کرتے تھے ۱۸۲۳ء میں موجود تھے مگر سرکاری ادارہ کوئی نہ تھا۔ پچی آپا نامی ایک ہندو مخیر نے خیراتی کاموں کے لیے بڑی رقم چھوڑی تھی اور مدراس کے اڈووکیٹ جنرل مسمی نارٹن نے پچی آپا کی وصیت کے بموجب ۰۰۰۰ ۷ یا ۰۰۰۰ ۸ پونڈ کی رقم جمع

کی۔ ۱۸۱۹ء میں اس رقم سے تعلیم کے لئے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا گیا اور اس خیراتی کاروبار کے انتظام کے لئے ایک مجلس متقررہ کی گئی جس کے سب ارکان دیسی لوگ ہی تھے۔ "یہ پچی اپا کالج" آج تک بھی مدراس میں ایک نہایت کامیاب تعلیمی ادارہ مانا جاتا ہے۔

سر چارلس ٹریویلین کی کوششوں سے دہلی میں بھی ایک انگریزی کالج قائم کیا گیا تھا۔

مکالے کے ہندوستان آنے سے انگریزی تعلیم میں نئی حرکت پیدا ہو گئی۔ مکالے کی مدد اور حمایت سے لارڈ ولیم بنٹنک نے مارچ ۱۸۳۵ء کی وہ مشہور تحریک منظور کی جس کی رُو سے ہندوستان میں اعلےٰ تعلیم کے لئے انگریزی زبان ہی ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی۔

"مجلس تعلیمات" کے ارکان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ مکالے اس کا میر مجلس متقرر ہوا۔ سر ایڈورڈ رائن اور ہے کیمرن وغیرہ اس کے ارکان بنائے گئے اور اس زمانے کے تین سر برآوردہ دیسی اشخاص کو جن کے نام رادھا کنٹ دت روسومائی دت اور نواب بہور جنگ تھے بہ حیثیت ارکان اس میں شریک کیا گیا۔

لارڈ ولیم بنٹنک کے سب جانشینوں کو انگریزی تعلیم کے نشوونما اور اشاعت کی بنٹنک کی طرح آرزو نہ تھی۔ لارڈ ایلنبرو جو ۱۸۴۲ء گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آیا تھا ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے اثرات سے بہت بدظن تھا اور اس نے یہی بزدلانہ رائے دوارکیناتھ ٹگور کی طرف بھی منسوب کی تھی جو اس زمانے میں سب سے زیادہ سیاست نگار ہندوستانی تھا۔

"مجھ کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ دوارکیناتھ ٹگور مجھ سے ملنے آیا۔ یہ شخص نہ صرف ان سب دیسیوں میں جو اس ملک کو وقتاً وقتاً آتے رہتے ہیں زیادہ ہوشیار تھا بلکہ اس کا شمار اپنے ملک کے سب سے زیادہ ہوشیار لوگوں میں بھی تھا۔ اسی روز صبح میں نے اس کی ایک تقریر "دیسیوں کی تعلیم" کے عنوان پر اخبار میں پڑھی تھی اور جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس سے

کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے تعلیم کے متعلق تقریر کی ہے" اس نے کہا کہ "و کیا اخبار والوں نے اس کو چھاپ دیا ہے ؟" میں نے کہا کہ "ہاں - اخبار ہر چیز چھاپ دیتے ہیں لیکن میں اور آپ دونوں یہ جانتے ہیں کہ اس کمرے کے اندر بیٹھ کر ہمیں ایسی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں جس کو عامۃ الناس کو سنانے کے لئے مشتہر کیا جائے بلکہ دل کھول کر جو چاہیں ہم آپس میں کہہ سکتے ہیں - آپ تو اس سے خوب واقف ہیں کہ اگر دیسیوں کو تعلیم دینے میں یہ لوگ حسب دل خواہ کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم تین ماہ سے زیادہ اس ملک میں نہیں رہ سکتے" اس پر اس نے کہا کہ "تین ماہ تو بہت زیادہ ہیں تین ہفتوں سے زیادہ نہیں رہ سکتے" اور یہ اس کا کہنا بالکل درست تھا"۔

لارڈ ایلنبرو کا قائم مقام لارڈ ہارڈنگ ہوا جو ایلنبرو سے زیادہ منتظم اور عاقل و مدبر شخص تھا - اس نے بنگالے کے مختلف اضلاع میں دیسی زبان میں اس خیال سے سردست تعلیم دینے کے لئے کہ آیندہ اعلیٰ تعلیم انگریزی میں دی جا سکے ایک سو مدارس قائم کئے اور اس مشہور تحریک کو بھی منظور کیا جس کی رو سے سرکاری ملازمت کے لئے انھیں لوگوں کا انتخاب کرنا لازمی تھا جنھوں نے ان جدید قائم کردہ اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی - پنڈت ایسور چندر ودیا ساگر نے جو اپنے وقت کا بڑا ماہر تعلیمات اور ادیب مانا جاتا تھا اس کام کے سر انجام کے لئے اچھے اچھے لوگوں کا انتخاب کرنے میں لارڈ ہارڈنگ کی بڑی مدد کی تھی۔

سب سے آخر تعلیمات پر ۱۸۵۴ء کا مراسلہ پہنچا جس میں ہنٹنک اور ہارڈنگ کے بنا کردہ نظام کو تسلیم کر لیا گیا اور ہندوستان کی دیسی زبانوں میں ابتدائی تعلیم دینے کے لئے جس کے بعد اعلیٰ تعلیم انگریزی میں دی جا سکے قواعد مقرر کر دیئے گئے اس اصول کو ان لفظوں میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے کہ "اگرچہ انگریزی زبان سے (اس حیثیت سے کہ وہ ان لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے جنھیں اس سے معقول واقفیت ہو گئی ہے بہترین ذریعۂ تعلیم ہے) اب کام لیا جا رہا ہے لیکن دیسی زبانوں سے بھی اس بہت بڑے طبقے کی خاطر کام لینا بھی ضروری ہے جنھیں انگریزی آتی نہیں یا آتی بھی ہے تو بالکل ناقص"۔

اس مراسلے سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ انگریزی میں اعلےٰ تعلیم کی اشاعت کرنے کے لیئے ہندوستان میں جامعات کے قیام کو پسند کیا گیا تھا۔ "اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان میں جامعات قائم کی جائیں جن میں باقاعدہ طور پر ہر طرح کے علوم کی نصابی تعلیم دی جائے اور مختلف شعبہ جات میں ایک خاص حد تک تحصیل علوم وفنون کرنے کے ثبوت میں لوگوں کو اسناد عطا کی جائیں اور جو لوگ اس طرح کا اعزاز وامتیاز حاصل کرنا چاہیں اُن کو اس کا موقع دیا جائے۔ تعلیمی کونسل نے اپنی تجویز میں جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے جامعۂ لندن کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا اور ہمیں بھی کونسل کی رائے سے اتفاق ہے کہ اس جامعۂ کی تشکیل۔ حکومت اور فرائض وغیرہ (جس کے منشور اور قواعد کے نقول آپ کے ملاحظہ کے لیئے مع ہذا ملفوف ہیں) ایسے جو ہندوستان کی ضرورتوں کے لحاظ سے بالکل مناسب حال ہیں اور بہ حیثیت مجموعی ان کی پابندی مفید مطلب بھی ہے اگرچہ بعض جگہ تفصیل میں کچھ ردّ و بدل ضروری معلوم ہوتا ہے"۔

امداد سرکاری مقرر کرنے کے علاوہ اور طریقوں سے بھی عامۃ الناس کو ابتدائی تعلیم دینے کی غرض سے جو دیسی مدارس قایم تھے ان کی بھی ہر طرح ہمت افزائی کی گئی۔

چنانچہ لارڈ کیننگ نے بمبئی، مدراس اور کلکتے میں جامعات قائم کیں اور اس مشہور مراسلے میں جس نظام کا خاکہ کھینچا گیا تھا وہی نظام آج تک قائم ہے۔ اس کے بعد الہ آباد اور لاہور میں بھی جامعات کا قیام عمل میں آیا اور ملکہ وکٹوریہ کی حکمرانی کے آخری سال چالیس لاکھ سے زیادہ لڑکے برطانوی ہند کے تعلیمی اداروں میں شریک تھے۔

ابتدائی تعلیم

موجودہ زمانے میں چالیس لاکھ سے زیادہ لڑکے جو برطانوی ہند کے مدارس میں شریک ہیں وہ صرف پڑھنا لکھنا سیکھتے ہیں اور حساب کی ابتدائی تعلیم پاتے ہیں اور اس

تعلیم کا آغاز انگریز منتظمین مملکت نے نہیں بلکہ دیسیوں ہی نے کیا ہے۔ سر ٹامس منرو اور مونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن نے انیسویں[۱۹] صدی عیسوی کی ابتدا میں تحقیقات کرنے کے بعد رپورٹ پیش کی تھی کہ بہت قدیم زمانے سے ابتدائی تعلیم ہندوستان میں بمقابل یورپ کے زیادہ پھیلی ہوئی تھی اور دیسی مدارس کے دیسی لڑکوں میں سیدھے سادے زبانی حساب کرنے کی خاص فطری قوت موجود تھی برہمنوں اور ملک کے اعلےٰ طبقوں میں بچوں کو کچھ نہ کچھ تعلیم دینا مذہبی فرض سمجھا جاتا تھا۔ بیوپاریوں اور تاجروں کے طبقوں میں بچوں کو ان کے آبائی پیشے کا کاروبار حسن وخوبی کے ساتھ چلانے کے قابل بنانے کے لئے پڑھنا لکھنا اور حساب سکھایا جاتا تھا برطانوی منتظمین مملکت نے اس قدیم ابتدائی تعلیم کے نظام کو تسلیم کر لیا تھا اور رقم وغیرہ سے اس کی امداد بھی کی تھی لیکن یہ کافی نہ تھی۔ موجودہ زمانے میں جس بات کی اشدِ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ گاؤں کے ابتدائی مدارس کے لئے نہایت فیاضانہ طور پر امداد دینی چاہئے ساتھ ہی ساتھ ابتدائی تعلیم کی اشاعت کاشتکاروں کے طبقے میں کرنا بھی بہت ضروری ہے تاکہ ہندوستان کے ہر مزدور کاشتکار کے لئے برائے نام کچھ دینے پر گاؤں کے مدرسے میں پڑھنا لکھنا اور حساب سیکھنا ممکن ہو جائے سر ارسکن پری نے ۱۸۵۳ء میں شکایت کی تھی کہ سرکاری امداد بہت کم ہے اور بتایا تھا کہ اسقدر قلیل رقم پر سرکار "ہر گاؤں میں ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتی"۔ آج تک بھی یہ امدادی رقم اشاعت تعلیم کے لئے کافی نہیں ملتی چنانچہ "ہر گاؤں میں ایک مدرسہ قائم کرنے کے" فریضے کی تکمیل اب تک نہیں ہوئی ہے۔[۱]

[۱] ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے آخری سال برطانوی ہند کی تئیس[۲۳] کروڑ کی آبادی کے لئے تعلیمات پر تقریباً ساڑھے گیارہ لاکھ پونڈ صرف ہوئے تھے جس میں سے چھ[۶] لاکھ چونسٹھ ہزار پونڈ سرکار نے اپنے خزانۂ شاہی سے دیئے تھے اور باقی چار لاکھ چوراسی ہزار پونڈ مقامی اور بلدیہ کے خزائن سے ادا ہوئے تھے۔

تعلیم نسواں

اگر مدرسوں کی حاضری معیار ترقی سمجھی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کے برابر نہیں ہوتی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں عام طور پر لڑکیوں کی کی شادی دس سے چودہ سال کی عمر کو پہنچنے تک ہو جاتی ہے وہاں قدیم زمانے میں لڑکیاں شاذ ہی مدرسے بھیجی جاتی تھیں اور موجودہ زمانے میں بھی کم تعداد میں وہ مدرسے بھیجی جاتی ہیں اس سے مجبوراً ان کی تعلیم زیادہ تر خانگی استادوں سے گھروں ہی پر ہوتی ہے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے رکن قانونی ڈرنک واٹر بیتھون نے کلکتے میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ قائم کرنے کی نہایت قابل تعریف اور کامیاب کوشش کی تھی اور اپنی جیب سے ۰۰۰۰ پونڈ اس میں صرف کیے تھے۔ آج بھی بیتھون کا مدرسہ ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا نہایت کامیاب ادارہ مانا جاتا ہے اور ابتدا سے لے کر جامعہ کے امتحانات تک وہاں تعلیم ہوتی ہے۔ ہندوستانی جامعات بھی جامعۂ لندن کی تقلید میں عورتوں کو اسناد عطا کرتی ہیں چنانچہ عورتیں بھی مدراس بمبئی اور کلکتے کی جامعات سے اسناد حاصل کر سکتی ہیں تحتانی مدارس میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی ہے اور ملکۂ وکٹوریہ کی حکمرانی کے آخری سال ان تمام لڑکیوں کی تعداد جو برطانوی ہند کے مدارس میں شریک تھیں ۵ لاکھ سے کچھ کم تھی۔

جیسا پہلے عرض کیا گیا ہے اس تعداد سے ہندوستان میں تعلیم نسواں کی اشاعت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اعلیٰ طبقے کی لڑکیاں بیاہی ہوئی یا ان بیاہی دونوں گھروں ہی پر تعلیم پاتی ہیں اور ناخواندہ ادنیٰ طبقے کی عورتیں بمقابل یورپ کے ہندوستان میں زیادہ تر مذہبی عقائد اور اخلاقی فرائض اپنے قومی روایات اور ادبیات سے واقف ہوتی ہیں۔ یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایک گاؤں کی رہنے والی ناخواندہ ہندوستانی عورت کو کم سے کم مذہب کی تعلیم ایسی ہی اچھی ملتی ہے اور قومی روایات اور ادبیات کے متعلق اس کو ایسے ہی اچھے معلومات ہوتے ہیں جیسے ایک غریب

یورپ کی رہنے والی عورت کو ہو سکتے ہیں جو انجیل سے واقف ہوتی ہے اور گاہے گاہے ایک آنے کے رسالوں میں قصے کہانیاں پڑھ لیتی ہے۔

مطبع عام

ہندوستان کے مطبع عام کی دلچسپ سرگزشت کا پتہ مراسلات کے اس مجموعۂ کثیر میں ملتا ہے جو مجلس نظماء اور حکومت ہند کے درمیان چلتے رہے ہیں اور جو ۱۸۵۸ء میں دارالعوام کے حکم سے شائع کیے گئے تھے۔

۱۷۹۱ء میں لارڈ کارنوالس کے عہد حکومت میں ولیم ڈواین نامی ایک شخص کو "بنگال جرنل" میں ایک نازیبا فقرہ لکھنے کی پاداش میں خارج بلد کرکے یورپ واپس بھیجدینے کے لئے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ پادشاہی عدالت میں استغاثہ کرنے پر فیصلہ صادر ہوا کہ حکومت اس طرح کرنے میں اپنے اختیارات سے متجاوز نہیں ہوئی تھی مگر ولیم ڈواین کو تنبیہ کے بعد رہا کردیا گیا۔ ڈواین نے پھر "ورلڈ" میں اسی حملے کا اعادہ کیا جس پر اس کو ۱۷۹۴ء میں پھر یورپ بھیجدیا گیا۔

سالہائے مابعد میں دوسرے اسی قسم کے حملوں پر خاص نگرانی رکھی جاتی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں لارڈ ویلزلی کی حکومت نے مطبع عام پر ایک انتظام قائم رکھنے کے لئے چند قواعد نافذ کیے تھے۔ کوئی اخبار ایک سرکاری عہدہ دار کے مسودہ معائنہ کیے بغیر شائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی اور دوسرے منضبطہ قواعد کی خلاف ورزی کی سزا "جہاز پر سوار کرکے فوری یورپ بھیجدینا" تھی۔ ان قواعد کو مجلس نظماء نے بھی منظور کرلیا تھا۔

۱۸۰۱ء سے ۱۸۱۸ء تک متعدد مدیران اخبار وغیرہ کو انکے قابل اعتراض مضامین اور فقرات پر قصوروار اور قابل مواخذہ ٹھہرایا گیا تھا اور کئی مضمون نگاروں کو اس طرح حملہ کرنے پر سرکار سے بہ مجبوری معافی چاہنی پڑی تھی۔

مارکوئیس ہسٹنگز کی حکومت نے ۱۸۱۸ء میں ایک جدید دستورالعمل نافذ کیا

جس میں ایسی سخت گیری نہ تھی لیکن پھر مدیران اخبار وغیرہ کو تجاویز عامہ پر ”حشم نمائی“ دیسی آبادی کو متوحش کر دینے والے ”مباحث پیدا کرنے اور لوگوں کی“ خانگی زندگی پر اتہام اور ذاتیت پر حملے“ جن سے لڑائی جھگڑے پھیلیں غرض ایسی باتوں کے شائع کرنے کی ممانعت تھی۔

اس دستور العمل کے نفاذ کے بعد سے حکومت نے اس طرح کی ناروا اور نازیبا باتوں پر خاص طور پر نگرانی رکھی تھی جس کی کئی مثالیں موجود تھیں مثلاً لفٹنٹ کرنل رابنسن کو ۱۸۲۲ء میں سپہ سالار ہند نے اس جرم پر کورٹ مارشل کرنے کا حکم دیا تھا کہ اس نے اپنے پہلے مضمون کی جو ”کلکتہ جنرل“ میں محض ایک ”فوجی بہی خواہ“ کے دستخط سے گمنام شائع ہوا تھا تائید میں ایک اور درشت خط حکومت کے نام لکھا تھا۔

مدراس اور بمبئی میں بھی مطبع عام کے مضامین پر خاص طور پر نگرانی رکھی جاتی تھی۔

نظما نے ۱۸۲۳ء میں کہا تھا کہ مطبع عام کی آزادی نیابتی دستور کا ایک ضروری ضمیمہ ہے۔ جہاں کہیں حکومت کا ظہور قوم ہی سے ہوتا ہے اور قوم کو وہ جوابدہ ہے وہاں قوم کو حکومت کے تجاویز پر ردّ و قدح کرنے کا حق رہنا چاہئے اور جہاں کہیں قوم وضع قانون کے لئے نمایندوں کا انتخاب کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے قوانین سے ان کی ذات اور ملک پر اثر پڑتا ہے تو پھر قوم کو اپنے نمایندوں کے طریق کار پر اگر وہ قوم کے اعتماد کو پورا نہ کریں تو کھلے طور پر برا بھلا کہنے کا ہر وقت حق حاصل ہے لیکن کسی صورت سے بھی حکومت ہند ایک آزاد نیابتی یا قومی حکومت نہیں کہلا سکتی۔ رعایا اس کے قیام کے بارے میں بالکل بے زبان سی ہے اور اس کے افعال پر قوم کو نگرانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے“۔

”ہندوستان میں حکومت کو جو اقتدار حاصل ہے وہ دراصل مجلس نظماء اور مجلس نظم سے نیابتاً حاصل ہوا ہے۔ حکومت ہند کا مرکز دراصل یہی ملک یعنی انگلستان ہے اور حکومت انگلستان کی طرح یہ بھی انگریز قوم ہی کو جوابدہ ہے۔ اس لئے بجائے ہندوستان کے اس ملک ہی میں حکومت کے تجاویز پر بحث مباحث ہونے چاہئیں“۔

ہندوستان کے مطبع عام کے متعلق ۱۸۲۳ء میں نظماء کی رائے یہی تھی جو ندکور ہوئی لیکن یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کا مطبع عام جو کہلاتا تھا وہ دراصل ہندوستان میں ایک مختصر سی یورپی جماعت ہی کا مطبع تھا۔ یہ مطبع نہ تو قوم کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا اور نہ قوم کے اغراض کی حمایت اور اس زمانے میں تو کیا بلکہ اس سے تیس ۳۰ سال بعد تک بھی ہندوستان کے لوگوں کا کوئی ذی اثر مطبع ہی نہیں تھا۔ اس لئے جب لارڈ ولیم بنٹنک نے ہندوستان کے باشندوں کو ترقی دینے کی کوشش کی اور کمپنی کے تحت ان کو ذمہ داری کی خدمتیں دیں تو ہندوستان کے اس مطبع نے بنٹنک پر ایسے ایسے حملے کیے جو اس وقت سے آج تک کسی اور گورنر جنرل پر کبھی نہیں ہوئے۔

لارڈ ولیم بنٹنک کے مشیر خاص مکالے کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ مکالے نے ان یادگار لفظوں میں ہندوستان کے مطبع عام کے بارے میں لکھا ہے کہ "رائے عامہ کے معنی ہیں ان پانسو آدمیوں کی رائے جن کے اغراض۔ مذاق۔ جذبات اس پانچ کروڑ کی آبادی سے بالکل جدا ہیں جس میں وہ رہتے ہیں اور آزادی کی محبت کا منشاء یہ ہے کہ ان پانسو آدمیوں کو ہر ایسی تجویز پر سخت اعتراض ہے جو پانچ کروڑ کی آبادی کے ساتھ اُن کے حسب دلخواہ بدسلوکی کرنے کے مانع ہوتی ہے[1]۔"

لارڈ ولیم بنٹنک کے قائمقام سر چارلس مٹکاف نے اپنی چند روزہ حکومت میں

---

[1] - لارڈ مکالے کی سوانح عمری اور مراسلات"۔ مولفہ ٹریولین

جان اسٹوارٹ مل نے بھی ۱۸۵۲ عیسوی میں ہندوستان کے انگریزی مطبع کے متعلق اسی طرح کی رائے کا اظہار کیا تھا۔ دارالامراء کی مجلس کے سامنے اس نے اپنی شہادت میں یہ بیان کیا تھا کہ "ہندوستان میں جب تک ایک گروہ کثیر کو مطبع عام سے بے دخل رکھا جائے گا اس وقت تک یہ خطرہ درپیش رہے گا کہ مطبع محض انفرادی اغراض کا مرکز بنا رہے گا۔ ہندوستان میں جو انگریزی اخباروں کا مطبع ہے وہ انگریزوں کے اور بالخصوص ایسے انگریزوں کے جن کا حکومت سے کچھ تعلق نہیں ہے خاص اغراض ہی کا مرکز ہے۔ اس کو ہندوستانیوں سے یا ہندوستان کے مفاد عظیم سے کچھ سروکار نہیں۔"

یہ نمایاں خصوصیت پیدا کر دی کہ ۱۸۳۵ء میں مطبع عام کو اس وقت وہ جیسا بھی کچھ تھا آزادی دیدی۔ درحقیقت یہ ایک بڑی فراخ حوصلگی اور ہمت کی بات تھی لیکن اس پرایئیٹ انڈیا کمپنی کے نظماء سخت ناراض ہو گئے انہوں نے لکھا کہ :۔

"یہ کارروائی ہمارے پہلے احکام اور ان سنجیدہ فیصلوں کے بالکل خلاف ہے جو کلکتے کی بادشاہی عدالت، اور ملک معظم کی مجلس خاصہ، نے اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر مکمل بحث مباحث کرنے اور فریقین کے استدلالات سننے کے بعد صادر کیئے تھے نیز مدراس، بمبئی اور کلکتے کی سابقہ حکومتوں کے آراُ کے خلاف ہے جو فسبطِ تحریر میں آچکے تھے"۔

"مجبوراً ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کارروائی بالکل ناجائز متصور ہونی چاہیئے بالخصوص جبکہ ایک ایسی حکومت نے اس طرح عمل کیا ہے جو خود مشروط تھی"۔

"ہم فوری ان اختیارات کے استعمال میں جو پارلیمنٹ کے نافذہ قانون کی رو سے ہمیں حاصل ہیں آپ کے اس جدید قانون کی منظوری پر اس کا نافذ العمل ہونا روک دیتے لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خواہ اس قانون کا نفاذ حد درجہ نامناسب اور نارواہی کیوں نہ ہو مگر اب اس کی تنسیخ نہایت مفسدانہ نتائج پیدا کرے گی۔ اس لیئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنا فیصلہ آخر آپ کو سنانے سے پہلے آپ کے موجودہ گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ کے ہندوستان جانے کے بعد ان کے یہ اجلاس کونسل مشورہ سے بھی واقف ہو جائیں لیکن اس بارے میں آپ تو ہمارے دل کی بات سے آگاہ ہو گئے ہیں اس لیئے ہم کو اس بات کا ذرا بھی افسوس نہ ہوگا اگر آپ پہلے کا نظام دوبارہ قائم کر کے آئندہ ہماری مداخلت بالکل غیر ضروری کر دیں"۔

خوش نصیبی سے سر چارلس مٹکاف ایسا آدمی نہ تھا کہ وہ نظماء کے "دل کی بات" کا لحاظ کر کے اپنے عقیدے سے ہٹ جاتا یا ان کی دھمکیوں میں آکر پہلا نظام دوبارہ رائج کر دیتا اور اس سے دو سال بعد جب لارڈ آکلینڈ ہندوستان آیا تو اس وقت ہندوستان اور انگلستان دونوں ممالک میں لوگ مطبع عام کی

آزادی پر ناراض نہ تھے اس لئے مٹکاف کے اس اچھے کام کو مسترد نہیں کیا گیا۔
اس کے بیس[۲۰] سال بعد غدر کے زمانے میں اس بات کی ضرورت ہوئی کہ ایک انگریز اخبار کو ایسے مضامین شائع کرنے سے متنبہ کر دیا جائے جس سے لوگوں کے دلوں میں اشتعالک پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ اور تین[۳] ہندوستانی اخباروں پر مقدمہ چلایا گیا جن میں سے دو[۲] اخباروں کے شائع کرنے والوں سے اظہار تاسف اور ضمانت پر درگزر کیا گیا۔ تیسرے اخبار کے شائع کرنے والے کو جرم کے ثابت نہ ہونے پر رہا کر دیا گیا۔ اسی زمانہ میں مطبع عام پر چند قیود بھی عائد کیے گئے تھے جن کو بعد میں برخاست کر دیا گیا۔

تیرھواں باب

مالیات ہند۔ ہندوستانی قرض کی ابتداء

پارلیمنٹ کی مجالس منتخبہ نے جو شہادت قلمبند کی تھی اور جس سے ہم نے پچھلے باب میں متعدد اقتباسات پیش کئے ہیں وہ ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۳ء میں شائع کی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم ونسق ہند کے متعلق نہایت ہی مکمل تحقیقات ہوئی تھی۔ برطانیہ کبریٰ میں عام طور پر اور خصوصاً تاجروں اور صناعوں کے طبقوں میں یہی خیال زیادہ تر پھیلا ہوا تھا کہ تاج برطانیہ کو ہندوستان کی حکومت براہ راست اپنے قبضے میں لے لینی چاہئے۔ وزارت دولت برطانیہ کو بھی جس نے اکثر مرتبہ بلا امتزاج نظما ہندوستان میں صلح وجنگ کر لی تھی ہندوستانی معاملات کے انتظام کو براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے لینے میں ذرا بھی پس وپیش نہ تھا لیکن ایک ایسی کمپنی کو بالکل علیحدہ کر دینے میں جس نے خود قوم کے لئے شہنشاہی ہند کی بنا ڈالی تھی قوم کو پس وپیش لاحق تھا۔ اس لئے رفع داد باہمی کے لئے ایک معقول تصفیہ حسب ذیل کیا گیا:-

کمپنی کے منشور کی مکرر تجدید تو ہوئی لیکن ۱۸۵۳ء کے قانون کی رو سے اس منشور کی میعاد کا تعین نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف یہی درج تھا کہ پارلیمنٹ کے حکم ثانی تک ہندوستانی عملداری تاج برطانیہ کی امانت کے طور پر کمپنی کے زیر انتظام

رہے گی - نظماء کی تعداد بھی چوبیس ۲۴ سے اٹھارہ کر دی گئی اور تاج برطانیہ نے ان اٹھارہ میں سے چھ نظماء کا تقرر اپنے ہاتھ میں لے لیا مجلس نظم کی نگرانی بھی حسب حال قائم رکھی گئی -

اس جدید منشور کی رُو سے اور تغیرات بھی عمل میں آئے مثلاً بنگالہ کے لئے ایک گورنر یا لفٹننٹ گورنر کے تقرر کی اجازت دی گئی چنانچہ گورنر جنرل نے جس صوبے پر اتنے زمانے تک حکومت کی تھی اس پر ۱۸۵۴ء میں پہلی دفعہ ایک لفٹننٹ گورنر مامور کیا گیا - اسی قانون کی رُو سے ایک اور لفٹننٹ گورنری کے قیام کی اجازت صادر ہوئی چنانچہ ۱۸۵۹ء میں پنجاب پر بھی ایک لفٹننٹ گورنر مامور کیا گیا - اس کے علاوہ اور جو اہم تغیرات وقوع میں آئے ان میں گورنر جنرل کی کونسل کی تعداد ارکان میں وضع قانون کی غرض سے وضع قانون کے ارکان کا اضافہ بھی قابل ذکر ہے - ہندوستان کی سرکاری خدمتوں پر لوگوں کو مامور کرنے کا اختیار مجلس نظما سے چھین لیا گیا اور اس تاریخ سے جدید قواعد کے مطابق یہ اختیار مجلس نظم کے سپرد کر دیا گیا - جدید قواعد میں یہ بھی شرط لگا دی گئی کہ ہندوستان کی ملازمت دیوانی میں داخل ہونا عام مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے پر منحصر رہے گا -

ان تغیرات سے جن میں چند سے تو کمپنی کے اختیارات کم ہو گئے تھے اور چند سے تاج برطانیہ کے اثر و اقتدار میں اضافہ ہو گیا تھا وہ دو عملی جس کی جان اسٹوارٹ مل نے پُر زور تائید کی تھی قائم رہی اور چند سال تک حکومت یونہی چلی مگر غدر ہونے کے ساتھ ہی کمپنی کو نظم و نسق ہند سے بالکل علیحدہ کر دینے کا ایک اچھا موقع برطانوی قوم اور برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ آ گیا - اب کمپنی کے نظم و نسق ہند کا قصہ ختم کرتے ہوئے اس باب میں ہم اس کے انتظام مالیہ پر تبصرہ کریں گے -

ملکۂ وکٹوریہ کی تخت نشینی سے کمپنی کی برخاست تک اس اکیس (۲۱) سال کی مدت میں جمع و خرچ کے اعداد کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ ان اعداد سے اس دور کی سیاسی تاریخ کا پتہ چلتا ہے - ذیل کا نقشہ سرکاری اسناد وغیرہ سے مرتب کیا گیا ہے - ان اعداد سے مالگزاری کا جملہ محاصل کے ساتھ تناسب کیا تھا نیز مطالبات وطن کا جملہ خرچ کے ساتھ کیا تناسب تھا وہ سب تفصیلی طور پر ظاہر ہوتا ہے

سنہ عیسوی	محاصل مالگزاری	جمع خام	مطالبات وطن	خرچ خام
	پونڈ	پونڈ	پونڈ	پونڈ
۱۸۳۷ - ۳۸	۱۱۸۵۳۹۷۵	۲۰۸۵۸۸۲۰	۲۳۰۴۴۴۵	۱۹۸۵۷۹۷۰
۱۸۳۸ - ۳۹	۱۲۳۰۳۲۰۰	۲۱۱۵۸۰۹۹	۲۶۱۵۴۶۵	۲۱۳۰۶۲۳۲
۱۸۳۹ - ۴۰	۱۲۲۷۳۹۸۲	۲۰۱۲۴۰۳۸	۲۵۷۸۹۶۶	۲۲۲۲۸۰۱۱
۱۸۴۰ - ۴۱	۱۲۳۱۳۸۴۰	۲۰۸۵۱۰۷۳	۲۶۲۵۷۷۶	۲۲۵۴۶۴۳۰
۱۸۴۱ - ۴۲	۱۲۱۵۴۵۸۷	۲۱۸۳۷۸۲۳	۲۸۳۴۷۸۶	۲۲۵۳۴۴۴۶
۱۸۴۲ - ۴۳	۱۳۳۲۲۸۸۰	۲۲۶۱۶۴۸۷	۲۴۵۸۱۹۳	۲۳۸۸۸۵۲۶
۱۸۴۳ - ۴۴	۱۳۲۲۸۸۵۰	۲۳۵۸۶۵۷۳	۲۹۴۴۰۷۳	۲۴۹۲۵۳۷۱
۱۸۴۴ - ۴۵	۱۳۲۲۴۰۵۴	۲۳۶۶۶۲۴۶	۲۴۸۵۲۱۲	۲۴۲۹۳۶۴۷
۱۸۴۵ - ۴۶	۱۳۳۸۶۵۱۷	۲۴۲۷۰۶۰۸	۳۰۴۴۰۶۷	۲۵۶۶۲۷۳۸
۱۸۴۶ - ۴۷	۱۳۹۹۵۷۱۷	۲۶۰۸۴۶۸۱	۳۰۶۶۶۳۵	۲۶۹۱۶۱۸۸
۱۸۴۷ - ۴۸	۱۴۴۳۷۲۵۴	۲۴۹۰۸۳۰۲	۳۰۱۶۰۷۲	۲۶۷۴۹۴۷۴
۱۸۴۸ - ۴۹	۱۴۲۷۴۲۷۰	۲۵۳۹۶۳۸۶	۳۰۱۲۹۰۸	۲۶۷۶۶۸۴۸
۱۸۴۹ - ۵۰	۱۵۲۴۸۶۹۴	۲۷۵۲۲۳۴۴	۲۷۵۰۹۳۷	۲۶۹۶۰۹۸۸
۱۸۵۰ - ۵۱	۱۵۳۸۲۴۴۲	۲۷۶۲۵۳۶۰	۲۷۱۷۱۸۶	۲۷۰۰۰۶۲۴
۱۸۵۱ - ۵۲	۱۵۳۹۱۶۶۴	۲۷۸۳۲۲۳۷	۲۵۰۶۳۷۷	۲۷۰۹۸۴۶۲
۱۸۵۲ - ۵۳	۱۵۳۶۵۲۵۰	۲۸۶۰۹۱۰۹	۲۶۹۷۴۸۸	۲۷۹۷۶۷۳۵
۱۸۵۳ - ۵۴	۱۵۸۳۸۶۴۹	۲۸۲۷۷۵۳۰	۳۲۶۲۲۸۹	۳۰۲۴۰۴۳۵
۱۸۵۴ - ۵۵	۱۶۴۱۹۰۳۱	۲۹۱۳۳۰۵۰	۳۰۱۱۷۳۵	۳۰۷۵۳۴۵۶
۱۸۵۵ - ۵۶	۱۷۱۰۹۹۷۱	۳۰۸۱۷۵۲۸	۳۲۶۴۶۲۹	۳۱۶۳۷۵۳۰
۱۸۵۶ - ۵۷	۱۷۷۲۲۱۷۰	۳۱۶۹۱۰۱۵	۳۵۲۹۶۷۳	۳۱۶۰۸۸۷۵
۱۸۵۷ - ۵۸	۱۵۳۱۷۹۱۱	۳۱۷۰۶۷۷۶	۶۱۱۶۲۰۴۳	۴۱۲۴۰۵۷۱

مذکورالصدر اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکۂ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے سال اول

بیس۲۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ مطالبات وطن کی تکمیل کے بعد بھی محاصل ہندوستان میں فاضل واصلات تھی۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ لارڈ ولیم بنٹنک کا نظم ونسق حد درجہ محتاط تھا اس کے علاوہ خود اس نے اور اس کے قائم مقام سر چارلس مٹکاف نے بہت کچھ تخفیف مصارف کی تھی۔ لیکن ۱۸۳۶ء میں لارڈ آکلینڈ ہندوستان کیا آیا کہ اُس نے لارڈ پامرسٹن کی ہمہ گیر حکمت عملی کا آغاز کر دیا اور اسی سال سے ہندوستان میں فاضل واصلات نہ رہی بلکہ الٹی کمی ہونے لگی اور آکلینڈ کے جانشین لارڈ ایلنبرو کے نظم ونسق میں بھی یہی حالت برقرار رہی۔

بعد کے دو گورنر جنرل ہارڈنگ اور ڈلہوزی نے سکھوں سے جو لڑائیاں شروع کر دیں تو حالت اور بھی بدتر ہوگئی مگر سکھوں کی آخری جنگ کے ختم پر اور پنجاب کے زرخیز صوبے کے الحاق کے بعد ۱۸۴۹۔۵۰ء میں ہندوستان میں پھر فاضل واصلات ہوئی۔ لیکن ہندوستان کی قسمت شہنشاہیت کے نوجوان شیدائیوں ہی کے ہاتھوں میں تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فاضل واصلات پھر مفقود ہوگئی۔ ڈلہوزی کی حکومت کے ختم پر ہندوستان کے مصارف جامہ میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ ۱۸۵۴۔۵۵ء میں یہ تین کروڑ پونڈ ہو گئے اور ناگپور اور دوسری زرخیز ریاستوں کو الحاق کر لینے کے باوجود ڈلہوزی کے ہندوستان سے روانہ ہونے کے سال تک (۱۸۵۵۔۵۶ء) ہندوستان کے محاصل میں کمی ہی واقع ہوتی رہی۔

البتہ لارڈ کیننگ نے اپنی نظم ونسق کے سال اوّل فاضل واصلات دکھائی تھی اور وہ بھی محض اودھ کے الحاق کی بنا پر جو اس کے ہندوستان آنے سے کچھ پہلے عمل میں آیا تھا لیکن یہ فاضل واصلات غدر کے سال (۱۸۵۷۔۵۸ء) ایک کروڑ کمی سے پھر مبدل ہوگئی۔

مذکورالصدر نقشے سے ایک اور دلچسپ مگر افسوسناک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ انگلستان میں جو کچھ خرچ ہندوستان کے حساب میں محسوب ہوتا تھا اور جس کو "مطالبات وطن" کہا جاتا ہے اس میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا حالانکہ برطانوی شہنشاہی ہند کے قائم و برقرار رکھنے میں ہندوستان اور انگلستان دونوں کا فائدہ تھا اس لئے ان دونوں کو اس شہنشاہی کے مصارف آپس میں بانٹ لینا چاہئے تھا مقتضائے انصاف بھی یہی تھا کہ ہندوستان کے ان مصارف کا

نو عشر جو ہندوستان ہی پر خرچ ہوا تھا ہندوستان کو اپنے محاصل سے ادا کرنا لازم تھا اور ان مصارف کا کم سے کم ایک عشر جو انگلستان میں صرف ہوا تھا خود انگلستان کو ادا کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن برنیوس کے زمانے میں شمشیر فاتح جیسے ترازو میں تولی گئی تھی وہی بات اب بھی ہو رہی تھی اور حق تو یہی ہے کہ حکمراں و محکوم اقوام کے مابین مالی انتظامات کبھی از روئے انصاف ہوتے ہی نہیں اس طرح کی سالانہ بدررو سے ہندوستان کو سراسر نقصان ہی پہنچا تھا ملک سے باہر جو کچھ زر چلا جاتا تھا وہ ملک میں کبھی واپس نہیں آتا تھا اور لطف یہ کہ ایک مفلس و نادار ملک کا روپیہ ایک مالدار و دولتمند ملک کی تجارت و حرفت کو بارور کرنے کے لئے یوں بہا چلا جارہا تھا۔

ایک سربرآوردہ عہدہ دار نے جس کی مستحسن کارگزاری پر ہم نے پانچویں باب میں تبصرہ کیا ہے لکھا تھا کہ "برطانیۂ عظمیٰ کو خراج ادا کرنے کا اثر ہندوستان کی معاشی حالت پر جو پڑتا ہے وہی ہماری موجودہ حکمت عملی کی نہایت قابل اعتراض صورت ہے۔ اگر محصولات اسی ملک میں صرف کیے جائیں جہاں وہ وصول کیے جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ اس سے بالکل مختلف ہو گا کہ محصولات ایک ملک میں وصول کیے جائیں مگر صرف دوسرے ملک میں ہوں۔ اول الذکر صورت میں عام لوگوں سے جو محصولات وصول کیے جاتے ہیں وہ رعایا کے اس حصے کو جو سرکاری ملازمت میں داخل ہے تنخواہوں وغیرہ کی شکل میں ادا کیے جاتے ہیں اور ان سرکاری ملازموں کے ذاتی خرچ سے محصولات کی یہ رقم اہل حرفہ کو واپس مل جاتی ہے۔ اس سے صرف تقسیم محاصل میں فرق ہو جاتا ہے ورنہ مجموعی حیثیت سے تو قومی آمدنی کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔"

"لیکن اگر محصولات کی رقم اسی ملک میں جہاں یہ محصولات وصول ہوتے ہیں صرف نہ کی جائے تو پھر صورت حال بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں فقط یہ نہیں ہوتا کہ قومی آمدنی کا ایک حصہ شہریوں کے ایک طبقے سے دوسرے طبقے پر منتقل ہو جائے بلکہ اس سے وہ تمام رقم جو محصول دینے والے ملک سے باہر اد سال

کردی جاتی ہے ہمیشہ کے لئے ملک ہی سے مفقود ہو جاتی ہے اور اہل ملک کے حق میں یہ نقصان مطلق کے برابر ہے۔ قومی پیداوار پر اس کے اثر کے متعلق کچھ نہ پوچھئے۔ اس رقم کا ممالک غیر ارسال کر دینا ایسا ہی ہے۔ جیسے پوٹلی بنا کر کسی نے اس رقم کو دریا میں پھینکدیا۔

"خراج ہند کو خواہ آپ ترازوئے عدل میں تولیے خواہ آپ ہمارے حقیقی مفاد کی روشنی میں دیکھئے بہر صورت وہ انسانیت معمولی عقل۔ اور معاشیات کے مسلمہ اصول کے بالکل خلاف ہی نظر آئے گا۔ اس لیے صحیح دانائی اسی میں ہے کہ حکومت ہند کے ایسے مصارف جو مطالبات وطن کی شکل میں عاید تو ہوتے ہیں مگر درحقیقت ان کی نوعیت خراج کی سی ہے آیندہ شہنشاہی خزانے ہی سے ادا کرنے کی گنجائش رکھی جائے۔ یہ مصارف غالباً حسب ذیل مدات پر مشتمل ہوں گے:۔ ایسٹ انڈیا کے حصص پر مقسومات ملکی قرض پر سود، حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کے عہدہ داروں اور عملے کی تنخواہوں اور اس کی عمارات وغیرہ کے اخراجات تعمیر و ترمیم ہندوستان کے ملازمین فوج و دیوانی کی جو انگلستان میں ہوں تنخواہ ایام رخصت و وظائف وغیرہ وہ تمام قسم کے اخراجات جو ان برطانوی لشکریوں سے متعلق ہیں جو ہندوستان میں خدمت بجالاتے ہیں نیز ان کی آمد و رفت کے مصارف کا ایک حصہ وغیرہ۔"

اس کتاب کی پہلی جلد میں ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کے قیام و عروج سے ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی تک کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے ناظرین نے دیکھا ہو گا کہ برطانوی حکمرانی کی ابتدا سے ۱۸۳۷ء تک بھی ہندوستان کے جملہ محاصل انگریز عہدہ داروں کی بڑی بڑی تنخواہوں اور ہندوستان کی جنگ وجدل کے بے جا صرفے کے باوجود ہندوستان کے خرچ سے جو ہندوستان ہی میں ادا ہوتا تھا بڑھے ہوئے تھے۔ اس باب میں بھی جو اعداد پیش کئے گئے ہیں اُن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے پہلے اکیس (۲۱) سال یعنی ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۸ء تک بھی آمدنی ان تمام مصارف سے بڑھی ہوئی تھی جو ہندوستان میں عائد ہوتے تھے۔ اسلیے یہ کہنا بالکل بجا ہو گا کہ اگر برطانوی حکمرانی کی ابتدا ہی سے ہندوستان پر مطالبات

وطن سے بالکل بری الذمہ رہتا تو سنہ ۱۸۵۸ء میں جب ہندوستان کی حکمرانی تاج برطانیہ پر منتقل ہوئی تو اس وقت ہندوستان کے ذمے کوئی سرکاری قرض نہیں رہتا، بلکہ بہ حیثیت مجموعی یہ محاصل اس کے حق میں فاضلات ہی نکلتے۔ ہندوستان کا تمام سرکاری قرض جو کمپنی کی صد سالہ حکومت میں اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ نوعیت میں دراصل وہی دین تھا، جو انگلستان میں واجب الادا مصارف کی تکمیل میں ہندوستان پر ہو گیا تھا حالانکہ حق اور انصاف کی رو سے یہ مصارف ہندوستان کے خزانے سے واجب الادا نہ تھے۔ اگر اس صدی کے ہندوستان اور برطانیۂ عظمیٰ کے باہمی مالی تعلقات پر کسی غیر جانب دار عدالتی حاکم کی رائے لی جائے تو اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ اس کا فیصلہ بھی یہی ہو گا: ہندوستان سے برطانیۂ عظمیٰ کو جو فائدہ پہنچا تھا وہ مطالبات وطن کی مجموعی رقم سے بھی بہت زیادہ تھا۔ اس لیے حق اور انصاف تو یہی تھا کہ انگلستان ہی ان اخراجات کو ادا کر دیتا۔

یہ کہنا شرط انصاف و اخلاق ہے کہ ۱۸۵۸ء میں تو ہندوستان پر کوئی قرض ہی نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ برخلاف اس کے اس زمانے میں اضافۂ رقوم کی ادائی کے معاوضے میں وہ انگلستان کے لیندار ہونے کا بھی دعویٰ کر سکتا تھا۔

یہ کہنا ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں مبنی بر انصاف ہو گا کہ اس کے نظم و نسق میں جو مطالبات وطن ہوتے تھے وہ نسبتاً کم ہوتے تھے یعنی وہ ہندوستان کے سالانہ محاصل کا ایک عشر تھے غدر سے بیس سال قبل تک محاصل دو کروڑ سے تین کروڑ دس لاکھ ہو گئے تھے اور مطالبات وطن پچیس لاکھ سے پینتیس لاکھ ہوئے تھے۔ جب نظم و نسق ہند براہ راست تاج برطانیہ کے تحت فرمان ہوا تو اس کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ مطالبات وطن میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہو گیا اور تاج برطانیہ کی حکومت کی غیر ذمہ داری سے مطالبات وطن کا یہ اضافہ نہ صرف بجائے خود اضافہ تھا بلکہ محاصل کے تناسب بھی اس کو اضافہ ہی کہنا چاہیے اس نتیجہ پر جان اسٹوارٹ مل کی وہ رائے صادق آتی ہے جو پچھلے باب میں بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ وزیر ہند اور اس کی کونسل کے توسط سے ہندوستان پر حکمرانی

کرنا "ایک ایسی مکمل مطلق العناں حکومت کے برابر ہے جو برطانوی حکمرانی کے تحت ممکن ہے۔"

سنہ ۱۷۹۲ء میں ہندوستان کا جملہ قرض ستّر لاکھ سے کچھ زیادہ تھا مگر سنہ ۱۷۹۹ء میں وہ ایک کروڑ کو پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد لارڈ ویلزلی کی لڑائیاں شروع ہوئیں اور یہ قرض سنہ ۱۸۰۵ء میں دو کروڑ دس لاکھ جو تھا سنہ ۱۸۰۷ء میں دو کروڑ ستّر لاکھ ہو گیا۔ کئی سال تک اس میں کچھ کمی و بیشی نہیں ہوی لیکن سنہ ۱۸۲۹ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے ہندوستان آنے کے ایک سال بعد یہ تین کروڑ ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام عہد حکومت میں یہی ایک لائق اور محتاط گورنر جنرل ایسا گزرا ہے جس نے ہندوستان کے سرکاری قرض میں معتد بہ تخفیف کی تھی۔ چنانچہ ۳۰ اپریل سنہ ۱۸۳۶ء میں یہ قرض ۴۳۴-۲۶۹۴۲ پونڈ رہ گیا تھا۔

ذیل کے نقشے سے اکیس (۲۱) سال تک یعنے ملکہ وکٹوریہ کے سال تخت نشینی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی برخاستگی تک ہندوستان کا سرکاری قرض کتنا رہا ہے اس کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اس نقشے کے اعداد سرکاری اسناد سے لیے گئے ہیں:-

سنہ عیسوی	ہندوستانی قرض	انگلستان میں واجب الادا ہندوستانی قرض	میزان
	پونڈ	پونڈ	پونڈ
۱۸۳۷ - ۳۸	۳۰۲۴۹۸۹۳	۳۵۲۲۸۲۵	۳۳۷۷۲۷۱۸
۱۸۳۸ - ۳۹	۳۰۲۳۱۱۶۲	۱۷۳۴۳۰۰	۳۱۹۶۵۴۶۲
۱۸۳۹ - ۴۰	۳۲۷۵۰۶۹۷	۱۷۳۴۳۰۰	۳۴۴۸۴۹۹۷
۱۸۴۰ - ۴۱	۳۴۱۸۷۸۲۷	۱۷۳۴۳۰۰	۳۵۹۲۲۱۲۷
۱۸۴۱ - ۴۲	۳۶۶۷۰۱۷۳	۱۷۳۴۳۰۰	۳۸۴۰۴۴۷۳
۱۸۴۲ - ۴۳	۳۸۷۴۴۳۴۰	۱۷۳۴۳۰۰	۴۰۴۷۸۶۴۰
۱۸۴۳ - ۴۴	۴۰۱۴۹۱۵۱	۱۷۳۴۳۰۰	۴۱۸۸۳۴۵۱
۱۸۴۴ - ۴۵	۴۱۲۰۳۱۵۰	۲۲۹۹۶۰۰	۴۳۵۰۲۷۵۰

۱۸۴۵ - ۴۶	۴۱۵۹۲۲۴۹	۲۲۹۹۶۰۰	۴۳۸۹۱۸۴۹
۱۸۴۶ - ۴۷	۴۴۵۸۴۶۲۵	۲۲۹۹۶۰۰	۴۶۸۸۴۲۲۵
۱۸۴۷ - ۴۸	۴۵۹۵۷۶۱۳	۲۷۹۹۶۰۰	۴۸۷۵۷۲۱۳
۱۸۴۸ - ۴۹	۴۷۱۵۱۰۱۸	۳۸۹۹۵۰۰	۵۱۰۵۰۵۱۸
۱۸۴۹ - ۵۰	۵۰۰۳۵۲۶۸	۳۸۹۹۵۰۰	۵۳۹۳۴۷۶۸
۱۸۵۰ - ۵۱	۵۱۱۹۹۸۱۵	۳۸۹۹۵۰۰	۵۵۰۹۹۳۱۵
۱۸۵۱ - ۵۲	۵۱۲۱۵۱۹۳	۳۸۹۹۵۰۰	۵۵۱۱۴۶۹۳
۱۸۵۲ - ۵۳	۵۲۳۱۳۰۹۴	۳۹۲۰۵۹۲	۵۶۲۳۳۶۸۶
۱۸۵۳ - ۵۴	۴۹۷۶۲۸۷۶	۳۹۲۰۵۹۲	۵۳۶۸۳۴۶۸
۱۸۵۴ - ۵۵	۵۱۶۱۵۵۲۸	۳۹۱۵۵۹۲	۵۵۵۳۱۱۲۰
۱۸۵۵ - ۵۶	۵۳۸۴۸۹۲۲	۳۹۱۵۳۱۷	۵۷۷۶۴۲۳۹
۱۸۵۶ - ۵۷	۵۵۵۴۶۶۵۲	۳۹۱۵۳۱۷	۵۹۴۶۱۹۶۹
۱۸۵۷ - ۵۸	۶۰۷۰۴۰۸۴	۸۷۶۹۴۰۰	۶۹۴۷۳۴۸۴

سنہ ۱۸۳۹-۴۰ء میں جیسا اوپر کے نقشے سے ظاہر ہوتا ہے سرکاری قرض میں جو پچیس لاکھ کا اضافہ نظر آتا ہے وہ دراصل اضافہ نہیں ہے بلکہ جن سرکاری کاغذات سے یہ اعداد ماخوذ ہیں ان میں دو مختلف طریقوں پر حسابات رکھے گئے تھے جس کی وجہ سے یہ حسابی تفاوت پیدا ہو گیا۔ لیکن سنہ ۱۸۴۱-۴۲ء سے لارڈ آکلینڈ کی کم بخت جنگ افغان کے مضر اثرات ہندوستان کے مالیات پر پڑنے لگے اور سنہ ۱۸۴۴-۴۵ء تک جملہ سرکاری قرض تین (۳) کروڑ پینتالیس لاکھ پونڈ سے چار (۴) کروڑ پینتیس (۳۵) لاکھ پونڈ ہو گیا۔ جنگ افغان کے مصارف کا بوجھ ہندوستان کے مالیات پر ڈالنے پر نہ صرف ایسٹ انڈیا کمپنی نے اعتراض کیا بلکہ جب جان برائیٹ نے یہ کہا کہ "گزشتہ سال جنگ افغان کے کثیر مصارف (تقریباً ڈیڑھ کروڑ پونڈ) کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ یہ تمام و کمال اہل انگلستان کی آمدنی محصولات ہی سے ادا ہونا چاہئے کیونکہ یہ جنگ انگریزی کابینہ کے حکم سے اور انگریزوں کے اعتراض کی خاطر ہوئی تھی" تو اس پر دارالعوام کے متعدد ارکان

جان برائیٹ سے بالکل متفق الرائے ہو گئے۔

لارڈ ایلنبرو کے الحاق سندھ اور لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ڈلہوزی کے سکھوں سے جنگ کرنے سے مالی ذمہ داریاں اور بڑھ گئی تھیں چنانچہ ۱۸۵۰-۵۱ء تک سرکاری قرض بڑھتے بڑھتے پانچ کروڑ پچاس لاکھ ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ کمی و بیشی ہوتی رہی اور قرض میں تخفیف کرنے کی کوشش بھی کی گئی مگر ڈلہوزی کی حکومت کے آخری سال یہ قرض پانچ کروڑ پچانوے لاکھ پونڈ ہو گیا ۱۸۵۷ء میں غدر کیا ہوا کہ اس ایک سال میں قرض میں ایک کروڑ پونڈ کا اضافہ ہو گیا اور اس طرح ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کا جملہ قرض چھ کروڑ پچانوے لاکھ پونڈ تک پہنچ گیا۔

ایک غیر جانبدار مورخ نے لکھا ہے کہ دنیا میں بغاوت کرنے پر اگر کوئی حق بجانب تھا تو وہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان تھے جن کو گائے اور سور کی چربی ملے ہوئے کارتوس دیئے گئے تھے اور یہ ان کی نظروں میں گناہ کبیرہ سے کم نہ تھا۔ یہ سنگین غلطی انگریز منتظمین مملکت ہی سے سرزد ہوئی تھی مگر ہندوستان کو اس کا خسارہ اٹھانا پڑا۔ اس سے پہلے ہندوستانی فوج سے چین اور افغانستان میں کام لیا گیا تھا مگر اپنی قلمرو کے بیرون حدود ہندوستانی فوج کی خدمت بجا لانے کے معاوضے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک حبہ بھی نہیں ملا تھا۔ برخلاف اس کے جب بغاوت فرو کرنے کے لئے انگریزی فوج ہندوستان بھیجی گئی تو انگلستان نے اس کے کل مصارف ایسے تشدد کے ساتھ وصول کیے کہ اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔

"محکمۂ نوآبادیات بہ الفاظ دیگر بہ استثنائے ہندوستان برطانوی نوآبادیاں اور مقبوضات کا انگلستان میں جو محکمۂ سرکار قائم ہے اس کے تمام مصارف نیز بری اور بحری افواج وغیرہ کے جملہ اخراجات ممالک متحدہ برطانیہ کے محاصل ہی سے ادا ہوتے ہیں۔ اس سے قطرتاً یہی استنباط کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے مثل ہندوستان کے مصارف لاحق بھی اسی ملک کے خزانے سے ادا ہوتے ہوں گے۔ لیکن واقعہ کیا ہے؟ برطانیہ کے محاصل سے ایک حبہ بھی ہماری شہنشاہی ہند کے فوجی تحفظ پر صرف نہیں کیا جاتا۔"

"دیکھیے تعجب کی بات ہے کہ ایک قوم اپنی نوآبادیات اور مقبوضات کے علاوہ غیر ممالک کی بھی عند الضرورت زر سے مدد کرتی ہیں تو مبالغہ کے ساتھ

فیاضی دکھائے لیکن اپنی شہنشاہی ہند کی انتہائی مالی مشکلات کے باوجود خلاف عادت بعید القیاس کنجوسی کرے کہ ہندوستان کی امداد کرنے سے صاف انکار کر دے "

"سب سے بدترین بات تو ابھی بیان ہی نہیں کی گئی۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر معمول سے زاید فوجی دستے ہندوستان بھیجنے ہوتے ہیں جیسا حال کے ہنگامے میں ہوا تو انگلستان سے ان افواج کے روانہ ہونے سے چھ ماہ قبل کی تنخواہوں کا بار محاصل ہند ہی پر ڈالا جاتا ہے اور برطانوی افواج کا "محکمہ تقسیم تنخواہ" یہ رقم حکومت ہند سے وصول کر لیتا ہے "

"غدر کے سے نازک زمانے میں جب کہ مالیات ہند انتہائی ابتری میں پڑے ہوئے تھے اور ان کے سلجھانے سے مایوسی ہو چلی تھی برطانیہ عظمیٰ کی صرف یہی خواہش نہ تھی کہ ساحل برطانیہ سے روانہ ہونے کے بعد ان معمول سے زائد افواج کے جملہ مصارف ہندوستان ہی ادا کرے بلکہ یہ بھی کہ ان افواج کے انگلستان سے روانہ ہونے سے چھ ماہ قبل کے مصارف بھی جو اس ملک میں رہ کر خدمت بجا لانے سے متعلق تھے ہندوستان ہی سے ادا کیے جائیں "

ایک اور شخص تھا جس کی عظمت سر جورج وِنگیٹ سے بھی بڑھ کر تھی اس کا نام جان برائیٹ تھا اور اس نے غدر کے مصارف پر اپنی طرز خاص میں نہایت صاف دلی اور بیباکی کے ساتھ یوں اظہار خیال کیا ہے "میرے خیال میں چار کروڑ پونڈ جو اس بغاوت کے مصارف ہوں گے ان کا سنگین بوجھ اہل ہند کے کندھوں پر ڈالنا ظلم ہے۔ بالخصوص جب کہ یہ ہنگامہ دراصل پارلیمنٹ اور اہل انگلستان ہی کی بدانتظامی سے وقوع میں آیا ہے اگر انصاف کی رُو سے کردار و اعمال کا مواخذہ ہر شخص کے لیے برابر ہے تو پھر بیشک یہ چار کروڑ پونڈ ان محصولات ہی سے ادا ہونے چاہئیں جو اس ملک کے باشندوں سے وصول ہوتے ہیں "

ہم اس لیے ان اقتباسات کو پیش اور ان واقعات کو بیان نہیں کرتے کہ ان سے گزشتہ مباحث کی یاد تازہ کی جائے بلکہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان کے سرکاری قرض کا آغاز کس طرح ہوا تھا اس کی بلا کم و کاست توضیح کر دی جائے۔ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ انگلستان نے ہندوستان کی فتح اور نظم و نسق پر اور ذرائع آمدنی

کو ترقی دینے میں اپنا جو سرمایہ صرف کیا ہے اسی سے ہندوستانی قرض کا آغاز ہوا اگر موجودہ باب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء تک تو ہندوستانی قرض کے آغاز کے اسباب یہ نہ تھے۔ ہندوستان نے اپنی فتح اور اپنے نظم ونسق کے مصارف آپ ادا کیے تھے اور کمپنی کی حکمرانی کے آخر سال تک جو کچھ تھوڑا بہت طلا ہندوستان تک پہنچا تھا وہ اس خراج کے مقابل جس کو ہندوستان ایک صدی تک انگلستان کو برابر ادا کرتا رہا تھا ایک بہت ہی حقیر سی مقدار میں تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس خراج کا قریب قریب صحیح تخمینہ کرنا ناممکن ہے۔ سر جورج ونگیٹ کے حساب سے یہ خراج انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے ۱۸۵۸ء تک اس میں سود شامل کئے بغیر دس کروڑ پونڈ ہوتا ہے۔ منٹگمری مارٹن نے اس صدی کے ابتدائی تیس ۳۰ سال کی میعاد تک ہندوستان کی ۱۲ فی صدی معمولی شرح سود کے حساب سے سود در سود لگا کر اس قرض کی مقدار ۸۰۰ کروڑ بتائی ہے۔ ان حسابات میں وہ رقوم شامل نہیں ہیں جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے باہر ارسال ہوتی رہی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مطالبات وطن کی شکل میں جو خراج وصول کیا جاتا تھا۔ وہی ہندوستانی قرض کا اصل باعث تھا۔ ہندوستان اپنے نظم ونسق کے جملہ اخراجات نیز اپنے اندرون ملک فتوح والحاقات کے لئے آئے دن جو جنگ وجدل ہوتی رہتی تھی۔ ان کے کل مصارف آپ ادا کرتا تھا۔ لیکن ان مقامی مصارف کے علاوہ خراج کی پوری رقم ادا کرنا تو ہندوستان کے مقدور سے باہر تھا۔ چنانچہ سال بسال محاصل میں خسارہ ہی ہو رہا تھا حتیٰ کہ جب لارڈ ڈلہوزی ہندوستان سے چلا ہے اس وقت ہندوستان کا قرض بڑھتے بڑھتے چھ کروڑ پونڈ ہو گیا تھا اور غدر کے پہلے سال جب ایسٹ انڈیا کمپنی برخاست کر دی گئی اُس وقت یہ قرض مصارفِ غیر معمولی کی وجہ سے سات کروڑ پونڈ تک پہنچ چکا تھا۔

حکومت ہند کی تاج برطانیہ پر منتقلی کی وجہ سے جو تازہ مطالبات ہندوستان پر قائم ہوئے تھے ان کی آئندہ باب میں توضیح کی جائے گی۔ یوں تو تاج برطانیہ نے شہنشاہی ہند کمپنی سے خرید لی تھی مگر اس کی قیمت خریدہ دراصل جو اہل ہند نے

اپنی جیب سے ادا کی تھی یعنے کمپنی کے حصص کی قیمت کمپنی کے حصہ داروں کو تاج برطانیہ نے ادا نہیں کی تھی بلکہ ہندوستانی قرض کی شکل میں یہ ہندوستان ہی سے ادا ہوئی تھی۔

کیا انگلستان کم سے کم اس قرض کا کفیل ہی بن سکتا تھا؟ اس کفالت سے ہندوستانی قرض کے سالانہ سود میں دس لاکھ پونڈ تک تو تخفیف ممکن تھی جس سے ہندوستان کے محصول ادا کرنے والوں کا بوجھ ہلکا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈرتے ڈرتے لارڈ اسٹینلی نے جس کو لارڈ ڈاربی کا خطاب بعد کو سرفراز ہوا ۱۸۵۹ء میں یہی صلاح دی تھی:۔

"مجھ کو معلوم ہے کہ پارلیمنٹ اور اس ملک کی حکومت کی حکمت عملی ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ہندوستانی قرض کے متعلق جو ان کی دانست میں ہندوستان کے خزانۂ عامرہ ہی سے کلیتاً ادا ہونا چاہیے کسی قسم کی ذمہ داری کبھی قبول نہیں کی گئی۔ موجودہ حالت پر نظر کرتے ہوئے میں تو اس حکمت عملی میں کسی قسم کے تغیر کی سفارش نہیں کرتا کیونکہ خوب جانتا ہوں کہ اس طرح کی تجویز پر کیا کچھ شور نہ مچے گا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ قطعاً ایسی تجویز کو کبھی منظور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ سوال پھر بھی ہمیشہ نظروں کے سامنے آتا رہے گا اور اس پر نہ صرف موجودہ زمانے میں بلکہ آئندہ زمانے میں بھی غور کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔"

"اسی بنا پر میری استدعا دارالعوام سے یہ ہے کہ وہ میری یہ بات خوب ذہن نشین کر لے کہ اگر کبھی وہ وقت بھی آ جائے جب کہ اس مقررہ حکمت عملی میں تغیر واقع ہو جائے اور اس رقمی ذمہ داری اور دین کے لئے قومی ضمانت دی جائے تو ایسی کفالت سے ہندوستانی قرض کے سود میں کم سے کم ..... ۵ پونڈ بلکہ .... ۱ پونڈ تک تخفیف ہو جائے گی اور اس رقم سے اگر ذخیرہ ادائی قائم کر دیا جائے تو اس سے اس قرض کا بہت کچھ حصہ ادا ہو جائے گا۔"

اس کے چھ ماہ بعد خود جان برائیٹ نے ہندوستانی قرض کے لئے شہنشاہی کفالت دینے کے خیال کی مخالفت کی اور اس کا استدلال بھی اس کی اپنی خاص طرز کا تھا۔

"میں شہنشاہی کفالت کا اس لئے مخالف نہیں ہوں کہ مجھ کو اس معاملے میں انگریز محصول دینے والوں سے خاص ہمدردی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ محصول ادا کرنے والی انگریز رعایا عموماً ہندوستان کے معاملات سے بالکل غافل رہی ہے اس لئے اس طرح اپنی غفلت کی سزا اس کا بھگتنا درست ہے .... لیکن شہنشاہی کفالت پر میرا اعتراض یہ ہے کہ بالفرض ہم ہندوستان کے سب عمال کو ہندوستان کے تمام ذرائع آمدنی ختم کردینے کے بعد اہل انگلستان کی جیبیں ٹٹولنے کے لئے ایسی حالت میں چھوڑ دیں جب کہ اہل انگلستان کو ہندوستان کے مصارف پر نگرانی رکھنے کا کوئی حق حاصل نہ ہو تو پھر یہ کہنا ناممکن ہے کہ ایسے عمال کیا کیا بعید از قیاس فضول خرچی اور اصراف نہ کریں گے۔ اور اس طرح ہندوستان کو بچانے جاکر ہم خود انگلستان کو کہیں تباہ نہ کردیں؟"

افسوس ہے کہ جان برائیٹ کے سے شخص کو بھی یہ نظر نہ آیا کہ اگر اہل انگلستان پر بھی اس ہندوستانی قرض کی کچھ ذمہ داری عائد کردی جاتی تو پھر اہل انگلستان ہندوستان کے معاملات میں وہ اپنی پہلی سی غفلت نہیں برتتے بلکہ ہندوستان کے مصارف پر اپنی نگرانی بھی قائم کر دیتے۔

چودھواں باب

کمپنی کی حکمرانی کا اختتام

"ہندوستان کے لئے میری وداعی دعا اور توقع یہی ہے کہ ابدالآباد تک ہمارے زیر تسلط ممالک وصوبہ جات کی رپورٹیں سال بسال امن وامان، خوش حالی، و ترقی کی خوش خبری لاتی رہیں اور اُن کے عروج و اقبال بزبان حال سے شہادت دیں۔" اس پاک و نیک نیت تمنا و آرزو پر لارڈ ڈلہوزی نے انگلستان روانہ ہونے سے پہلے اپنے ہشت سالہ نظم ونسق ہند کے یادگار تبصرے کو ختم کیا تھا۔

"ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہئیے کہ ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ ابھی ابھی مطلع صاف نظر آرہا تھا ابھی ایک لکۂ ابر اُٹھا جو پہلے تو دیکھنے کو ہتیلی کے برابر تھا مگر بڑھتے بڑھتے ایسی کالی گھٹا بن گیا جس کا ہم پر چھا جانے کا اندیشہ ہے۔" لارڈ کیننگ کی اس جوابی تقریر کے یہ الفاظ پیشین گوئی کے برابر ہیں جو اس نے اپنے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے مجلس نظماء کی طرف سے لندن میں جو الوداعی ضیافت اس کو دی گئی تھی اس محفل میں کی تھی۔

لارڈ ڈلہوزی نے امن وامان خوش حالی اور ترقی کی جو چمکتی دمکتی تصویر کھینچی تھی وہ گردش تقدیر سے کچھ عرصے تک تو ماند پڑ گئی لیکن لارڈ کیننگ نے ایسی گھنگور گھٹا کی

پیشین گوئی کی تھی جس سے خود شہنشاہی ہند کے ورطۂ ہلاکت میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا اور بدنصیبی سے یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے اسباب اب کچھ پوشیدہ نہیں رہے جان لارنس نے لکھا ہے کہ "یہ حیثیت مجموعی دیسی فوج کا واقعی عقیدہ یہی تھا کہ ان کارتوسوں کا جو ان کی ذات پات میں رخنہ انداز تھے عام رواج پڑنے کے لئے صرف وقت درکار تھا........... اور یہی بات دراصل بناءِ غدر ہے۔ لارڈ رابرٹ کیسے بڑے مستند شخص کی تصدیق سے ہمیں اب یہ معلوم ہے کہ دیسی فوج کا یہ عقیدہ بالکل بے بنیاد نہ تھا اور جو کارتوس رائج کیے گئے تھے واقعی ان پر گائے اور سور کی چربی ملی ہوئی تھی

اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ پہلے تو یہ بغاوت محض سپاہیوں کی تھی مگر بعد کو اس میں ایسے سیاسی وجوہ بھی شامل ہو گئے کہ یہ بڑھتے بڑھتے شمالی ہند اور ممالک متوسط کے باشندوں کے متعدد طبقوں میں پھیل گئی اور اس کی شکل سیاسی شورش سے مبدّل ہو گئی۔ لارڈ ڈلہوزی نے وسیع عملداریوں کا عاجلانہ الحاق کر لیا تھا جس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اصل مقصد تمام ہندوستان فتح کر لینا ہی ہے اور یہ کہ اپنے مقصد کی تکمیل میں معاہدات اور قوانین ملک کی وہ کچھ پروا نہیں کرتی۔ لوگوں کو اطمینان قلب حاصل نہ تھا اور باغیوں کے سرخیل جو تھے انھوں نے متعدد اعلانات شائع کیے تھے جن میں پر دیسی حکمرانوں کی بے ایمانی اور طمع زمین کو بہر صورت ظاہر کیا تھا۔ جھانسی کی ریاست میں جس کا لارڈ ڈلہوزی نے الحاق کر لیا تھا وہاں کی رانی خود اس شورش کی روح رواں تھی۔ اس نے مردانہ لباس پہنکر انگریزی فوج کا مقابلہ بھی کیا تھا اور میدان جنگ ہی میں وہ کام آئی تھی۔ اودھ میں بھی جس کا الحاق لارڈ ڈلہوزی نے کر لیا تھا باغی سپاہیوں کے ساتھ آبادی کا ایک جم غفیر ہو گیا تھا۔ اور یہ لوگ اپنے معزول بادشاہ کا دم بھر رہے تھے اور اس کی حمایت کو تیار تھے۔

اس پُر از واقعات جنگ کے سنسنی خیز حالات کا بیان کرنا ہماری اس تالیف کے مقصد سے باہر ہے۔ سر جان کے اور میلیسن نے اپنی اپنی ضخیم تالیفات میں ان کو

بیان کیا ہے نیز حالیہ زمانے کی چند مختصر سی مگر بڑی خوبیوں کی کتابوں میں بھی ان کی تفصیل درج ہے۔ انگریزوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا لکھنؤ میں باغیوں کے ایک جم غفیر کے مقابلے میں شجاعت کے جوہر دکھانا اور انگریزوں کے سب سے اچھے اور سب سے سچے سپاہی ہنری لارنس کی "جس نے اپنا فریضہ بجالانے کی کوشش کی تھی" دردناک موت۔ وہ غیر متزلزل بہادری جو معدودے چند سپاہیوں نے کئی ماہ تک جو ختم ہوتے ہی نظر نہ آتے تھے دہلی کی مشہور تاریخی پہاڑی پر اپنا قبضہ قائم رکھنے میں دکھائی تھی کہ جان لارنس نے پنجاب کی خاک چھاننے کے بعد ایک ایسا دھاوا مارا کہ شہنشاہی کی قسمت کا فیصلہ ہی کر دیا۔ ممالک متوسط سے کامیاب گزر کر اس کا یلغار پہنچنا اور روہیلکھنڈ اور اودھ میں وہ طول طویل کٹھن فوجی نقل وحرکت غرض یہ سب انگریزوں کے تاریخی واقعات ہیں جو انگریزوں کی ادبیات کی سلک میں گوندھ دیئے گئے ہیں۔ عہد وکٹوریہ کے ملک الشعراء نے محاصرۂ لکھنؤ کا وہ ترانہ گایا ہے کہ کبھی دل سے وہ فراموش نہیں ہو سکتا اور موجودہ زمانے کے پسند عام اہل قلم نے بھی جان نکلسن اور فتح دہلی کی بہادری کے قصے خوب بیان کئے ہیں۔

غدر کے تاریک واقعات کو بیان کرنا موجودہ تالیف کا منشا نہیں ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کی دلی خواہش یہی ہے کہ کاش ان واقعات سے اب تاریخ کے صفحات بالکل پاک وصاف کر دیئے جائیں یا کم سے کم مدارس کی وہ نصابی کتابیں ہی جو لڑکوں کو پڑھائی جاتی ہیں۔ یوں تو کلائیو اور ویلنگٹن کے زمانے ہی سے ہندوستان میں متعدد جنگیں ہوتی رہی تھیں مگر ایک بھی جنگ کبھی ایسی نہیں ہوئی تھی جس پر ناحق و ناروا ظلم وستم گناہ وخطا کا اسقدر گہرا دھبہ لگا ہو جیسا ۱۸۵۷ء کے ہنگامے پر لگا تھا۔ باغیوں کے عقیدے میں ان کی ذات اور مذہب کو بچانا ضروری تھا مگر ادھر انھوں نے بے دست وپا عورتوں اور معصوم بچوں کو ایسی وحشیانہ سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ قتل کیا کہ اپنے بناء دعوے کو ذلیل وخوار اور اپنا منھ ہمیشہ کے لئے کالا کر لیا اور ادھر انگریزی فوج میلوں تک جہاں جہاں سے گزری اس نے گاؤں کے گاؤں جلا کر خاک کر دیئے اور ملک کو لوٹ و دق صحرا بنا دیا۔ انگریز فاتحین نے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد بھی دہلی میں قتل عام کیا اور انگریزوں

کے خاص کمشنروں نے شمالی ہند میں ہزاروں ایسے بیگناہوں کو سولی دیدی جو غدر میں بالکل بے خطا تھے اس مورخ کے الفاظ میں جو ابھی تک جین حیات ہے "یہ مقابلہ دو ایسی وحشی اقوام کے درمیان تھا جن کو انصاف یا رحم کا کچھ خیال نہ تھا اور صرف یہی جنون ان کے سر میں سمایا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح دشمن کو فنا کر دیا جائے۔ طرفین سے ہر طرح کے ظالمانہ افعال سرزد ہوئے جن پر اب پردہ ڈالنا ہی مناسب ہے۔"

ہندوستان میں لارڈ کیننگ سے بڑھکر کسی شخص نے اس ہولناک صورت حال کو محسوس نہیں کیا اور انگلستان میں ملکہ سے بڑھ کر کسی نے اس پر تاسف نہیں کیا۔ لارڈ کیننگ نے ملکہ کی خدمت میں یہ لکھا تھا کہ "بلا امتیاز کیسے فوری انتقام لینے کی وبا عام طور پر پھیلی ہوی ہے اور اس کا اثر اکثر ایسے اشخاص پر بھی پڑ رہا ہے جن سے اچھی مثال پیش کرنے کی توقع ہو سکتی تھی اور اس کا خیال آتے ہی کوئی شخص اپنے ہم وطن لوگوں کی حالت پر شرم سے عرق عرق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔" ملکہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ "لارڈ کیننگ بہ آسانی باور کر سکتے ہیں کہ اس غیر مسیحی جذبے پر جو یہاں بھی عامۃ الناس ہندوستان کے خلاف بڑی حد تک ظاہر کرتے رہتے ہیں ملکہ معظمہ بدولت بھی تاسف اور غصے کے اظہار میں لارڈ کیننگ سے بالکل متفق الاحساس ہیں۔"

بس یہ سمجھئے کہ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ برطانوی قوم نے پہلے ہی سے اس کا تہیہ کر لیا تھا۔ غدر کی وجہ سے ایک اچھا موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔ لارڈ پامرسٹن ۱۸۵۵ء میں وزیر اعظم ہو گیا تھا اور اس نے اپنی عادت کے موافق مستعدی کے ساتھ جنگ کریمیا کو بھی ختم کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انتخاب کے بعد اس کی حکومت ایک کثیر غلبۂ آراد سے پھر قائم ہوی اور اسی سال اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر نشین کو اطلاع دی کہ حکومت ہند کو براہ راست تاج برطانیہ کی زیر نگرانی لے لینے کے لئے اس کی حکومت کا ارادہ پارلیمنٹ میں ایک مسودۂ قانون پیش کرنے کا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر نشین راس منیگل اور نائب صدر نشین سر فریڈرک کری نے ۳۱ دسمبر ۱۸۵۷ء میں اس کا جواب دیا کہ "مجلس نظماء کو ملکہ معظمہ کی حکومت

کی اس تجویز پر تعجب ہوتا ہے کہ کمپنی پر غدر کے متعلق کوئی الزام لگائے بغیر اور پارلیمنٹ کے توسط سے کسی قسم کی تحقیقات کیے بغیر وہ کمپنی کی بیخ کنی کرنا چاہتی ہے" مجلس نظماء کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان میں اچھی حکومت قائم رکھنے کے لئے کمپنی کی سی" ایک درمیانی غیر سیاسی اور بالکل خود مختار جماعت" ہی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اور یہ عقل میں نہیں آتا تھا کہ اگر اس مجوزہ حکومت جدید کے سب ارکان تاج برطانیہ ہی کی طرف سے مقرر کیئے جائیں تو پھر ایک ایسی "غیر سیاسی اور خود مختار جماعت" کا قیام کیسے ممکن تھا۔

کمپنی نے ایک باضابطہ عرضی بھی دارالعوام اور دارالامرا میں پیش کی تھی جس کو تیز نظر اور صاحب بصیرت جان اسٹوارٹ مل نے لکھ کر دیا تھا۔ ایسے بر مغز اور فلسفیانہ شخص کے قلم کی تحریر آج بھی ہمارے لئے دلچسپی رکھتی ہے اسی لئے اس کے دو ایک فقرے خاص طور پر یہاں قابل اعادہ ہیں:۔

اس دوعملی کا حوالہ دیتے ہوئے جو کمپنی کے نظماء اور ملکہ معظمہ کے ایک وزیر کی نگرانی میں جو مجلس نظم کی صدارت کرتا تھا جاری تھی جان اسٹوارٹ مل نے خاص وجوہ پر حسب ذیل عرض کیا:۔

"یہ کہ ان حالات میں اگر نظم ونسق ناکام ثابت ہوا ہے تو سائلوں کے نزدیک یہ توقع رکھنا بالکل نامناسب ہے کہ اقتدار حکمرانی کے شعبے کو جو تنہا تو غلطی پر نہیں ہوسکتا تھا مگر کے تمام اختیارات دوسرے ایسے شعبے کو جو ہر حقیقی یا مفروضہ غلطی میں ناگزیر طور پر اس کا شریک غالب ہے اس لئے تفویض کر دیئے جائیں کہ اس سے واقعی اصلاح حال ہوسکتی ہے۔ یہ باور کر لینا کہ حکومت ہند مجلس نظماء کی مدد کے بغیر صرف ایک وزیر تاج برطانیہ کی زیر نگرانی اسی طرح جاری رہ سکتی ہے کہ اس سے کم غلطیاں سرزد ہوں یہ باور کر لینے کے برابر ہے کہ وزیر تاج برطانیہ نے باوجود ہندوستان پر حسب دلخواہ حکومت کے پورے پورے اختیارات رکھنے کے خراب حکومت محض اس لئے کی کہ اس کو تجربہ کار اور ذمہ دار مشیروں نے مدد دی تھی۔"

وزیر ہند کی مجوزہ کونسل کے متعلق اس نے حسب ذیل عرض کیا:۔

"یہ کہ سائلوں کی نظروں میں ہندوستان کے لئے اس سے بدتر حکومت کوئی اور نہیں

ہوسکتی کہ ایک وزیر ایسی کونسل کی برائے نام مدد سے اس پر حکومت کرے جس سے مشورہ لینے یا نہ لینے کی اس کو اپنی مرضی کے موافق آزادی حاصل رہے.... یہ کہ کوئی جماعت ہی وزیر کی شریک حکومت کیوں نہ بنا دی جائے لیکن اگر اس سے وزیر کے افعال کی روک تھام نہ ہو سکے گی تو پھر وہ وزیر کے لیئے ٹٹی کی اوٹ بن جائے گی .... یہ کہ سائلوں کو یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی کونسل کو جس کے سب ارکان کا تقرر تاج برطانیہ کی طرف سے ہو رائے اور فعل کی وہی خود مختاری حاصل رہے گی جو مجلس نظماء کا خاصہ رہی ہے .... یہ کہ سائلوں کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اگر نگرانی کرنے والی جماعت کلیتاً وزیر ہی کی مامور کردہ ہو تو پھر کیونکر پارلیمنٹی گروہ کے اس خود مختارانہ اثر کو جو اب تک نظم و نسق ہند کی نیز اس ملک کے اہم ذمہ دارانہ خدمات پر تقررات کرنے کے اقتدار کی، ایک امتیازی خصوصیت رہا ہے آئندہ برقرار رکھنے کی توقع کی جاسکتی ہے"۔

ہر طرف سے دو عملی پر جو طعن و تشنیع ہو رہی تھی اس کے متعلق عرض کیا گیا تھا "پارلیمنٹی دستور میں نہ صرف دو عملی بلکہ سہ عملی کا ہونا نقص نہیں بلکہ بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ سائلوں کی دانست میں عاملانہ اقتدار البتہ واحد ہونا اکثر مفید ہے کیونکہ ہر بات کا بروقت اور فوری عمل میں آنا ایک امر ناگزیر ہے۔ لیکن سابقہ تجاویز پر نہایت غور و خوض کے بعد اظہار رائے اور آئندہ کی حکمت عملی کے لیئے اصول کا مقرر کرنا سائلوں کے خیال میں ایک ایسا کام ہے جس میں ایک سے زیادہ اشخاص کا اتفاق آرا ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ ایسی جماعت میں دو عملی کا ہونا کوئی نقص نہیں اور اس جماعت کا واحد ہونا کوئی خوبی نہیں"۔

اس عرضی کے پیش کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ لارڈ پامرسٹن نے کمپنی کی حکمرانی برخاست کرنے اور حکومت ہند کی آئندہ تشکیل کے لیئے اپنا مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش کر دیا۔ اس میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ نظم و نسق کا وہ حصہ جو انگلستان میں واقع تھا ایک کونسل کے جو آٹھ ارکان پر مشتمل تھی اور اس کے میر مجلس کے ہاتھوں میں رہنا چاہیئے۔ ان سب کا تقرر تاج برطانیہ کی طرف سے عمل میں آنا ضروری ہے اس کونسل کے ارکان ہشت سالہ میعاد کے لیئے مقرر ہوں گے اور ان میں ہر سال

وٹو ڈٹو باری باری سے علیحدہ ہوتے رہیں گے ۔ جب یہ مسودہ دوسری مرتبہ دارالعوام میں پڑھا گیا تو منظور کر لیا گیا لیکن آخری منظوری سے پہلے لارڈ پامرسٹن کی حکومت مسودۂ قانون سازش کی بناء پر جس کا منشا شہنشاہ فرانس کو ان سیاسی مجرموں کی چالبازیوں اور سازشوں سے بچانا تھا جو انگلستان میں پناہ گزین تھے زوال آ گیا ۔

اس کے بعد لارڈ ڈاربی نے "قدامت پسند" حکومت قائم کی بنجمن ڈزریلی وزیر مال نے اپنا جدید مسودۂ قانون ہند پیش کیا جو نہایت پیچیدہ ناقابل عمل اور مضحکہ خیز تھا ۔ اس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ کونسل ہند دو طرح کے ارکان پر مشتمل ہونی چاہئے ایک تو وہ جنھیں تاج برطانیہ نے مامور کیا ہو اور دوسرے وہ جن کو مانچسٹر وغیرہ شہروں کے باشندوں اور ایسٹ انڈیا حصص کے قابضوں نے منتخب کیا ہو ۔ مسٹر ڈزریلی کے اس منصوبے کا وہ مضحکہ اڑایا گیا کہ اس شرم و خجالت سے یہ تجویز بالائے طاق ہو گئی ۔ اس مسودۂ قانون کے متعلق لارڈ پامرسٹن نے وہی کہا جو ڈون کوئکسوٹ کے متعلق کہا گیا تھا یعنے جب کبھی اس نے کسی کو رستہ چلتے ہوئے ہنستا دیکھ لیا تو اس کو یقین تھا کہ وہ شخص مسٹر ڈزریلی کے مسودۂ قانون پر کہیں سے بحث کر کے چلا آ رہا ہے !" ایسٹر کی تعطیل کے بعد جب دارالعوام کا اجلاس پھر ہوا تو اس وقت اس مسودۂ قانون کی تائید کرنے والا ایک نہ تھا ۔

مجلس نظماء نے ان دونوں مسودات قانون کی خوب چھان بین کی اور اس کے بعد جان اسٹوارٹ مل کے قلم کی ایک مدلل اور بے باک رپورٹ مجلس ارکان کمپنی کی خدمت میں پیش کر دی ۔ اس کا ایک فقرہ ایسا ہے جو قارئین کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہے ۔

"ان مشکلات کے (ایک قوم کے دوسری قوم پر حکومت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں) رفع کرنے کا طریقہ جو اس مسودۂ قانون میں پیش کیا گیا ہے وہ صرف ایک وزیر کو غیر محدود اختیارات تفویض کر دینا ہی ہے ۔ ان دونوں مسودات قانون میں اس بارے میں کوئی اہم فرق نہیں ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اس وزیر کو ایک کونسل بھی دی جائے گی لیکن مطلق العنان سے مطلق العنان حکمران بھی کونسل رکھتے ہیں ۔ ایک مطلق العنان حکمران کی کونسل اور ایک ایسی کونسل جو حکمران کو مطلق العنان

ہونے نہیں دیتی ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک تو مطلق العنان حکمراں کی دست نگر بنی رہتی ہے اور دوسری بالکل خود مختار رہتی ہے۔ ایک کو تو کچھ اختیار رہتا ہی نہیں ہوتا اور دوسری کو کچھ اختیار ضرور ہوتا ہے پہلے (یا مرسٹن کے) مسودۂ قانون کی رُو سے کونسل کے تمام ارکان تاج برطانیہ ہی کی طرف سے مامور ہوتے ہیں دوسرے (ڈزرے لی کے) مسوّدہ قانون کی رُو سے ان میں سے صرف آدھے اس طرح مامور ہوتے ہیں ان دونوں کی رو سے جملہ فرائض کی انجام دہی چند معمولی باتوں کے بہ استثناء، وزیر کی صوابدید اور اختیار تمیزی ہی پر منحصر ہے ؎

اس استدلال کا جواب ہی نہیں دیا جا سکتا۔ نصف صدی گزر جانے کے بعد اصحاب فکر کی یہی رائے ہوگی کہ اگر ایک قومی اور خود مختار مجلس شوریٰ پہلے سے ایسی ہوتی جو وزیر کے افعال کو اعتدال پر لا سکتی تو اس سے ہندوستان کے معاملات کا انتظام بھی بہتر ہو جاتا۔ نظماء کمپنی کی مجلس اسی قبیل کی تھی مگر وہ اہل ہند کے اعراض کی نہیں بلکہ صرف کمپنی کے حصہ داروں کے اعراض کی ترجمانی کرتی تھی۔ قدیم نظام میں نقص یہی تھا اور اس خرابی کی اصلاح ضروری تھی۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ نے جو تنظیم جدید کی اس میں نقص کو دور نہیں کیا۔ مجلس نظماء کا سب اقتدار نیست و نابود کر دیا لیکن نظم و نسق کی جدید تنظیم میں ایک ایسی خود مختار مجلس شوریٰ کے لئے جو اہل ہند کی نمائندہ ہو اور ان کے اعراض اور فلاح و بہبود کو ہمیشہ پیش نظر رکھے کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی۔

مسٹر ڈزرے لی کے مسودۂ قانون کا تو فیصلہ ہو چکا تھا اس لئے ایک نیا قانون مرتب کرنے کی ضرورت داعی تھی۔ اس وقت یہ تحریک منظور ہوئی کہ جدید منصوبے کے اصول پر دار العوام میں بحث کر لی جائے اور دونوں سیاسی گروہ مل کر ایک مسودۂ قانون پیش کریں۔ چنانچہ یہی ہوا اور نیا مسودۂ قانون اگست ۱۸۵۸ء میں نافذ ہوا جو ”بہتر حکومت ہند کے قانون“ کے نام سے مشہور ہے۔

اس قانون کے ۷۵ باب ہیں اور چونکہ اب بھی نظم و نسق ہند میں اسی کے مطابق عمل ہوتا ہے اس لئے اس کی اہم دفعات کے متعلق یہاں کچھ کہنا ضروری ہے

ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری ملکۂ معظمہ کے مفوض کردی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور مجلس نظم کے اختیارات وزیر ہند کو تفویض کردیے گئے۔ وزیر ہند کو ایک کونسل بھی دی گئی تھی جو پندرہ ارکان پر مشتمل تھی اور یہ ارکان بشرطیکہ نیک چلن رہیں ہمیشہ کونسل کی خدمت پر رہ سکتے تھے اور ہر رکن کو ہندوستان کے محاصل سے سالانہ ۱۲۰۰ پونڈ تنخواہ ملتی تھی۔ وزیر ہند کا مشاہرہ اور اس کے عملے کی تنخواہیں سب ہندوستان کے خزانے ہی سے ادا ہوتی تھیں۔

چند مخصوص معاملات کے استثناء جن کا ذکر اس قانون میں کردیا گیا تھا اور سب معاملات میں وزیر ہند اس بات کا مجاز تھا کہ وہ چاہے تو غلبۂ آراء کے خلاف عمل کرے اور صلح و جنگ کے مسائل میں (جن کو اب تک مجلس نظم نظماء کی مجلس معاملات راز کے توسط سے طے کرتی تھی) وزیر ہند کو اختیار حاصل تھا کہ اپنی کونسل کے امتزاج یا اطلاع کے بغیر ہندبر براہ راست احکام صادر کرے۔

گورنر جنرل ہند اور گورنر بمبئی و مدراس کے تقرر کا اختیار جو ملکۂ معظمہ کے ہاتھ میں تھا اور لفٹننٹ گورنروں کا تقرر گورنر جنرل کرسکتا تھا۔ مگر اس شرط پر کہ ملکۂ معظمہ کے کوئی تقرر ناپسند نہ ہو۔ اس کے علاوہ امتحان مقابلہ میں کامیابی حاصل کرکے ہندوستان کی ملازمت دیوانی میں داخلے کے قواعد وزیر ہند کو ابھی مرتب کرنے تھے۔

اس قانون کی مالیات سے متعلق جو دفعات ہیں وہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ ان کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام کیپٹل اسٹاک (Capital Stock) پر مقسوم کے علاوہ کمپنی کا تمسکی "(Bond)" ادھاریتر" (Dhenture) اور دوسری شکل کا قرض جو برطانیۂ عظمیٰ میں واجب الادا تھا اور مقامی اور دوسری قسم کا وہ تمام قرض جو کمپنی کے ذمے تھا غرض یہ سب کچھ "ہندوستان کے محاصل ہی سے چونکہ قابل ادا تھا اس لئے محاصل ہند ہی سے ادا ہونا چاہئے"۔

اس عجیب و غریب دفعہ کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا کیپٹل اسٹاک" (Capital Stock) اور تمام قرض ہندوستان کے سرکاری قرض میں شامل کردیا گیا اور اس "اسٹاک" (Stock) پر سود کی شکل میں سالانہ جو خراج ہندوستان اب تک ادا کر رہا

تھا وہ دوامی کر دیا گیا۔ تاج برطانیہ نے شاندار شہنشاہی ہند کمپنی سے حاصل تو کر لی مگر اس کے لیے ایک حبہ بھی اس کو دینا نہ پڑا۔ جو اہل ہند نے اس کی قیمت ادا کی اور اب تک ادا کر رہے ہیں۔ ایک برطانوی مقبوضہ علمداری کے حق میں یہ ایسی بڑی ناانصافی تھی جس کی برطانوی شہنشاہی کی تمام تاریخ میں مثال نہیں ہے اس ناانصافی سے ہندوستان میں لوگوں کی گردنیں جھکی جارہی تھیں۔ بالخصوص جب کہ غدر کے فرو کرنے میں جو چار کروڑ پونڈ خرچ ہوئے تھے وہ بھی انھیں کے سر کر دیے گئے تھے۔

البتہ ایک مفید مالی شرط اس قانون میں عائد کی گئی تھی اور وہ یہ کہ "ملکۂ معظمہ کے مقبوضات ہند پر کسی واقعی حملے کے انسداد یا مدافعت کے سوا یا اسی طرح کی ناگہانی شدید ضرورت کے بہ استثنا پارلیمنٹ کی بلا منظوری محاصل ہند سے کسی ایسی فوجی نقل و حرکت کے مصارف کے لیئے استفادہ نہیں کیا جائے گا جو ان مقبوضات کے بیرون حدود وقوع میں آئیں خواہ اس زمانے میں ملکۂ معظمہ کی ان افواج کے معمولی مصارف محاصل ہند ہی سے ادا کیوں نہ ہوتے ہوں"

اس منصفانہ اور مفید اصول کی بھی بدقسمتی سے اکثر خلاف ورزی ہوتی رہی ہے چنانچہ مصر اور ایبی سینیا کی مہمات۔ افغانستان کی جنگ و جدل اور برما کی فتح کے سب مصارف ہندوستان کے خزانے ہی سے ادا ہوئے تھے۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد مجلس نظم باقی نہیں رہی البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی

لہ تاریخ انگلستان کے متعلین کو ایسی بے شمار مثالیں یاد ہوں گی جہاں برطانیۂ عظمی نے اپنی نوآبادیات اور مقبوضات کے لیے سنگین مصارف برداشت کیے تھے لیکن حیثیت مجموعی ایسے مصارف کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا گیا تھا حتی کہ سنہ ۱۹۰۰ء عیسوی میں جب رائل نائیجیر کمپنی سے برطانوی حکومت نے نائیجیریہ بمعاوضہ ۰۰۰ ۵۶۵ پونڈ خرید لیا تو یہ رقم نائیجیریہ کے محاصل میں محسوب نہیں کی گئی۔ حال ہی میں برطانیۂ عظمی نے جنوبی افریقہ کی شہنشاہی کے تحفظ و توسیع میں بیس کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ رقم صرف کی لیکن اس میں شک ہے کہ جنوبی افریقہ سے اس رقم کے ایک خفیف جز کے سوا کچھ اور وصول ہوگا۔

کا وجود اس لیئے باقی رکھا گیا کہ وہ اپنے اسٹاک (Stock) پر ہندوستان کے محاصل سے محض مقسوم وصول کر لیا کرے۔

ہندوستان کی آبادی کا کثیر حصہ ایسا ہی تھا کہ اس کو اس جدید قانون کے شرائط کا کچھ علم نہ تھا لیکن انہیں ملکۂ انگلستان کی تو خبر تھی اور اس نام کو اہل ہند بہت عزیز رکھتے تھے اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان لوگوں نے جب یہ سنا کہ شہنشاہی ہند ملکہ کے زیر انتظام ہو گئی ہے تو اس پر بڑی خوشیاں منائیں۔ اس وقت ہندوستان میں ایک مناسب موقع اعلان شائع کیا گیا اور یہ اعلان اہل ہند کو اس لیئے بہت عزیز ہے کہ اس کے مندرجہ خیالات خود ملکہ کے خیالات تھے۔

اس اعلان کا مسوّدہ اوّل ملکۂ معظمہ کو پسند نہ آیا۔ ملکہ نے لارڈ ڈاربی کو یہ کہہ کر دوسرا مسوّدہ لکھنے کا حکم دیا کہ "ملحوظ خاطر رہے کہ یہ اعلان ایک فرماں روا عورت کی طرف سے دس کروڑ سے زیادہ اہل مشرق کے نام ہے اور اس فرماں روا عورت نے اس موقع پر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے اور ایک خونریز جنگ کے بعد وہ اپنی مشرقی رعایا سے نیا عہد و پیمان کرتی ہے جس کا ایفا اس کی آیندہ حکومت پر منحصر رہے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے حکومت کے اصول کی بھی توضیح کر دی جائے ایسے اعلان میں جو بمنزلہ سند ہے۔ فیاضی، نیک نیتی اور مذہبی رواداری کے جذبات پھونک پھونک کر بھر دینا چاہیئے اور یہ بتانا چاہیئے کہ تاج برطانیہ کی دوسری رعایا کے ساتھ ہندوستانی رعایا کی مساوات قائم ہو جانے سے اس کو کیا کیا مراعات و حقوق حاصل ہو جائینگے اور کس طرح تمدن کے پیچھے پیچھے تمول و خوشحالی کے قدوم میمنت لزوم آئیں گے۔"

اپنی ہندوستانی رعایا کے متعلق ملکہ کے جذبات اس طرح کے تھے اعلان کا جدید مسوّدہ ملکہ کے حسب منشاء مرتب کیا گیا اور یہ اس عظیم الشان موقعے کے سزاوار بھی تھا۔ اہل ہند اس اعلان کو اپنا "منشور حقوق" سمجھتے ہیں اس لئے اس سند کو جو کچھ ایسی طویل نہیں ہے ابتداء سے انتہا تک یہاں نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اعلان ملکۂ معظمہ بہ اجلاس کونسل بنام والیان ریاست و سرداران

ور عایائے ہند:۔

"وکٹوریہ بہ فضل خدا ملکۂ بادشاہی متحدۂ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ و نو آبادیات و مقبوضات واقع یورپ و ایشیا و آفریقہ و امریکہ و آسٹریلیشیا محافظ دین۔

"ہرگاہ مختلف معقول وجوہ پر دینی اور دنیوی امرا اور والا العوام کے مشورے اور رضامندی سے ہندوستان کے عملداریوں کی جواب تک بطور ہماری امانت کے معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام تھیں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کا تصفیہ مابدولت نے کیا ہے"

"بناء برآں حاضرین کے ذریعہ سے مابدولت عوام کی آگاہی اور اطلاع کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ مذکور الصدر جماعتوں کے مشورے اور رضامندی سے مابدولت حکومت مذکورہ کی عنان اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور مذکورہ عملداریوں کی تمام رعایا کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ہمارے اور ہمارے ورثا اور جانشینوں کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہے اور انہیں کی حقیقی اطاعت پر کمربستہ رہے۔ اور جن کو مابدولت زمانۂ مابعد میں وقتاً فوقتاً مابدولت کے نام سے اور مابدولت کی طرف سے مابدولت مذکورہ عملداریوں پر حکومت کرنے کے لئے مقرر کرنا مناسب خیال کریں ان کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کرے"

"اور مابدولت اپنے فرزند جگر بند اور مشیر و معتمد علیہ چارلس جان وائکونٹ کیننگ کی عقیدت و وفاداری قابلیت اور رائے پر خاص اعتماد و اعتبار کرکے وائکونٹ کیننگ مذکور کو مذکورہ عملداریوں پر اور مذکورہ عملداریوں میں اس اعلان کی رو سے مابدولت کا پہلا وائسرائے اور گورنر جنرل اس لئے مقرر کرتے ہیں کہ وہ مابدولت کے نام سے وہاں کی حکومت کا نظم ونسق کریں اور مابدولت کے نام سے اور مابدولت کی طرف سے عام طور پر سب کچھ کریں بجز اس صورت کے کہ مابدولت کے ایک وزیر اعلیٰ کے توسط سے وقتاً فوقتاً احکام و قواعد مابدولت اس کے نام صادر کریں جو اس کے لئے واجب التعمیل ہوں گے"

"اور مابدولت اس اعلان کے ذریعہ سے ان تمام اشخاص کے تقرر کی جن کو معزز ایسٹ انڈیا کمپنی نے مختلف دیوانی اور فوج کی خدمتوں پر مامور کیا ہے اس شرط پر توثیق کرتے ہیں کہ ان کا انحصار مابدولت کی مرضی پر اور ایسے قوانین

وقواعد پر رہے گا جو اس کے بعد نافذ ہوتے رہیں گے"

"مابدولت ہندوستان کے دیسی والیانِ ریاست کی آگاہی کے لئے یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ ان تمام معاہدات اور شرائط و اقرار کو جو معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اقتدار یا براہ راست اُن سے طے ہوئے تھے ماہدولت بھی قبول کرتے ہیں اور بلا کم و کاست بہ احتیاط تمام ماہدولت ان سب کو برقرار رکھیں گے اور والیانِ ریاست سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بھی ان کی پابندی کریں گے"

"ہمارے موجودہ مقبوضات کے رقبے میں ماہدولت اضافہ کرنا نہیں چاہتے اور درآں حالیکہ ماہدولت کی قلمرو یا حقوق پر حملے کا اقدام کرنے والوں کو ماہدولت بغیر سزا دیئے نہ چھوڑیں گے اسی طرح ماہدولت دوسروں کی قلمرو یا حقوق پر دست اندازی کرنے کی کبھی منظوری نہیں دیں گے ماہدولت دیسی والیان ریاست کے حقوق عزت اور مرتبے کا وہی لحاظ و احترام کریں گے جو اپنے حقوق عزت اور مرتبے کا کرتے ہیں اور ماہدولت کی دلی خواہش یہی ہے کہ دیسی والیانِ ریاست نیز ماہدولت کی رعایا اس خوش حالی اور معاشرتی ترقی سے بہرہ اندوز ہو جو صرف اندرون ملک امن اور اچھی حکومت قائم رکھنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے"

ماہدولت اقرار و تسلیم کرتے ہیں کہ ماہدولت کی ہندوستانی عملداریوں کی دیسی رعایا کے ماہدولت پر وہی حقوق و فرائض ہیں جو ماہدولت کی سب دوسری رعایا کے ہیں۔ اور یہ اقرار و فرائض خدائے عزوجل کی برکت سے ماہدولت نہایت دیانت اور ایمانداری کے ساتھ پورے کریں گے"

"دین عیسوی کی صداقت پر پورا پورا بھروسہ اور اعتقاد رکھنے اور دینی تسلی اور اطمینان کے مرہون منت ہونے کے باوجود ہمیں یہ خیال و حق نہیں ہے کہ اپنے کسی فرد رعایا کو اپنے عقائد منوانے کی کوشش کریں۔ ماہدولت اس اپنی شاہانہ مرضی اور ارادے کا اعلان کرتے ہیں کہ کوئی فرد بشر اپنے ایمان اور مذہبی رسوم ادا کرنے کی بنا پر نہ تو موردِ الطاف و کرم ہو گا اور نہ اس کو کوئی مزاحمت بے جا سے پریشان کر سکے گا بلکہ مساوات اور غیر جانبداری کے ساتھ قانون سب کے حقوق کی حفاظت کرے گا ماہدولت ان سب لوگوں پر جنھیں ہمارے تحت اقتدار دیا گیا ہے

یہ واجب و فرض کرتے ہیں کہ وہ مابدولت کے سخت سے سخت عتاب اور ناخوشی کے ڈر سے مابدولت کے کسی فرد رعایا کے مذہبی عقیدے یا عبادت میں مخل ہونے یا کسی قسم کی مداخلت کرنے سے ہر وقت احتراز کریں"

"اور یہ بھی مابدولت کا ارادہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے مابدولت کی رعایا کے افراد کو خواہ ان کی نسل یا مذہب کچھ ہی کیوں نہو مابدولت کی ملازمت میں بلاقید اور بلاتعصب وطرفداری کے شریک کیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ تعلیم یافتہ لائق اور دیانتدار ہونے کی وجہ سے اپنے فرائض منصبی کماحقہم انجام دینے کے قابل ہوں"

"ویسیوں کو اُن کے آبائی ورثے میں جو اراضی ملی ہے اس کے ساتھ جو خاص دل بستگی ہے اس کا مابدولت بھی خاص لحاظ کرتے ہیں اور مابدولت کی خواہش یہی ہے کہ ایک واجبی مطالبہ سرکار کے ساتھ ساتھ ان کے جملہ حقوق متعلقہ اراضی ہر طرح محفوظ ہو جائیں اور مابدولت کی مرضی اور ارادہ یہی ہے کہ قانون مرتب کرنے اور اس پر عمل کرنے میں قدیم حقوق اور رسم و رواج ملک کا واجبی لحاظ کیا جائے"

"مابدولت کو ان خرابیوں اور مصیبتوں پر سخت افسوس ہوتا ہے جو ان خود غرض اور خود نما اشخاص کے افعال سے ہندوستان پر نازل ہوئیں جنھوں نے غلط خبریں پھیلا کر اپنے ہم وطن لوگوں کو دھوکہ دیا اور بغاوت پر یوں آمادہ کردیا۔ میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کے بعد اس بغاوت کو فرد کرنے میں مابدولت کی طاقت کا اظہار ہو چکا ہے۔ اب مابدولت ان لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرکے جو اس طرح رستہ بھٹک گئے تھے مگر اب اپنے فرائض کے سیدھے رستے پر واپس آنے کے خواہشمند ہیں اپنا عفو و کرم بھی بتانا چاہتے ہیں"

"اس وقت تک ایک صوبے میں تو اور زیادہ خون ریزی مسدود کر دینے اور مابدولت کی ہندوستانی قلمرو میں عجلت سے امن قائم کرنے کے لئے مابدولت کے وائسرائے اور گورنر جنرل نے چند خاص شرائط پر ان میں سے اکثر لوگوں کی خطائیں معاف کرنے کا وعدہ کیا ہے جو مابدولت کی حکومت کے خلاف گزشتہ ناگوار ہنگامے میں احکام و قانون کی خلاف ورزی کے قصوروار تھے اور ان لوگوں کے

لیے سزا کا اعلان کر دیا ہے جن کے جرائم ناقابل معافی تھے۔ مابدولت کے وائسرائے اور گورنر جنرل کے افعال مذکور کو مابدولت بہ نظر پسندیدگی دیکھتے ہیں اور ان کی توثیق کرتے ہیں اور اب مزید حسب ذیل امور کا اعلان کرتے ہیں کہ:۔

"مابدولت کے مراحم خسروانہ اور عفو شاہانہ سب قصوروار اور خطاکار اشخاص کے شامل حال رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر رعایائے برطانیہ کے قتل میں براہ راست حصہ لینے کا الزام ثابت ہو چکا ہے یا ہو گا۔ کیونکہ ان کے حال پر عفو و کرم کرنا مقتضائے انصاف نہیں "۔

"ان لوگوں کو جنھوں نے دیدہ و دانستہ قاتلوں کو برضا و رغبت اپنے پاس پناہ دی تھی یا خود اس بغاوت میں بہ حیثیت اغوا کنندہ یا سرخیل با عیان حصہ لیا تھا صرف اپنی جان کی امان ملے گی لیکن ایسے اشخاص کے لیے مناسب سزا تجویز کرنے میں ان حالات کا بھی پورا پورا لحاظ کیا جائے گا جن کے زیر اثر یہ لوگ سرکار کی اطاعت سے منحرف ہو گئے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ بہت کچھ مراعات روا رکھی جائیں گی جن کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ مفسدہ پرداز اور شفی اشخاص کی جھوٹی خبریں پھیلانے سے انھوں نے ان خبروں کو باور کر لیا تھا اور اسی لیے وہ مرتکب جرائم ہوئے تھے"۔

"دوسرے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے مابدولت اس اعلان کے ذریعہ سے ان تمام خطاؤں پر جو ہمارے۔ ہمارے تاج و تخت اور شان و شکوہ کے خلاف ان سے سرزد ہوئے تھے ایسی غیر مشروط معافی اور جاں بخشی کرنے کا وعدہ کرتے ہیں جس سے ان کی خطائیں نسیاً منسیاً ہو جائیں بشرطیکہ وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو کر اپنے سابقہ پرامن مشاغل میں پھر سے مصروف ہو جائیں"۔

"یہ مابدولت کا ارادۂ شاہانہ ہے کہ معافی اور جاں بخشی کے یہ سب مراعات ان تمام لوگوں کو عطا کیے جائیں جو آیندہ جنوری کی پہلی تک ان سب شرائط کو قبول کر لیں"۔

"جب پروردگار کی برکت سے اندرون ملک امن و امان از سر نو قائم ہو جائے گا

تو ملک معظم کی سچی خواہش یہی ہے کہ ہندوستان کی پُرامن حرفت کو اُبھارا جائے۔ ترقی ورفاہ عام کے کاموں کو فروغ پر پہنچایا جائے اور اس نہج پر حکومت کی جائے کہ وہاں کے تمام باشندوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ ان کی خوش حالی ہماری قوت بازو ہے۔ ان کی قناعت ہماری معاون ومددگار اور ان کا شکرو احسان شناسی ہماری جزا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ جس کو سب عظمت وقوت سزاوار ہے ایسا کرے کہ ہمیں اور ہمارے زیر دست ارباب اقتدار کو رفاہ عام اور رعایا کی فلاح وبہبود کی ان سب تمناؤں کو برلانے کی توفیق عطا فرمائے۔"

دوسری کتاب

(۱)

(عہد ملکۂ وکٹوریہ)

سنہ ۱۸۵۸ء تا سنہ ۱۸۷۶ء

پہلا باب

کیننگ ۔ الگن اور لارنس

جنگ کریمیا کے بعد امن تخفیف مصارف اور اصلاح کا دور شروع ہو گیا اگرچہ لارڈ پامرسٹن ان سب وزرائے خارجہ میں جو آجتک گزرے ہیں کبھی نچلا بیٹھنے والا نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن جب قوم کی قوم امن پسند ہو گئی تو بہ حیثیت وزیر اعظم اس کو بھی مجبوراً امن پسند بننا پڑا۔ تاریخ عالم میں یکے بعد دیگرے اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے۔ پروشیا نے ڈنمارک کے متعدد صوبے فتح کر لئے تھے اور ہر طرح سے توسیع عملداری کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ روس نے مشرق کی طرف فوجیں بھیجنے کی ٹھان لی تھی۔ لارڈ پامرسٹن چپ چاپ سب کچھ دیکھتا رہا اور آنکھ تک نہیں جھپکائی۔ اگرچہ اقوام یورپ کو بہت بڑے عروج پر یوں پہنچتا دیکھ کر رشک و حسد کی آگ اس کے سینے میں شعلہ زن ضرور تھی مگر ان میں مداخلت کرنے کی اس کو ہمت نہیں ہوتی تھی اور ۱۸۶۵ء میں جب کہ اس کے ملک میں امن قائم تھا اس نے وفات پائی۔ انگلستان میں اس وقت ملکی اصلاحوں کا دور دورہ تھا مسٹر گلیڈسٹن وزیر

مال وقت نے ایسی بڑی بڑی مالی اصلاحیں کی تھیں کہ رفتہ رفتہ تجارت کے اوپر سے سب قیود اٹھا دیئے گئے۔ مسٹر کابڈن نے ۱۸۵۹ء میں فرانس کے ساتھ اپنے تجارتی معاہدے کی تکمیل کی۔ ۱۸۶۰ء میں کاغذ کا محصول اٹھا دیا گیا۔ دوسرے محصولات بھی موقوف کر دیئے گئے اور اس کے باوجود توفیر تجارت کے ساتھ ساتھ سرکاری محاصل میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا گیا۔

لارڈ پامرسٹن کی وفات کے بعد پارلیمنٹ میں "مسودۂ قانون اصلاح" پیش کیا گیا جو نامنظور ہوا۔ لیکن خود قوم ایسے قانون کا مطالبہ کر رہی تھی اس لئے ایک اور "مسودۂ قانون اصلاح" جس کو مسٹر ڈزریلی نے پیش کیا تھا منظور ہو گیا۔ لارڈ پامرسٹن کے بجائے ۱۸۶۸ء میں مسٹر گلیڈسٹن وزیر اعظم ہوا اور اس کے اس پہلے نظم ونسق میں کئی نمایاں اصلاحیں ہوئیں۔ کلیسائے آئرلینڈ کی سرکاری امداد موقوف کر دی گئی۔ پہلا "قانون اراضی آئرلینڈ" نافذ ہوا فوج میں بھی اصلاح کی گئی۔ "قانون قرعہ اندازی" بھی نافذ کیا گیا۔ عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔

تاج برطانیہ کے نظم ونسق کے ابتدائی اٹھارہ سال تک تاریخ ہندوستان میں بھی اسی پر امن ترقی کا عکس نظر آتا ہے لارڈ کیننگ ہندوستان کا پہلا وائسرائے مامور ہوا۔ کیننگ کے "عفو وکرم" پر جو لوگ حد درجہ معترض تھے اور جنھوں نے اس کی بازطلبی کے لئے درخواستیں بھی دی تھیں ان میں بمشکل چند ہی ایسے تھے جنھیں یہ معلوم تھا کہ اس نے کتنے معرکے کا کام انجام دیا اور کیسی آزمائش سے گزرا تھا۔ غدر کے تاریک زمانہ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس خاموش ان تھک کارکن نے دن کا بہت بڑا حصہ اور رات رات بھر کام کرتے گزار دی ہے۔ موسم سرما میں ایک دن آدھی رات سے دوپہر تک وہ ناشتہ کئے بغیر بلا وقفہ اور ستائے بغیر کام کرتا رہا اس کے بعد مضمحل ہو کر پڑ گیا کیونکہ اتنی دیر تک مسلسل کام کرتے رہنے سے دماغ ناکارہ سا بنجاتا ہے اور اکیلا کیننگ ہی ایسا نہ تھا جس پر کام کا اتنا بوجھ تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کی تشویش اور تردد میں شریک تھی اور اکثر اس کے ساتھ عرق ریزی کرتی رہتی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگتی اور راز کے ان تمام خطوط و مراسلات کی نقل کرتی رہتی تھی جنکو معمولی

سرکاری ذرائع سے نہیں بھیجا جاتا تھا۔ جیسا ان دونوں نے یہ بار گراں اپنے سر لیا تھا ویسے نمایاں کامیابی بھی انھوں نے حاصل کی۔

آخر کار غدر ختم ہوا۔ یکم نومبر ۱۸۵۹ء میں ایک بڑا دربار الہ آباد میں منعقد کیا گیا۔ جس میں لارڈ کیننگ نے اعلان شاہی حاضرین کو پڑھ کر سنایا۔ اس وقت تک ہندوستان میں جتنے دربار ہوئے تھے ان میں یہ دربار سب سے بڑا تھا۔ اس میں تزک و احتشام نمایش کی حد تک نہیں پہنچا تھا اور ایسی جھوٹی ٹیپ ٹاپ نہیں دکھائی گئی تھی جس کا کسی پر کچھ اثر ہو۔ ایک اور دربار میں جو کانپور میں منعقد ہوا تھا وائسرائے نے ایک نہایت ہی مبارک اعلان کیا یعنے راجاؤں اور رؤسا کی رسم تبنیت کے خلاف جو قاعدہ سابق میں رائج کیا گیا تھا اور جس کی وجہ سے کئی خاندان ختم ہو چکے تھے وہ منسوخ کر دیا۔ ملکہ کی حکومت نے تبنیت کی قدیم رسم کو جو ہندو والیان ریاست میں زمانۂ دراز سے چلی آئی تھی تسلیم کر لیا۔ یہ سنکر ہندوستان کے ہر والیٔ ریاست اور سردار نے بہ اطمینان سانس لی۔ قوم نے بھی تاج برطانیہ کے اس جدید نظم و نسق پر نعرہائے تحسین بلند کیے۔

اپنے اس بڑے دورے کے اثناء میں لارڈ کیننگ نے شمالی ہند اور پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کا معائنہ کیا اور فروری ۱۸۶۰ء میں پشاور کے سرحدی مقام پر پہنچ گیا۔ واپسی پر اس نے چند روز کے لئے شملے میں قیام کیا اور مئی کی گرمی میں کلکتے واپس آیا۔ مسلسل کام کرتے رہنے سے اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن صحت کا خیال اس کے فرائض کی انجام دہی میں حائل نہ تھا۔ موسم خزاں میں اس نے ایک اور کٹھن دورہ شروع کیا اور جبل پور میں ہو کر سندھیا اور وسط ہند کے دیگر رؤسا سے ملنے کے لئے ایک اور دربار منعقد کیا۔ غدر کے بعد والیان ریاست اور اہل ہند سے ملاقات کرنے کے لئے اس کو ہر جگہ جانا ناگزیر تھا کیونکہ ان سب کو اطمینان دلانا اور ان میں عقیدت اور وفاداری کے جذبات پیدا کر کے شہنشاہی کا استحکام کرنا نہایت ہی ضروری تھا۔

۱۸۶۱ء میں لارڈ کیننگ پر ایک بڑا حادثہ گزرا یعنے شمالی ہند کے دورے سے واپسی پر اس نے اپنی بیوی کو سخت علیل پایا دارجیلنگ سے واپس

آتے ہوئے لیڈی کیننگ ترائی کے بخار میں مبتلا ہوگئی تھی اور اس مہلک مرض سے وہ روز بروز ناتوان ہوتی گئی حتیٰ کہ نومبر میں اس نے انتقال کیا۔ اس حادثۂ جانکاہ سے ایسے انتھک کارگزار شخص کا بھی دل ٹوٹ گیا۔ اس کا خانگی معتمد لکھتا ہے کہ "میں نے جب اس حجرے میں قدم رکھا جہاں نعش رکھی ہوئی تھی تو یہ خوددار اور کم سخن شخص اپنے آنسو پی نہیں سکتا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اس زور سے دبایا جس سے اس کے جذبات کا پتہ چلتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل پر کیا اثر ہوا ہے" مارچ ۱۸۶۲ء میں جبکہ کیننگ لب گور پہنچ چکا تھا اس وقت ہندوستان سے وہ وطن واپس ہوا۔

عصر حاضر کی تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی لارڈ ولیم بنٹنگ کے پرخیر عہد حکمرانی کے علاوہ ایسی بڑی بڑی متعدد اصلاحیں اس قدر مختصر سی مدت میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئیں جیسی لارڈ کیننگ کے عہد حکومت میں ہوئی تھیں اور ان سب میں اہم ترین کام جو اس نے کیا وہ ہندوستان کی زرعی دولت کو فروغ دینا تھا یعنے ایک ایسا انتظام قائم کرنا جس سے خود کاشتکاروں کو ان کی کاشت کا ثمرہ ملے۔ مسئلۂ اراضی ہی دراصل ہر زرعی قوم کی خوش حالی کی جڑ ہے اور لارڈ کیننگ نے اہل ہند کے مفاد میں اس سوال کے حل کرنے کی جو فیاضانہ کوششیں کی تھیں ان کا ذکر کسی آئندہ باب میں آئیگا۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ۱۸۵۹ء کے "قانون بنگالہ" سے اس صوبے کی زرعی آبادی کو وہ تحفظ حقوق حاصل ہوگیا جو اس سے پہلے کبھی ان کو حاصل نہیں ہوا تھا اس سے دس سال بعد جب مسٹر گلیڈسٹن نے "قانون اراضی آئرلینڈ" مرتب کیا تو اس وقت اسی قانون کے شرائط اس کے پیش نظر تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر لارڈ کیننگ نے یہ کیا کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں رعایا کو زحمت دہ تجدید بندوبست اور روز افزوں مطالبات سرکاری سے محفوظ رکھنے کی ہر طرح کوشش کی۔ اگر اس کی تجویز پر عمل کیا جاتا تو ہندوستان میں آئندہ قحط کم پڑتے مگر ایسا نہیں کیا گیا چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر ربع حصے میں قحط پر قحط پڑے اور یہ صورت حال تاریخ ہند کی ایک نہایت غمناک خصوصیت سی ہوگئی ہے۔

اعلیٰ تعلیم پر بھی اس وائسرائے نے خاص توجہ مبذول کی تھی ۱۸۵۷ء میں مدراس، بمبئی اور کلکتے میں جامعۂ لندن کے نمونے پر جامعات قائم کیے گئے تھے۔ مغربی تعلیم کا روح پرور اثر آبادی کے ایک وسیع حلقے میں پھیلا ہوا تھا۔ بنگالے کے ممتاز ترین اہل قلم مثلاً ایسور چندر ودیا ساگر اور مدھو سودن دتا اور بنکم چندر چٹرجی ۱۸۶۰ء کے دور کی ابتدا ہی میں مشہور آفاق ہو گئے تھے۔ لارڈ ولیم بنٹنک کے زمانے سے اس وقت تک اس درجہ بلند خیالی اور اعلیٰ حوصلگی لوگوں میں کبھی نمایاں ہی نہیں ہوئی تھی جیسی ملکۂ وکٹوریہ کے عہد حکومت کی ابتدا میں اور اس کے پہلے وائسراؤں کی زیر پناہ ہوئی تھی۔

وضع قانون میں بھی لارڈ کیننگ کا نظم و نسق زمانۂ مابعد سے بالکل علیحدہ ہے قانون تعزیرات ہند جس کا مسودہ مکالے نے پہلے ماموریۂ قوانین کے زمانے میں (۱۸۳۷ء) مرتب کیا تھا ۱۸۶۰ء میں منظور و نافذ ہوا۔ ضابطۂ دیوانی اور ضابطۂ فوجداری بھی نافذ کیے گئے اور ایک جدید قانون کی رو سے کوتوالی کی تنظیم بھی عمل میں آئی۔

گورنر جنرل کی کونسل جو ۱۸۶۱ء کے قانون کے تحت جدید طرز پر قائم ہوئی تھی پانچ ارکان پر مشتمل تھی۔ خود لارڈ کیننگ نے ان ارکان میں کام تقسیم اور ہر ایک کو ایک علیحدہ محکمہ تفویض کر دیا تھا۔ اس طرح یہ کونسل دراصل ایک کابینہ بن گئی تھی جس کا صدر گورنر جنرل تھا۔ ہر رکن اپنے اپنے محکمے کے معمولی مسائل کا خود تصفیہ کر دیتا تھا اور صرف اہم معاملات گورنر جنرل کے ملاحظہ میں پیش کرتا تھا۔ اور گورنر جنرل اور رکن میں کسی مسئلے میں اختلاف رائے ہوتا تھا تو پھر ایسا مسئلہ بحث کے لیے کونسل میں پیش ہوتا تھا۔ نظم و نسق کا یہ نظام لارڈ کیننگ کی ایجاد ہے اور آج تک بھی یہی برقرار ہے۔ اس میں صرف ایک ہی نقص تھا جس کو اب دور کر دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ شہنشاہی کے نظم و نسق میں رائے عامہ کا کوئی نمایندہ شریک نہ تھا۔

عدالتی نظم و نسق کی بھی جدید تنظیم ہوئی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں کمپنی کی صدر عدالت اور شاہی عدالت کے انضمام کے بعد مدراس بمبئی اور کلکتے میں ایک ایک عدالت عالیہ قائم ہوئی تھی۔ سر بارنس پی کاک ایک ممتاز قانون داں کلکتے کی عدالت عالیہ کا

میر مجلس مقرر ہوا تھا۔ راما پرساد رائے خلف راجہ رام موہن رائے پہلا ہندوستانی تھا جو کلکتے کی عدالت عالیہ کا رکن مقرر ہوا تھا لیکن اپنے تقرر کے چند دنوں بعد ہی اس نے انتقال کیا۔ اس کے جانشینوں میں سب سے زیادہ ممتاز دوارکاناتھ متھرا گزرا ہے جس کے صحیح فیصلوں اور بیباکانہ خودمختاری کو ہر شخص نظر تحسین سے دیکھتا تھا۔

فوج میں بھی جدید تنظیم کی گئی تھی ہندوستان میں کل ۷۰۰۰۰ انگریز سپاہی اور ۱۳۵۰۰۰ دیسی سپاہی تھے۔ اس کے بعد سے اس کثیر فوج میں کثیر اضافہ ہوا اور ایشیا اور افریقہ میں برطانیۂ عظمیٰ کی شہنشاہی ضرورتوں کے لئے امدادی فوج کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ مشکل مسئلہ جو لارڈ کیننگ کے درپیش تھا وہ مالیات کا مسئلہ تھا۔ برطانوی حکومت نے غدر کے تمام معرکوں کے مصارف کا بار ہندوستان کے مالیات پر ڈالنے کا تصفیہ کر دیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے قرض میں چار کروڑ پونڈ سے زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس قرض کے سالانہ سود کی رقم کثیر ہوئی تھی اور ہندوستان کے محصول ادا کرنے والوں سے اس مطالبہ کی تکمیل مطلوب تھی۔ جیمس ولسن کو جو فن معاشیات کا ایک اچھا ماہر اور کچھ مدت تک انگلستان کے خزانۂ عامرہ کا معتمد مال تھا گورنر جنرل کی کونسل کا پہلا رکن مال مقرر کر کے ہندوستان بھیجا گیا اس نے پہلی دفعہ سرکاری زر کاغذی رائج کیا اور روزافزوں مصارف کی تکمیل کے لئے لوگوں پر محصول اجازت نامہ اور محصول آمدنی لگا دیا۔

ہندوستان میں لارڈ کیننگ کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ انگلستان اور ہندوستان میں رائے عامہ کے نقطۂ نظر سے پہلا سا بغض و حسد باقی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ انگریز بھی اس پہلے اور سب سے بڑے وائسرائے کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم کرنے لگے تھے۔ لارڈ کیننگ کی خدمت میں جو الوداعی سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا اس میں تحریر تھا کہ "اس مغربی سرزمین میں اگر انصاف اور انسانیت کبھی قابل اعزاز و احترام سمجھے جائینگے تو آپ کو وہاں کوئی ممتاز خدمت دینے کے سوا چارہ نہ ہوگا" لیکن لارڈ کیننگ کی قسمت میں اعلیٰ اعزاز لکھا نہ تھا۔ جون ۱۸۶۲ء میں

اپنی عمر کے پچاسویں سال اس نے وفات پائی۔ وسٹ منسٹر کی خانقاہ میں اس کے نامور باپ کی قبر کے نزدیک اس کی تدفین ہوئی۔ انگلستان کے نامور لوگوں کی طویل فہرست میں بہت سے نام ایسے نہیں نکلیں گے جو جورج کیننگ وزیر اعظم اور چارلس کیننگ ہندوستان کے پہلے وائسرائے کے نام نامی سے زیادہ روشن ہوں۔

لارڈ الگن مارچ ۱۸۶۲ء میں ہندوستان آیا اور لارڈ کیننگ کے جانشین کی حیثیت سے آپ کو اس کا ہم پلہ ثابت کیا۔ اس نے بھی کیننگ کی طرح صلح پسندی اختیار کی اور اہل ہند کے ساتھ بڑی ہمدردی دکھائی۔ انگریز لوگ اس کے باپ سے اس لئے زیادہ واقف ہیں کہ اس نے سنگ مرمر کے وہ انمول بت ایتھنز سے خرید لئے تھے جو اسی کے نام سے اب مشہور ہیں اس مشہور باپ کا بیٹا لارڈ کیننگ کا ہم عمر اور آکسفرڈ میں اس کا ہم درس رہا تھا۔ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۴ء تک کنیڈا کے گورنر جنرل کی حیثیت سے الگن نے خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج لیکر چین جاتے ہوئے اس نے غدر کی جو خبر سنی تو فوراً اس چین کی مہم سے دست بردار ہوکر انگریزوں کی مدد کے لئے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس کے پانچ سال بعد وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوکر ہندوستان آیا۔ ایک ایسے حکمراں سے جو اپنے کام سے اس قدر واقف اور اہل ہند کا اس درجہ ہمدرد تھا۔ بڑی بڑی توقعات تھیں۔ لیکن ہندوستان آنے کے ایک سال بعد اس نے انتقال کیا اس لئے نظم ونسق ہند پر اپنا نقش جمانے کی اس کو مہلت نہ ملی۔

اس وقت سوال یہ تھا کہ لارڈ الگن کا جانشین کون مقرر کیا جائے۔ ڈلہوزی اور کیننگ دونوں نے نظم ونسق ہند کی محنت شاقہ پر اپنے آپ کو قربان کردیا تھا اور جب وہ مرنے کے قریب ہوئے تو وطن واپس گئے۔ مگر الگن نے تو بمشکل دو سال ہندوستان میں گزارے تھے کہ اس کو پیغام اجل آگیا۔ اسوقت یہ خیال پیدا ہوا کہ جن لوگوں کے قویٰ ہندوستان میں ایک عمر گزارنے سے موسمی تغیرات کو برداشت کرنے کے عادی ہوچکے ہیں وہی ہندوستان میں رہ کر

کام کرنے کے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے سر جان لارنس مستحق ترین شخص تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کو امیر کا خطاب نہ تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ سر جان شور کے سوا کوئی ہندوستان کی ملازمت دیوانی کا رکن مستقل طور پر گورنر جنرل کبھی نہیں ہوا تھا لیکن حالات ایسے غیر معمولی پیش تھے کہ مقررہ قاعدے سے ہٹنا ہی پڑا۔

"بہتر حکومت ہند کا قانون" لارڈ ڈاربی کی حکومت نے ۱۸۵۸ء میں منظور کیا تھا اور لارڈ ڈاربی کا بیٹا لارڈ اسٹینلی پہلا وزیر ہند مقرر ہوا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں حکومت "قدامت پسند" کو زوال ہوا اور "جدت پسند" حکومت اس کی قائم مقام ہوئی جس میں سر چارلس وڈ وزیر ہند مقرر ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے زمانے میں سر چارلس وڈ مجلس نظم کا میر مجلس تھا اس لئے اپنے ۱۸۵۴ء کے مشہور مراسلے میں ہندوستان میں تعلیمات کی از سر نو تنظیم کے لئے تجاویز پیش کئے تھے۔ اپنے نئے عہدے کے فرائض کی انجام دہی کے لئے ہندوستانی معاملات کا اس کو خوب تجربہ تھا اور ہمیشہ اس کی رائے صائب ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اہل ہند کے حق میں ہر وقت انصاف کرنے پر دہ تلا ہوا تھا اس کا نائب معتمد لارڈ واگر نے تھا جو بعد کو مارکوئیس رپن سے مخاطب ہوا اور ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔

سر جان لارنس ۱۸۵۹ء میں کونسل ہند کا رکن مقرر ہوا تھا اور لارڈ اسٹینلی اور سر چارلس وڈ کے تحت چار سال سے کام کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں لارڈ الگن کی وفات کے بعد وائسرائے ہند کی خدمت خالی ہوئی انگلستان میں رائے عامہ پنجاب کے اس کار آزمودہ اور جہاں دیدہ شخص کو اس خدمت کے زیادہ سزاوار سمجھتی تھی اور سر چارلس وڈ بھی اس سے اس قدر واقف تھا کہ اس کی رائے بھی یہی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں ۳۰ نومبر کی صبح کو محکمۂ وزیر ہند میں سر چارلس وڈ سر جان لارنس سے اس کے کمرے میں جا کر ملا اور کہا کہ "آپ بہ حیثیت گورنر جنرل ہندوستان بھیجے جائینگے۔ میں ملکہ سے منظوری حاصل کرنے کے لئے اب ونڈزر جا رہا ہوں آپ یہیں میرا انتظار کیجئے۔" اسی شام سر چارلس وڈ ملکہ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد واپس آیا۔

سر جان لارنس جنوری سنہ ۱۸۶۴ء میں کلکتے آیا۔ وہ اہل ہند سے ایسا واقف تھا کہ بہت کم انگریز تھے اور خوش نصیبی سے اس کو مشیر بھی بہت اچھے ملے تھے۔ ہنری سمنر مین جو اپنے وقت کا غالباً سب سے بڑا مقنن تھا اس کا رکن قانونی تھا۔ سر چارلس ٹریولین کا سا تجربہ کار شخص جو تینتیس سال قبل بینٹنک اور میکالے کا رفیق کار رہ چکا تھا اس کا وزیر مال تھا اور رابرٹ نے پیر جو بعد کو لارڈ نے پیر مگڈالہ کے خطاب سے سرفراز ہوا اس کا فوجی مشیر تھا۔

البتہ ایک بے چین زبردست نے اس کو کچھ زحمت میں ڈالا۔ یہ سر بارٹل فریر گورنر بمبئی تھا جو شہنشاہیت کا بڑا طرفدار اور دلدادہ تھا۔ اس نے ایک یادداشت مرتب کی تھی جس میں سر جان لارنس کی سرحدی حکمت عملی پر حملے کئے تھے اور لارڈ الگن یا اس کے نامعلوم قائم مقام کے ملاحظے میں اس کاغذ کو پیش کرنے کا فریر کو خیال تھا۔ اتفاق سے سر جان لارنس ہی لارڈ الگن کا قائم مقام ہوا اور یہ کاغذ اسی کے ہاتھ لگا۔ لارنس نے اپنی خاص مردانہ طرز میں اس مابہ البحث حکمت عملی کے متعلق اپنی صفائی پیش کی۔ جب یہ کاغذ وزیر ہند سر چارلس وڈ کے ملاحظے میں پیش ہوا تو اس نے بجا طور پر یہ کہا کہ پنجاب کی حکمت عملی کے خلاف فریر نے جو شکایتیں کی ہیں ان سے بڑھ کر کوئی بے سروپا اور لغو جلد بازی نہیں ہو سکتی۔ اسراف اور اصلاح کے لمبے چوڑے منصوبے بے سوچے رہنے میں فریر اسی قدر جلد باز تھا جس قدر لارنس محتاط اور کفایت شعار تھا اس لئے نئے وائسرائے کو اپنے جلد باز زبردست کی روک تھام کے لئے بہت کچھ کرنا پڑا۔

اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ء میں ایک بڑا دربار لاہور میں آراستہ کیا گیا۔ لارنس نے چھ سو والیانِ ریاست اور سرداروں کو ان کی اپنی زبان میں مخاطب کیا اور یہ وہ کام تھا جو اس کے قبل یا بعد کا کوئی گورنر جنرل نہیں کر سکتا تھا۔ بھوٹان سے چند روز لڑائی رہی جس کے ختم پر دوآر کا انگریزوں نے اس شرط پر الحاق کر لیا کہ اس کے نصف محاصل بھوٹان کی ریاست کو ادا کئے جائینگے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں ایک شدید قحط اڑیسے میں پڑا۔ قحط زدہ لوگوں کی امداد معقول طریقے پر نہ ہو سکی اس لئے جانوں کا بہت نقصان ہوا۔ مسئلہ اراضی حکومت کے مسلسل پیش نظر رہتا تھا لارڈ کیننگ

لئے بنگالی کاشتکاروں کے حقوق اراضی محفوظ کر دیے تھے۔ لارنس نے بھی یہی مفید حکمت عملی پنجاب اور اودھ میں اختیار کی لارنس بھی لارڈ کیننگ کی طرح اس بارے میں بالکل متفق تھا کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں اراضی پر مطالبۂ سرکار دوامی مشخص ہو جانا چاہیئے اور یہی اس نے سفارش بھی کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ متوسط طبقے کو تقویت اور قوم کی زرعی دولت کو ترقی دیجائے کیونکہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ قوم کی فلاح و بہبود کا حکمرانوں کو سب سے پہلے خیال آتا تھا۔

سر جان لارنس نے اپنے نظم و نسق کی ابتداء میں فوجی مصارف جو ۱۳۱۸۲۰۰۰ پونڈ ہوتے تھے، گھٹا کر اپنے نظم و نسق کے ختم تک ۱۲۹۹۰۰۰۰ پونڈ کر دئے تھے۔ باایں ہمہ محاصل میں ہر سال کمی واقع ہو رہی تھی چنانچہ اس کی پنج سالہ حکومت میں جملہ کمی تقریباً ۳۷½ لاکھ پونڈ ہوئی تھی۔ رعایا پر جو محصولات تھے وہ انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ اگر تجارت پر محصول لگایا جائے تو برطانوی تجار خاموش نہیں بیٹھے تھے بلکہ سخت اعتراض کرتے تھے اور حکومت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۸۶۷ء میں سر جان لارنس نے وزیر ہند کو لکھا تھا کہ "اگر محصول اجازت نامہ نامنظور ہو گیا تو مجھ کو یقین ہے کہ وہ تمام محصولات جو غیر سرکاری یورپی جماعت کو متاثر کرنے والے ہیں اس کے بعد ناقابل عمل ہو جائینگے جہاں تک اُن کی آواز کی رسائی ہے اور ان کی شنوائی ہو گی وہاں تک یہ یورپی لوگ کسی قسم کے محصول کو پسند نہیں کرینگے کیونکہ ان کی خواہش ہی یہ ہے کہ تمام محصولات دیسیوں ہی کے بارگردن رہیں۔"

سر جان لارنس نے وزیر ہند کی کونسل کے ایک رکن سر ارسکن پری کو خانگی طور پر یہ لکھا تھا کہ "ان معاملات میں ایک واجبی طرز عمل اختیار کرنے میں حکومت ہند کو بڑی بڑی مشکلیں درپیش ہوتی ہیں۔ اگر دیسیوں کی مدد کرنے کے لیئے کچھ کہا جاتا ہے یا کچھ کرنے کی کوشش کیجاتی ہے تو ایک شور مچ جاتا ہے جو سارے انگلستان میں گونجنے لگتا ہے اور ہر جگہ ہمدرد و حمایتی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ میں ایسا پریشان ہو جاتا ہوں کہ مجھ کو کچھ نہیں سوجھتا۔ صرف اصول کی حد تک تو ہر شخص انصاف

واعتدال وغیرہ جیسی خوبیوں کا دلدادہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان اصول پر کاربند ہونے کا موقع آتا ہے جس سے کسی کے اغراض متاثر ہوتے ہیں تو پھر اس شخص کے دل سے پوچھے۔ وہ تو بالکل بدل جاتا ہے"

لارنس نے ہندوستانی قرض میں ایک ناروا اضافے کی زور دار مخالفت کی مگر اس میں کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ برطانیۂ عظمی اور ئلکا تھیوڈورو والی ابی سینا میں ۱۸۶۷ء میں جنگ تھی اور یہ ایک چھوٹی سی لڑائی تھی۔ رابرٹ نے پیر کو جو اسوقت بمبئی کی افواج کا افسر اعلیٰ تھا اس مہم پر بھیجا گیا تھا اور مسٹر ڈزرے لی کے رنگین الفاظ میں سنٹ جورج کا جھنڈا رسیلاش کی پہاڑیوں پر گاڑ دیا گیا لیکن اس کے کثیر مصارف ہوئے اور ان کا بڑا حصہ نہایت ہی خسیس اور ناواجبی طریقے سے اس وقت ہندوستان پر ڈالا گیا جب کہ ہندوستان کی مالی حالت بہت ابتر تھی اور محاصل میں ہر سال کمی واقع ہو رہی تھی۔ سر جان لارنس نے لکھا "میں یہی صحیح سمجھتا ہوں کہ غدر میں جتنے ایسے انگریز سپاہیوں سے کام لیا گیا تھا جو انگلستان سے آئے تھے ان کے تمام مصارف ہندوستان ہی کے محاصل سے ادا کئے گئے تھے۔ مجھ کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء میں ہندوستان سے اس ناواجبی کثیر التعداد سپاہیوں کے مصارف بھی وصول کئے گئے تھے جن کو ہندوستان کی خدمت بجالانے کے نام سے بے وجہ انگلستان کے متعدد مرکزوں پر جمع کیا گیا تھا موجودہ حالت میں ہندوستان کے اغراض ابی سینا کی اس مہم سے وابستہ نہیں ہیں۔ اسی سے میری رائے میں ہندوستان کو اس کے مصارف نہیں ادا کرنا چاہئے"۔ لارنس نے انصاف کرنے کی استدعا کی تھی مگر اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

اب صرف وہ سرحدی حکمت عملی قابل ذکر ہے۔ جو لارنس کے نام کی طرف منسوب ہے۔ اس کے متعلق ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ چند لفظوں میں ہم کہہ دیں گے۔ ۱۸۶۶ء میں سر چارلس وڈ وزیر ہند نہیں رہا تھا۔ خرابی صحت کی بنا پر اپنی خدمت سے مستعفی ہونے کے بعد لارڈ ہیلیفکس کے خطاب کے ساتھ وہ دارالامراء کا رکن ہو گیا تھا۔ لارڈ دے گرے جو بعد کو مارکوئس رپن ہوا فروری ۱۸۶۶ء میں وزیر ہند مقرر ہوا لیکن چند مہینوں کے بعد حکومت جدت پسند کو زوال ہوا۔ اور جولائی ۱۸۶۶ء

میں لارڈ کرین بورن جو بعد کو مارکوئیس سالسبری ہوا وزیر ہند مقرر ہوا۔ یہ بھی تھوڑی مدت کے لیے اس خدمت پر رہا اور مارچ ۱۸۶۷ء میں سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ اس کا قائم مقام مقرر ہوا۔ جب حکومت جدت پسند پھر قائم ہوئی تو نارتھ کوٹ کے بجائے ڈیوک آرگئیل ۱۸۶۸ء میں وزیر ہند ہوا۔

اس زمانے کا مقتضا ہی یہی تھا کہ وزرائے ہند مثلاً سر چارلس وُڈ لارڈ دے گرے۔ لارڈ کرین بورن۔ سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ اور ڈیوک ارگئیل سب کے سب سر جان لارنس سے اس سرحدی حکمت عملی کے بارے میں بالکل متفق الرائے تھے اور سبھوں نے لارنس کے اس عزم بالجزم کو پسند کیا تھا کہ افغانستان کی لا متناہی پہاڑیوں میں نئی سرحد قائم کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ ہندوستان کی مستحکم قدرتی سرحد ہی پر اکتفا کیا جائے۔

لارنس کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کے مغربی حدود کو آگے بڑھانا دراصل ان خطرات کے استقدام کے برابر تھا جن سے ہم مسلمہ طور پر خائف تھے۔ یعنی ایک ناقابل عبور دریا اور دیوار کوہ جس سرحد پر حائل ہوں اس سرحد کو چھوڑ کر ایک ایسی جدید سرحد کی خاطر جو ہر جگہ تھی اور کہیں بھی نہ تھی آگے قدم بڑھانا نادانی تھی۔ اس سے جنگ کے وقت غنیم کی آبادی ہمیں گھیرے ہوئے رہے گی اور ہم اپنے مرکز سے بہت دور پڑ جائینگے۔ اس کے علاوہ افغانیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ان کے دوست بنجاتے کی توقع تھی مگر اس حکمت عملی سے تو وہ ہمارے اور دشمن بنجائینگے اور اس میں ضرور ہندوستان کے لکھو کھا روپیے برباد ہوں گے درانحالیکہ ہندوستان کی آبادی کو اس روپے کی سخت ضرورت تھی کیونکہ وہ ایک طرف تو محصول وصول کرنے والوں سے اور دوسری طرف فاقہ کشی سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے سخت نالاں تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں دوست محمد کی وفات کے بعد جب تخت افغانستان کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہوئی تو لارنس نے افغانی قضئے کے تصفیے تک اپنی حکمت عملی سے جس کو کسی نے "استادانہ بے کاری" کہا تھا سر مو تجاوز نہ کیا۔ ۱۸۶۸ء میں جب دوست محمد کے فرزند شیر علی نے اپنے باپ کا تخت و تاج حاصل کرلیا تو اس وقت سر جان لارنس

لے حکومت انگلستان کی منظوری سے اس کو افغانستان کا فی الواقع حکمراں تسلیم کرلیا۔

اگرچہ سرجان لارنس کی یہ حکمت عملی دانشمندانہ غیر تغیر پذیر اور کامیاب تو تھی۔ لیکن یہ اعتراض سے نہیں بچی سر بارٹل فریر جس نے لارنس کی پنجاب کی حکمت عملی پر سنہ ۱۸۶۳ء میں حملہ کیا تھا اس وقت کونسل ہند کا رکن تھا۔ وہ سرحد کو آگے بڑھانے کا حامی تھا اور اس کو کونسل ہند کے ایک اور رکن سر ہنری راالنسن میں رفیق کار مل گیا۔ راالنسن نے اپنی مشہور یادداشت میں جس میں "وسط ایشیا میں روس کی پیش قدمی کو روکنے اور افغانستان و ایران میں انگلستان کے اثر و اقتدار کو تقویت دینے کی" تدبیریں درج تھیں اس سوال کو پھر اٹھایا مگر تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ سرحد کو آگے بڑھانے کے حامیوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے افغانستان اور ایران میں انگلستان کے اثر و اقتدار کو تقویت دینے کے مصارف خود انگلستان سے ادا ہونے کی تجویز بھی کبھی پیش کی ہو۔ اگر ایسی تجویز پیش ہوتی تو برطانوی محصول دینے والے اس سے بخوبی واقف رہتے کہ اس بارے میں ان کو کیا کرنا چاہیے۔ سرحد کو آگے بڑھانے کے حامیوں کے تمام تجاویز کا انحصار اسی مفروضے پر تھا کہ اہل ہند اس کے مصارف ادا کرینگے۔

سر ہنری راالنسن کی یادداشت سرجان لارنس کے ملاحظے میں پیش ہوئی۔ لارنس نے راالنسن کو وہی جواب دیا جو پانچ سال پہلے اس نے بارٹل فریر کو دیا تھا۔ متعدد یادداشتوں کے ساتھ جو مراسلہ اس موقع پر بھیجا گیا اس میں لارنس کی حکمت عملی کی ایسی صاف و صریح توضیح کردی گئی ہے کہ ابدالآباد تک پھر کسی توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

"کسی اعلیٰ انگریز عہدہ دار کے توسط سے خواہ اس کے ہمراہ امدادی فوج بھیجی جائے یا نہ بھیجی جائے یا ہماری سرحد سے باہر افغانستان کے کسی فوجی مقام یا خطے پر دوستانہ یا جابرانہ قبضہ کرکے افغانستان کے معاملات میں عملی مداخلت کرلینے پر اس وجہ سے ہمیں اعتراض ہے کہ موجودہ حالات میں اس تجویز سے حملے یا مدافعت غنیم کے لیے ہماری طاقت و اقتدار کو ذرا بھی تقویت

پہنچنے کے بجائے اُلٹے ہم سے افغانیوں کے دلوں میں کھٹک طیش اور نفرت پیدا ہو جائیگی۔ اگر روس ہندوستان پر واقعی حملہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس حملے میں جو مشکلات پیش آئینگے ان میں خود ہمارا کسی طرح کی تخفیف کرنا ہمارے خیال میں نہایت نامناسب اور غیر دانشمندانہ بات ہے اور اگر ہم اپنی سرحد چھوڑ کر ایک دشوار گزار ملک میں جہاں کی آبادی ممکن ہے ہماری دشمن ہی ہو روس سے آدھا رستہ طے کر کے مقابلہ کریں تو ضرور یہی ہوگا کہ روس کے مشکلات میں اس حد تک کمی ہو جائیگی۔ ایسی حرکت وقوع میں آنے کے بعد اس کے مصارف کی انتہا ہماری فہم سے باہر ہے اور ہم ہندوستان کی رعایا پر مزید محصولات عاید کرنے کی اس طرح کی ضرورت پر اس لیے معترض ہیں کہ وہ اس طرح کا بار ان تجاویز کے لئے بھی جن کو وہ خوب سمجھتی ہے اور بہت اچھی طرح سمجھتی ہے اپنے آپ پر لینا نہیں چاہتی۔ اور ہمارے خیال میں ہمارا اور ان سب لوگوں کا دلی مقصد جن کو ہندوستان سے دلچسپی ہے اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ سرحد پر ہمارا انداز اور طرز یہ رہے جیسے ہم استقلال کے ساتھ تیغ بہ کف کھڑے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان عملی اور صحیح مقاصد کے حصول پر جن پر ہم ایک موثر طریقے پر فوری نگرانی کر سکتے ہیں اپنی ساری توجہ اور دل کھول کر رقم صرف کرنے سے ہمیں کبھی دریغ نہ کرنا چاہیئے"۔

"اگر کوئی پردیسی طاقت مثلاً روس کسی وقت باہر سے ہندوستان پر واقعی حملہ کرنے کا خیال کرے یا جو اس سے زیادہ اغلب ہے اندرون ملک بے چینی اور تاراج پھیلانے والے عناصر کو اُکسائے تو ہماری رائے میں ہماری صحیح حکمت عملی جو ہماری قوی ترین ضامن ہوگی یہ ہوگی کہ ہم پہلے سے کابل قندھار یا ان کے حائل کسی اور فوجی مقام میں گھر جانے سے احتراز کرتے رہیں۔ ہماری باقاعدہ اور سامان جنگ سے آراستہ و پیراستہ فوج کے ساتھ ہماری عملداری کے اندرون حدود یا خود ہماری سرحد پر غنیم کا لقعادم ہونے دیں اور اپنی فوج پر پورا پورا بھروسہ رکھیں۔ ہماری رعایا میں عقیدت و محبت نہیں تو کم سے کم قناعت ہی پیدا کریں۔ ہماری حکمت عملی سے رفتہ رفتہ بڑے بڑے رؤسا، اور دیسی امرائے ملک میں اراضی کے استحقاق اور قبضے کے متعلق ایک احساس تحفظ قائم رکھیں۔ برطانوی ہند میں وہ مادی ذرائع

بھی تعمیر و قائم کریں جن سے ایک طرف تو رعایا کو آرام پہنچے اور دوسری طرف خود ہماری سیاسی اور فوجی طاقت میں اضافہ ہو۔ مالیات میں کفایت شعاری پیش نظر رکھیں اور ذرائع آمدنی میں استقلال اور اضافے کی صورت پیدا کریں۔ تمام ناگہانی موقعوں سے نبٹنے کے لیے جنکو ہندوستان کا کوئی مدبر نظر انداز نہیں کرسکتا خاموشی کے ساتھ تیاری کرتے رہیں اور اپنے ارادے کی راستی اور صداقت پر بھروسہ رکھنے کے ساتھ ساتھ رعایا کو کسی قسم کی شکایت کا موقع دینے سے احتراز کرتے رہیں ورنہ یہ پردیسی حملہ آوروں کو گویا دعوت دیکر بلا لنے یا بےچین لوگوں کو اُکسا کر ملک میں بغاوت پر آمادہ کرلنے کے برابر ہے۔"

دوسرا باب

میو اور نارتھ برُک

خدمت سے مستعفی ہونے کے بعد لارنس خطاب امارت سے سرفراز ہوا اور ہندوستان میں اس کا جانشین اسی کا ہم پلہ ایک شخص مقرر ہوا۔ لارڈ میو آئرلینڈ کے ایک قدیم رئیس خاندان کا رکن تھا اور اس میں بھی وہی ہمدردی اور فیاضی تھی جو اس کے ہم وطنوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی خوش طبعی اور خوش اخلاقی کا لوہا مخالفین بھی مان لیتے تھے۔ اس میں کام کرنے کا ایسا مادہ تھا کہ نظم و نسق کا کام خوب چلتا تھا اور صلح پسندی کی راہ پر وہ ایسا ثابت قدم تھا کہ اس نے اپنے پیش رو کی حکمت عملی ہی جاری رکھی۔ اس کا وقار اور دبدبہ سب کو مرعوب کر دیتا تھا۔ وہ ہندوستان کے والیان ریاست اور سرداروں میں اس آن بان سے پھرتا تھا جیسے معمولی آدمیوں میں ایک بادشاہ پھرتا ہے۔

سنہ ۱۸۲۲ء میں ڈبلن میں اس کی پیدائش ہوئی سنہ ۱۸۴۷ء میں یہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا اور ہندوستان آنے سے پہلے تین مرتبہ آئرلینڈ کا چیف سکرٹری رہا۔ لارڈ میو کا انتخاب مسٹر ڈزرے لی نے کیا تھا اور سنہ ۱۸۶۸ء کے آخر میں جب حکومت

قدامت پسند کو زوال ہوا تو لوگوں کو شک تھا کہ آیا وزارت جدت پسند بھی جو اس کے بعد آنے والی تھی اس انتخاب کو قائم رکھے گی یا نہیں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مسٹر گلیڈ سٹن نے اس انتخاب کے خلاف اپنے گردہ کے شور مچانے والوں کی ایک نہ سنی اور اس تقرر کی تنسیخ سے صاف انکار کر دیا۔ لارڈ میو کے تین سال ہندوستان میں وائسرائے رہنے تک وزارت جدت پسند دل کھول کر اس کی حمایت کرتی رہی۔

لارڈ میو نے ۱۲ر جنوری ۱۸۶۹ء میں کلکتے آکر ہندوستان کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہ حیثیت وائسرائے ہندوستان میں اس کی کارگزاری کا اندازہ کرنے کے لیے قارئین کو پہلے اس کی "کابینہ" اور ساخت محکموں پر نظر غائر ڈالنا چاہیے۔ قلمدان وزارت خارجہ و تعمیرات عامہ براہ راست خود لارڈ میو کی زیر نگرانی تھا۔ ایک قابل مقنن فٹز جیمز اسٹیفن نامی اس کی کونسل کا رکن قانونی تھا اور محکمۂ وضع قانون کی صدارت بھی کرتا تھا۔ سر رچرڈ ٹمپل جس کو ہندوستان کا مختلف النوع تجربہ تھا اس کا وزیر مال تھا۔ بیر دایلس وزیر داخلہ اور سر جان اسٹریچی وزیر مالگزاری تھا۔ ہر رکن معمولی کام کا خود تصفیہ کرتا تھا اور صرف نہایت اہم معاملات گورنر جنرل کے ملاحظے میں پیش کرتا تھا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ کونسل کا اجلاس ہوتا تھا اور "اس چند سری حکومت" میں شہنشاہی حکمت عملی کے تمام معاملات پر دروازے بند کرکے بحث کیجاتی تھی"۔

اس مختصر مگر نہایت بامعنی جملے سے ہندوستان کے نظم و نسق کی قوت اور کمزوری کا پتا چلتا ہے۔ اس "چند سری حکومت" میں ہندوستان کے قابل ترین انگریز عہدہ دار شامل تھے لیکن تاج برطانیہ کے نصف صدی تک حکومت کرنے کے بعد بھی کبھی کسی ہندوستانی کو اس میں شریک نہیں کیا گیا۔ محکمۂ مالگزاری یا محکمۂ مالیہ یا کوئی اور محکمہ کسی ہندوستانی کو کبھی تفویض نہیں ہوا۔ ہندوستانیوں کو اس کابینہ میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ کابینہ کو صلاح و مشورہ دینے کے لیے قوم کے نمایندوں کی کوئی مجلس شوریٰ قائم نہیں کی گئی۔ اس کابینہ کو رعایا کے احساس اور جذبات سے واقف کرنے کے لیے کوئی دستوری طریقہ ایجاد نہیں کیا گیا۔ بہترین سے بہترین حکومت قابل ترین سے قابل ترین منتظمین مملکت پر مشتمل کیوں نہ ہو ضرور ناکامیاب ثابت ہوگی اگر

اس میں رعایا کو اپنے معاملات کے انتظام سے بالکل خارج کر دیا جائے۔

ہندوستان آنے کے صرف دو مہینے بعد لارڈ میو نے انبالہ کے مشہور دربار میں امیر افغانستان کا خیر مقدم کیا۔ شیر علی کابل کا مستقل حکمراں بن چکا تھا اور وہ ہندوستان اس غرض سے آیا کہ حکومت ہند سے اپنے لئے کچھ مدد معاش معین کرالے۔ لارڈ میو نے حسب وعدہ اس کو..... پونڈ دیئے اور عند الضرورت اس کی حمایت و اعانت کرنے کی امید بھی دلائی۔ لیکن بجا طور پر کسی قسم کی مدد معاش معین کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لارڈ میو نے لکھا تھا کہ "ہم نے صاف طور پر امیر کو آگاہ کر دیا ہے کہ کسی حالت میں بھی ایک انگریز سپاہی اس کی باغی رعایا کو زیر کرنے میں اس کی کمک کے لیئے اس کی سرحد کو عبور نہیں کریگا۔ یہ کہ کسی مقررہ میعاد تک کوئی معینہ امداد یا وظیفہ زر کی شکل میں اس کو کبھی نہیں دیا جائیگا۔ یہ کہ کسی اور صورت سے مدد کرنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کہ کوئی ایسا معاہدہ ہم ہرگز نہیں کر سکتے جس کی رو سے ہر حالت میں اس کو اور اس کی اولاد کو افغانستان کا حکمراں تسلیم کرنا ہم پر لازم آئے۔ لیکن حتیٰ المقدور ہم اس کی اخلاقی حمایت اس طرح کرینگے کہ بالکل کھلے طور پر اس کو ہم تسلیم کریں گے اور سرکاری طریقے پر اس کی کردار کا احترام کرینگے اور اس کے بخت و دولت میں ہمیشہ دلچسپی لیں گے جو ہماری دوست منشی پر زبان حال سے شاہد رہیگا اور اس کے علاوہ جب کبھی ہم مناسب سمجھیں گے زر سے اسلحہ اور گولہ بارود سے اور دیسی کاریگروں کو بھیجکر یا دوسرے طریقوں سے ہم اس کی مدد کرینگے"

یہ لارنس کی "استادانہ بیکاری" کی حکمت عملی کی سختی سے پابندی تھی اور لارڈ میو نے انبالہ کے دربار کے بعد ہی لارڈ لارنس کو جو خط لکھا اس میں اس کا اعتراف بھی کیا۔ "میں نے نہایت سختی سے ان اصول کی پابندی کی کہ ایسے معاہدات ہی نہوں جن کی وجہ سے ہم بعد کو زحمت میں پڑ جائیں بلکہ صرف دوستانہ تپاک اور التفات اور بہ صورت مناسب امداد و اعانت جاری رہے۔ جب آپ نے گزشتہ دسمبر میں شیر علی کو روپیہ اور اسلحہ وغیرہ بھیجے تھے تو میری رائے میں آپ نے ایک ایسی حکمت عملی کا سنگ بنیاد رکھا جو زمانہ مابعد

میں ہمارے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔ میری بھی خواہش اسی حکمت عملی کو قائم رکھنے کی ہے۔"

لیکن لارڈ میو نے اپنے پیش رو کی حکمت عملی کو محض قائم رکھنے سے کچھ بڑھ کر کام کیا۔ ہندوستان کی سرحد پر امن کی مستحکم بنیاد قائم کرنے کے لیے اس نے اس حکمت عملی کو ترقی دی۔ اس کی خاص مابہ الامتیاز حکمت عملی خارجہ یہ تھی کہ سرحد ہند پر خود مختار دوستانہ ریاستوں کا ایک حلقہ بنجائے جنکے اندرونی انتظام مملکت میں کسی قسم کی مداخلت نہو اور برطانوی قلمرو کی زیر نگرانی ان کو لانے کی کوشش نہ کی جائے۔ لارڈ میو نے لکھا تھا کہ "ہم نے بارہا اپنی استعداد کے موافق ہماری سرحدی حکمت عملی کے اساسی اصول مقرر کردئے تھے جن کا چند لفظوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی سرحدی ریاستوں مثلاً قلات۔ افغانستان یارکند۔ نیپال اور برما کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات پیدا کریں اور ان سب کو یہ محسوس کرائیں کہ اگرچہ ہم ایک طاقت اعلیٰ ہیں لیکن ہماری خواہش یہی ہے کہ ہم ان کی قومیت کی حمایت کریں۔ یہ کہ عند الضرورت ممکن ہے ہم زر اور اسلحہ سے اور خاص حالات میں شاید آدمیوں سے بھی ان کی مدد کریں۔ اس طرح ہم انھیں اپنی شہنشاہی کے مورچے بنالیں اور یہ یقین دلائیں کہ ملکوں کو الحاق کرنے کا اب زمانہ نہیں رہا اور اگر وہ کبھی ہماری نوازشات اور امداد کے مستحق اپنے آپ کو ثابت کرنے میں کوشاں رہینگے تو ان کو اس میں فائدہ ہی فائدہ اور نقصان کچھ بھی نہیں۔"

اس صاف وصحیح اور عاقلانہ حکمت عملی کی پابندی میں لارڈ میو نے ڈگلس فارسایتھ کو روسی وزرا سے ملکر تصفیۂ معاملات کرنے کے لیے اکتوبر ۱۸۶۹ء میں سینٹ پیٹرز برگ بھیجا۔ امیر کی قلمرو کی شمالی سرحد دریائے جیحون مقرر کردی۔ لارڈ میو نے شاہ ایران کو بھی اس کی سلطنت اور بلوچستان کے درمیان حدبندی کرنے پر راضی کرلیا اور بلوچستان کی اندرونی حدبندی کے لئے ایک انگریز عہدہ دار خاص طور پر مامور کیا۔ نیپال کے ساتھ اس نے مستحکم دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ شمالی برما میں شاہ برما کے جنگجو خصائل کی روک تھام کی اور اس کے ساتھ

گہرے تجارتی تعلقات قائم کر دئیے۔ ہندوستان کے لیے بڑی خوش نصیبی اسی میں تھی کہ اطراف کی ریاستوں میں لارڈ میو کے جانشین بھی ویسے ہی مستحکم دوستانہ تعلقات ہمیشہ قائم رکھتے جیسے لارڈ میو نے قائم رکھے تھے۔

ہندوستان کے اندرونی انتظام میں بالخصوص مالی معاملات میں لارڈ میو کی کامیابی کچھ ایسی نمایاں نہ تھی۔ سرجان لارنس باوجود شدید کفایت شعاری کے محاصل میں فاضلات نہیں کر سکا تھا۔ مگر لارڈ میو نے تو محصولات میں مزید اضافہ کر دیا ان دونوں کا دراصل کچھ قصور نہ تھا بلکہ سچ پوچھیے تو سب قصور وزرائے برطانیہ ہی کا تھا جنھوں نے محاصل ہند پر وہ تمام بوجھ ڈال دیا تھا جس کا کچھ حصہ انصافاً برطانیۂ عظمیٰ پر بھی پڑنا چاہیے تھا۔

ہندوستان کا سرکاری قرض ۱۸۷۰ء میں دس کروڑ بیس لاکھ پونڈ تھا اور اس کثیر قرض پر کسی حال سود ادا ہونا لازمی تھا۔ لارڈ میو نے ایک فی صدی محصول آمدنی کو ½ ۲ فی صدی اور اس کے بعد ½ ۳ فی صدی کر دیا۔ محاصل میں فاضلات کرنے کی خاطر مدراس اور بمبئی میں محصول نمک میں بھی اضافہ کر دیا۔

لیکن لارڈ میو کے نظم و نسق میں جو مستقل تغیرات عمل میں آئے وہ ہندوستان کے نظام مالیہ میں تھے۔ ایک یہ کہ اس اصول کو صاف طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس پر عمل بھی کیا جاتا تھا کہ کارہائے پیداآور کے لیے قرض لینا چاہیے۔ تاکہ سالانہ محاصل کلیتہً معمولی مصارف کے لیے مختص کر دئیے جائیں۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوں پر بیجا طور پر کثیر رقوم صرف ہونے لگے جیسا خود قارئین آئندہ کسی باب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور اس روز افزوں قرض کی تخفیف کے لیے کوئی ادائی کا کوئی ذخیرہ قائم نہیں کیا گیا۔

دوسرا تغیر لارڈ میو کے "منصوبہ تضعیف مرکزیت" کے نام سے مشہور ہے۔ لارڈ میو کے عہد سے قبل ہندوستان کے مختلف صوبوں کے لیے تقسیم محاصل میں کوئی خاص حصہ علٰحدہ علٰحدہ مقرر نہ تھا اور ہر صوبے کے گورنر کی بھی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے صوبے کے لیے جس قدر ممکن ہو حاصل کر لے۔ جو سب سے زیادہ شور و غل مچاتا تھا اسی کو سب سے زیادہ ملتا تھا۔ چنانچہ سر بارٹل فریئر کو بمبئی میں

نہایت ہی وسیع اور بیش مصارف رفاہ عام کا کام کرنے سے روکنے کے لیے سرجان لارنس کو انتہائی مشکل اٹھانی پڑی تھی۔ ۱۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کے دستور کی رُو سے صوبوں کی حکومتوں کے لئے لارڈ میو نے پانچ سال تک رقم علیحدہ علیحدہ مختص کردی اور گورنروں کو اختیار دیدیا کہ اپنی اپنی رقوم معینہ کے اندر جیسا ان سے بن پڑے اپنے اپنے صوبے کا انتظام کرلیں پنج سالہ میعاد کے ختم پر اضافہ رقم کے لئے پھر بھی چھینا جھپٹی ہوتی تو تھی لیکن پانچ سال میں ایک دفعہ اس طرح ہونا گورنروں کے سالانہ مقابلے سے تو بہتر تھا۔

تیسرا تغیر جو لارڈ میو کے عہد حکومت میں وقوع میں آیا۔ بدنصیبی سے وہ مالیات کے متعلق تھا جس سے صوبے کے محصولات میں جن کو شاہی محاصل سے کوئی واسطہ نہ تھا کثیر اضافہ ہوگیا۔ ۱۸۶۱ء ہی میں لارڈ کیننگ کے وزیر مال نے شاہی محاصل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ ضرورت محسوس کی تھی کہ ہر صوبے کو اپنے اندرون حدود مقامی محصول لگانے کا اختیار دیا جائے۔ ۱۸۶۵ء میں سرجان لارنس کے وزیر مال نے اپنی تقریر موازنہ میں یہ بتایا تھا کہ ۶۵-۱۸۶۴ء میں مقامی محصول کی آمدنی ۲۵ لاکھ پونڈ ہوئی تھی۔ لارڈ میو کے منصوبہ تضعیف مرکزیت سے ان مقامی محصولات میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا۔

تضعیف مرکزیت کے منصوبے میں مختلف صوبوں کے لیے محاصل کا جو حصہ مختص کردیا جاتا تھا وہ اس بنا پر ہر صوبے کی ضرورتوں سے کم مقرر کیا جاتا تھا کہ مقامی محصولات میں اضافہ کرکے اس کمی کو پورا کرلیا جائے۔ خزانۂ شاہی کا بوجھ یوں ہلکا کیا گیا کہ ایک طرف تو محصولات کے مرکزوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور دوسری طرف بہ حیثیت مجموعی خود محصولات میں بھی اضافہ کیا گیا محاصل کے قدیم ذرائع ہی اب تک برقرار رکھے اگر ہر صوبے میں توفیر محاصل کے لئے جدید ابواب زیادہ تر اراضی ہی پر عائد کئے گئے۔ اس منصوبے کو جس کی تکمیل توضیح کسی آئندہ باب میں کی جائیگی لارڈ لارنس نے غور کرنیکے بعد سابق میں رد کردیا تھا۔ مگر لارڈ میو نے بدنصیبی سے اس کو پھر اختیار کیا کہ اس سے اراضی پر جو مطالبہ سرکار تھا اس میں اضافہ ہوگیا اس طرح ۱۸۵۵ء اور ۱۸۶۴ء میں نصف لگان تک مالگزاری کے مطالبے کا جو ایک قاعدہ مقرر کردیا گیا تھا وہ پھر باقی نہ رہا۔

لارڈ میو ایسے گوناگوں کاموں میں منہمک تھا کہ اسی زمانے میں اس انتھک کارگزار شخص کی رگِ زندگی ایک قاتل کی چھری سے منقطع ہو گئی۔ جب وہ جزائر انڈمان دیکھنے گیا جہاں سزا یافتہ بسائے گئے ہیں تو ۸ فروری ۱۸۷۲ء میں ایک قیدی نے اس کے چھری مار دی۔ یہ پورے شباب کے عالم میں تھا اور اس کی قوت اور مردانگی ابھی بہار ہی پر تھی کہ سموم مرگ سے اس کا غنچۂ زیست کملا گیا۔

خوش نصیبی سے اس کا جانشین بھی اسی کی طرح سربرآوردہ اور امن قائم رکھنے کی حکمت عملی کا سچا دلدادہ تھا۔ لارڈ نارتھ برک کی پیدائش ۱۸۲۶ء میں ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو محتاط اور کامیاب تجارت کرتے رہنے کی بنا پر یورپ کے تاجروں میں سربرآوردہ تھا۔ نائب وزیر ہند کی حیثیت سے نارتھ برک کو ہندوستان سے واقفیت تھی۔ ہندوستان کے سرحدی مسئلے پر وہ بھی لارنس اور میو کا اتباع کرتا تھا۔ مالی انتظام میں سر ایولین بیرنگ اس کا رشتے کا ایک بھائی جس نے لارڈ کرومر کی حیثیت سے اب ایسی شہرت پیدا کر لی ہے کہ برطانوی شہنشاہی میں اس کا درجہ کسی سے کم نہیں اس کا مددگار اور مشیر تھا۔

لارڈ نارتھ برک کا عہدِ حکومت اس کے دونوں پیش روؤں کے عہد کی طرح امن کا دور تھا۔ لیکن ہندوستان کے سے ملک کا نظم ونسق مشکلات سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ چنانچہ لارڈ نارتھ برک کو اپنی حکمرانی کے دوسرے ہی سال بنگالے میں شدید قحط کے آثار نمایاں ہوتے دیکھ کر وزیر ہند کو پیش از پیش اطلاع دینی پڑی۔ ۱۸۶۶ء کے قحط اڑیسہ اور ۱۸۶۹ء کے شمالی ہند کے قحط سے جانوں کا جو نقصان عظیم ہوا تھا وہ لوگوں کو اب تک یاد ہے۔ لارڈ نارتھ برک نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ ۱۸۷۴ء میں کسی حال زمانہ گزشتہ کے سے مہلک نتائج کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ متعدد امدادی تدابیر بروقت وسیع پیمانے پر اختیار کی گئیں اور تاریخ ہند میں یہی ایک موقع تھا جب کہ اختیار کردہ تدابیر سے پوری پوری کامیابی ہوئی۔ بنگالے میں چونکہ دوامی بندوبست ہو چکا تھا اور لگان کم تھے تو وہ بمقابل ہندوستان کے کسی اور صوبے کے زیادہ مایہ دار تھا۔ بنگالی بہ نسبت اور جگہ کے باشندوں کے اپنی مدد آپ کر سکتے تھے اس لئے وہاں

جانوں کا اتلاف نہ ہونے پایا۔ قحط کے بعد تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا کہ تھا
کی وجہ سے وہاں ایک بھی جان ضائع نہیں ہوئی۔
گیکوار بڑودہ کی بدانتظامی سے نارتھ برک کو ایک اور مشکل درپیش تھی
بدنظمی کے علاوہ گیکوار پر یہ بھی الزام تھا کہ اس نے انگریزی رزیڈینٹ کو زہر
دینے کی کوشش کی تھی۔ لارڈ نارتھ برک نے از روئے انصاف یہ مقدمہ
چلایا۔ تین[۳] انگریز اور تین والیان ریاست سماعت مقدمہ کے لئے مقرر کئے
گئے اور گیکوار کی طرف سے اس مقدمے میں جوابدہی کرنے کے لیے سارجنٹ
بیلنٹائن انگلستان سے بلایا گیا۔ اس عدالت خاص کے ارکان کی رائے میں
اختلاف ہوا اور سارجنٹ بیلنٹائن اپنے آخری دم تک یہی باور کرتا تھا کہ
گیکوار اس جرم کے اقدام سے بالکل بے گناہ ہے لیکن گیکوار نے اپنے آپ کو
حکمرانی کے ناقابل ثابت کیا تھا۔ اس لئے لارڈ نارتھ برک نے بجائے اس ریاست کا الحاق
کرنے کے کیونکہ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کی رو سے آئندہ الحاق کرنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ گیکوار کو
معزول کر کے اس گدی پر اسی کے خاندان کے ایک لڑکے کو بٹھا دیا۔ ایک پشت کے تجربے سے
بھی اس تدبیر کی دانائی پر کوئی حرف نہیں آتا اور آج بڑودہ کا اپنی دیسی حکومت
کے تحت ہندوستان کی اُن ریاستوں میں شمار ہے جن کا نظم و نسق بہترین مانا
جاتا ہے۔ نوجوان مہاراجہ کی جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی ویسے ویسے اس نے اپنے
آپ کو ملک کا قابل ترین اور شائستہ ترین حکمراں ثابت کر دکھایا۔

ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی بہ حیثیت پرنس آف ویلز ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۶ء
کے درمیانی موسم سرما میں اسی طرح ہندوستان میں تشریف آوری ہوئی جس طرح
پانچ سال قبل ملک معظم کے بھائی ڈیوک آف اڈنبرا کی ہوئی تھی اور عام طور پر اہل ہند
نے شاہی خاندان کے اُن نمایندوں کی آمد پر نہایت خلوص کے ساتھ جوشِ
عقیدت و وفاداری کا اظہار کیا۔

لیکن اب ہندوستان کے مطلع پُرانوار پر ایک لکۂ ابر کی تاریکی پھیل
رہی تھی جو مغرب سے اٹھ رہا تھا۔ کیننگ اور لارنس۔ میو اور نارتھ برک نے
نہایت ہی طاقتور دوستانہ ریاستوں میں رہ کر ہندوستان میں امن قائم رکھنے

اور ایک مفلس و بے مایہ ملک کی مالیات کو سلجھانے کی جو سرگرم کوششیں کی تھیں اُن کی انگلستان میں کچھ قدر نہ ہوئی۔ مشرق میں روس کی روک تھام کا تصور پھر سے برطانوی شہنشاہی کے شیدائیوں کے پیش نظر تھا اور یہ خیال بھی ان کو ہو چلا تھا کہ ان شہنشاہی چالبازیوں کے اخراجات ہندوستان کے محاصل ہی سے ادا کئے جائیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۸۶۳ء میں جب سر بارٹل فریئر بمبئی کا گورنر تھا۔ اس نے "پیش روی کی حکمت عملی" کی تائید کی تھی جس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لئے لارنس کی سرحدی حکمت عملی پر جو حملے کئے تھے وہ کاغذ لارنس کے ہاتھ لگ گیا تھا اور لارنس نے بھی اس کا بہت معقول اور موثر جواب دیا تھا۔ سر ہنری رالنسن نے بھی ۱۸۶۸ء میں دوبارہ یہ سوال اٹھایا تھا مگر لارڈ لارنس نے دوبارہ اس کا جواب دیا تھا لیکن اس وقت انگلستان میں شہنشاہی ردعمل شروع ہو چکا تھا اس لیے سر بارٹل فریئر کو اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے اپنی ۱۸۷۴ء کی یادداشت میں اس مسئلے کو پھر تازہ کیا۔ بار سوم یہ کوشش کامیاب ہوئی کیونکہ اس کے لیے نیک ساعت آچکی تھی۔

جون ۱۸۷۴ء میں سر بارٹل فریئر نے یہ تجویز پیش کی کہ ہرات۔ قندھار اور کابل میں سرکار کی طرف سے ایک وکیل مقرر کرنا چاہیئے اور افغانستان کو ایک طاقتور اور دوستانہ ریاست علیحدہ قائم رکھنے کے بجائے اس ملک میں زیادہ تر برطانوی اثر پھیلا دینا مناسب ہے۔ نومبر ۱۸۷۴ء میں تجربہ کار لارڈ لارنس نے یہ جواب دیا کہ سر بارٹل فریئر نے جس حکمت عملی کی وکالت کی ہے اس سے روس کی پیش قدمی کا انسداد ہونے کے بجائے اس کے لیے اور زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائینگی۔ افغان قبائل بھی انگریزوں کے مخالف بنجائینگے۔ انگریز عہدہ دار جو افغانستان میں متعین رہینگے چوری سے قتل کئے جائینگے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ روز نئی لڑائیاں ہوتی رہیں گی۔ ۱۸۷۴ء ہی میں اسی بڈھے غیب دان شخص پر گویا ان باتوں کا القا ہوا تھا جو اس سے پانچ سال بعد واقعی ظہور میں آئیں۔ لیکن اس کے متنبہ کرنے کے باوجود کسی نے اس پر دھیان نہیں کیا۔ افغانیوں اور سرحد

پنجاب کے متعلق اس کے بے مثال تجربے اور معلومات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ سر بارٹل فریر نے جنوری ۱۸۷۵ء میں لارڈ لارنس کو جواب تحریر کیا لارڈ سالسبری نے کسی زمانے میں "پیش روی" کی تائید کرنے والوں کے خدشات کی ہنسی اڑائی تھی مگر اب اسی نے سر بارٹل فریر کے منصوبے کو قبول کر لیا۔ لارڈ سالسبری ڈیوک آرگیل کے بعد ۱۸۷۴ء میں جب حکومت قدامت پسند قائم ہوئی تھی وزیر ہند مقرر ہوا تھا۔ اس نے نارتھ برک کو لکھا کہ ایک برطانوی وکالت ہرات میں۔ اس کے بعد ایک قندھار میں اور آخر کار ایک کابل میں قایم کرنی چاہیئے۔

لارڈ نارتھ برک لارڈ لارنس کا بالکل ہم خیال تھا لارنس نے فریر کو جو جواب دیا اس کو نارتھ برک پڑھ چکا تھا اور اس بارے میں اپنی اتفاق رائے سے خود لارنس کو آگاہ کر چکا تھا۔

اسی بنا پر جب لارڈ نارتھ برک کو لارڈ سالسبری کا مراسلہ راز فروری ۱۸۷۵ء میں وصول ہوا تو اس نے فوراً بذریعہ تار برقی سالسبری کو اطلاع دی کہ حالات و واقعات کے لحاظ سے ان تجاویز پر عمل کرنا بالکل نامناسب ہے اور جون ۱۸۷۵ء میں اسنے لارڈ سالسبری کے مراسلے کا باضابطہ جواب لکھ بھیجا جس میں بتایا تھا کہ لارڈ کیننگ کے زمانے سے جو حکمت عملی اختیار کی گئی تھی اور جس میں خاصی کامیابی بھی ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ افغانستان کو خوب طاقتور بنایا جائے اور اس کے حکمران پر ایسا قوی برطانوی اثر جمایا جائے کہ پردیسی دست درازیوں سے وہ بالکل محفوظ رہے۔ اس مراسلے پر نارتھ برک کے علاوہ اس کے سب ارکان کونسل مثلاً لارڈ نیپیر مگڈالہ۔ سر ہنری نارمن۔ سر آرتھر ہاب ہاؤس۔ سر ولیم میور۔ ریشلی ایڈن کے دستخط بھی تھے۔

لارڈ سالسبری نے نومبر ۱۸۷۵ء میں اس کا جواب الجواب دیا اور یہ مراسلہ ان تمام تحریرات سے جو برطانوی وزراء کے قلم کی اس وقت تک لکھی ہوئی تھیں کم قابل تعریف ہے۔

"امیر کے ساتھ ہمارے تعلقات اطمینان بخش اصول پر قائم کرنے کیلئے

سب سے پہلے ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ امیر کو اپنے پائے تخت میں ہماری سفارت کا عارضی قیام ہی قبول کر لینے کی ترغیب دینا ضروری ہے یہ ضرور نہیں کہ امیر کی قلمرو میں سفارت کے مستقل قیام سے اسی عارضی قیام کا کیا تعلق ہے علانیہ معلوم ہو۔ بظاہر کسی معمولی سیاسی غرض کے لئے جس کو تلاش کرنا یا ضرورت ہو تو پیدا کرنا آپ کے لئے کچھ مشکل بات نہیں اس سفارت کو قائم کرنا بہت کچھ مفید مطلب ہوگا۔"

لارڈ نارتھ بُرک نے اس حیرت انگیز مراسلے کا جو جواب دیا وہ ایسا ہی زوردار اور موثر تھا جیسا وہ بلند پایہ اور شاندار تھا۔ اس نے لکھا کہ اگر مستقل طور پر سفارت کا افغانستان بھیجنا ہی منظور تھا تو یہ بہتر ہوتا کہ امیر کو اس کے اصل مقصد اور حقیقت سے صاف طور پر آگاہ کر دیا جائے۔ لیکن دراصل اس سفارت کی کچھ ضرورت ہی نہ تھی۔

"ہمیں یقین ہے کہ لارڈ کیننگ۔ لارڈ لارنس اور لارڈ میو نے افغانستان کے بارے میں جو حکمت عملی اختیار کی تھی اگر وزراء صبر کے ساتھ اسی کا اتباع کیا جائے جس کے برقرار رکھنے کی ہم بھی ہر طرح کوشش کرتے رہے ہیں تو اس سے آگے چلکر امیر کے ساتھ ہمارے تعلقات کی ایک اطمینان بخش صورت قائم ہو جانے کی قوی توقع ہے اور موجودہ حالات میں آپ کے مراسلے میں جو ہدایات صادر فرمائے گئے ہیں اُن کی تعمیل کرنے سے ہمیں خدشہ یہ ہے کہ ضرور افغانستان کے امن و اَمان میں بڑا خلل پڑ جائیگا اور یہ برطانوی شہنشاہی ہند کے اغراض کے بھی بالکل منافی ہوگا۔"

جس ڈاک سے لارڈ نارتھ بُرک کا یہ سنجیدہ اور بلند پایہ اعتراض لارڈ سالسبری کو پہنچا اسی ڈاک سے ہندوستان کے عہدۂ جلیلہ سے اس کا استعفا بھی پہنچا۔

لارڈ نارتھ بُرک کا عہد حکومت کیا ختم ہوا کہ امن اور اصلاح کا دور ہی جس کی ابتدا ۱۸۵۸ء سے ہوئی تھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد لارڈ لٹن کی حکمرانی سے ایک مضطرب و بے قرار شہنشاہیت کا دور شروع ہوتا ہے۔

تیسرا باب

شمالی ہند میں اصلاحات اراضی

یوں تو لارڈ کیننگ نے نظم و نسق ہند کے ہر شعبے میں بڑی بڑی اصلاحیں کی تھیں مگر سب سے بڑی اصلاح اس نے وہ کی تھی جس سے ہندوستان کے زرعی اور صاحب زمین طبقات کو فائدہ پہنچا۔ اس کے ۱۸۵۹ء کے "قانون لگان بنگالہ" سے نہ صرف بنگالے کے کاشتکاروں کے سب حقوق محفوظ ہو گئے بلکہ اس کے جانشینوں کو اسی طرح کے "قوانین لگان" ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی نافذ کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اس بات میں کیننگ اور لارنس نے شمالی ہند میں جو اصلاحات اراضی کی تھیں ان کی مختصر کیفیت یہاں پیش کیجاتی ہے۔

بنگالہ

۱۷۹۳ء میں جب لارڈ کارنوالس نے بنگالہ کی مالگزاری کا دوامًا تعین کر دیا تھا تو اس قانون میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ معقول طور پر کاشتکاروں کے

تحفظ حقوق کے لئے حکومت ضروری کارروائی کرنے کی مجاز تھی۔ وقتاً فوقتاً کاشتکاروں کے حالات کی تحقیقات ہوتی رہی لیکن ساٹھ سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی پھر بھی بنگالے کے کاشتکاروں کو وہ تحفظ حقوق حاصل نہیں ہوا تھا جس کا وعدہ کیا گیا تھا یہ کمپنی کے ان عاملوں کی غفلت کی وجہ سے نہ تھا جن کے زیر انتظام بنگالہ تھا بلکہ اس بنا پر تھا کہ خاص طبقات اور عامۃ الناس کے درمیان ایک مناسب قانونی اصول قائم کرنے میں انتہائی مشکل درپیش تھی۔

آخر کار لارڈ کیننگ ہی نے اس مشکل کو حل کیا۔ اس کا "قانون لگان بنگالہ" (قانون نمبر ۱۰ بابتہ ۱۸۵۹ء) بنگالے کے کاشتکاروں کا منشور اعظم منصور ہوتا ہے۔ اس کی رو سے بنگالے کے کاشتکاروں کے تین[۳] مدارج قائم کئے گئے (۱) اُن کاشتکاروں کے جن کی مقبوضہ اراضی پر ۱۷۹۳ء سے لگان کی مقدار میں کبھی کمی و بیشی نہیں ہوئی تھی اس قانون کی رو سے لگان میں ابداً آباد تک کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا تھا (۲) وہ کاشتکار جو بیس سال سے ایک مقررہ لگان پر اپنی زمینوں پر قابض تھے ان کے لئے یہ مفروضۂ قانونی تھا کہ وہ لوگ بھی گویا ۱۷۹۳ء ہی سے یہی لگان ادا کرتے رہے ہیں بجز اس کے کہ یہ مفروضہ خلاف واقعہ ثابت ہو۔ (۳) اور اُن کاشتکاروں کا جن کا اراضی پر بارہ[۱۲] سال کا قبضہ تھا صرف حق قبضہ تسلیم کر لیا گیا تھا مگر اُن کے لگان میں بھی آئندہ اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا بجز ان واجبی اور مختص وجوہ کے جن کو قانون میں درج کر دیا گیا تھا۔

اس قانون سے بنگالے میں ایک انقلاب ہو گیا اور موجودہ زمانے میں بمقابل ہندوستان کے دوسرے انقطاع کے بنگالے کی آبادی زیادہ مایہ دار اور خوش حال اس لئے ہے کہ (۱) زمینداروں پر جو مطالبۂ سرکار تھا اس کی ۱۷۹۳ء میں ایک انتہا مقرر کر دی گئی تھی اور (۲) ٹپہ داروں پر زمینداروں کا جو مطالبہ ہوتا تھا اس کی بھی ایک انتہا مقرر کر دی گئی تھی۔

اودھ

صوبۂ اودھ کی تاریخ بالکل جدا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں جب لارڈ ڈلہوزی نے

اس صوبے کا الحاق کر لیا تو اس وقت زمیندار یعنے تعلقدار اپنی اپنی جاگیروں کے دراصل مالک بنے بیٹھے تھے اور شمالی ہند کے اور مقاموں کے بہ نسبت وہی جماعتوں نے یہاں کم ترقی کی تھی۔

انگریزی سرکار نے اس فرق کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ عہدہ داران بندوبست نے اکثر موقعوں پر تعلقداروں کو علٰحدہ کر کے دیہی مالکان اراضی سے براہ راست بندوبست کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن انھیں مقدمات کا غلبہ کثیر تھا جن میں اس طرح نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ اودھ کے ۲۳۵۴۳ قصبات میں ۱۸۵۶ء میں ۱۳۶۴۰ گاؤں کا بندوبست تو تعلقداروں کے ساتھ کیا گیا اور ۹۹۰۳ گاؤں کا بندوبست دیہی مالکان اراضی کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس نو مقبوضہ صوبے میں قدیم رہنمایان ملت کو اس طرح نظر انداز کر دینا نہ تو انصاف تھا اور نہ دانائی کا فعل تعلقداران اودھ نے یہ محسوس کیا کہ اس سے ان کے حقوق ہی فسخ ہو گئے اور جب سال مابعد میں غدر شروع ہوا تو یہ لوگ باغیوں کے ساتھ ہو گئے۔

ختم جنگ پر لارڈ کیننگ نے اپنے مارچ ۱۸۵۸ء کے اعلان کی رو سے جو اب ایک تاریخی اعلان بن گیا ہے سب زمینیں ضبط کر لیں۔ گورنر جنرل نے صرف چھ ایسے وفادار تعلقداروں کا انتخاب کیا جن کے حقوق کا لحاظ کیا جا سکتا تھا اور "انعام و اعزاز" کا دوسروں کے لئے بھی وعدہ کیا بشرطیکہ ان کے دعاوی پایۂ ثبوت کو پہنچیں۔

"باشندگان اودھ کی اطلاع و آگاہی کے لئے گورنر جنرل اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ مذکورالصدر تعلقداروں کے بہ استثنا تمام اراضی کا حق مالکانہ انگریز سرکار نے ضبط کر لیا ہے اور اپنی مرضی کے موافق جس طریقے پر انگریز سرکار مناسب سمجھے اس حق کو تقسیم یا تفویض کر سکتی ہے۔"

"ان سب تعلقداروں۔ سرداروں اور زمینداروں سے معزز گورنر جنرل وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ سب اپنے ہمراہیوں اور رفقا کے ساتھ فوراً چیف کمشنر اودھ کے سامنے اظہار اطاعت کریں اور اپنے سب اسلحہ اس کو لا دیں اور اس کے احکام بجا لائیں تو ان کی جاں بخشی ہو گی اور عزت و آبرو بچے گی بشرطیکہ کسی انگریز

کے ناروا خون سے ان کے ہاتھ رنگے ہوئے نہوں۔ مزید مراعات حاصل کرنے اور اس معاملے میں کہ آئندہ ان کی حالت کیا ہو گی وہ آپ کو انگریز سرکار کے انصاف و رحم و کرم پر بالکل چھوڑ دیں۔"

لارڈ کیننگ کے سب سے بڑے مدح خواں کے لئے بھی اس بات کا اعتراف کرنا ناگزیر ہے کہ یہ اعلان سراسر غلط تھا۔ بلا امتیاز اس طرح عام قرقی کا حکم دینا غالباً کیننگ کا منشاء نہ تھا مگر عام قرقی کا اعلان کرنا بے ضرورت اور نامناسب تھا۔ اس اعلان سے عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ آئندہ بندوبست کے موقع پر انگریزی سرکار تعلقداران اودھ کو اس سے بھی زیادہ علیحدہ کر دیگی جس حد تک ۱۸۵۶ء میں کیا گیا تھا۔ اس سے لوگوں کو بجا طور پر خدشہ ہو گیا کہ جدید حکمران ملک کے قدیم نظام اراضی کا جو صفایا کر رہے تھے اس سے ان کا منشاء شاید اس نظام اراضی کے سادہ صفحہ پر آئندہ اپنی نامعلوم حکمت عملی کو قلمبند کرنا ہو گا۔

جب ۱۸۵۸ء میں حکومت قدامت پسند قائم ہوئی تو اسوقت لارڈ ایلنبرو مجلس نظم کا ممبر مجلس مقرر ہوا اور اس نے اس غلطی کو فوراً محسوس کیا۔ دوسرا کوئی شخص اس کی جگہ پر ہوتا تو بہ صیغۂ راز گورنر جنرل کو اس غلطی سے آگاہ کرنا اور کسی آئندہ اعلان میں اس کی ترمیم کرلنے کا حکم دیتا۔ لیکن لارڈ ایلنبرو کو واہیات اور مزید خرافات بکنے میں فصاحت و بلاغت دکھالنے کی عادت سی پڑی ہوئی تھی اور اس موقع کو وہ ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں اس نے لارڈ کیننگ کو وہ اپنا مشہور مراسلہ لکھا جس کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

"(ریاست اودھ کے) لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ان کے بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کی حکومت کے بجائے جو خواہ کتنی ہی خراب کیوں نہو کم سے کم وہ دیسی تو تھی ہماری حکومت قائم کر دی گئی۔ حکومت کے اس ناگہانی تغیر کے بعد ایک سرسری بندوبست مالگزاری فوراً کیا گیا جس سے صوبے کے بہت بڑے حصے میں بڑے بڑے ذی اثر قابضان اراضی کو اُن کے خیال کے موافق اُن کے املاک سے اور یقیناً اس شئے سے جو مدت دراز سے ان کے خاندانی تمول

اعزاز اور طاقت و اقتدار کا باعث رہی تھی محروم کر دیا گیا۔"

"ان حالات میں ہم کو اعتراف کرنا چاہئے کہ اودھ میں جو نمایاں مخاصمت ہو رہی تھی وہ بغاوت نہیں بلکہ جائز لڑائی کی شکل و نوعیت کی تھی اسلئے باشندگان اودھ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیئے نہ کہ اُن کو ایسی سزا کا مستوجب سمجھنا جو اپنی وسعت اور شدت میں ان سب سزاؤں سے بڑھی ہوئی ہے جو تاریخ عالم میں کسی مغلوب قوم کے حق میں آج تک صادر ہوئی ہیں۔"

"دوسرے قاعدہ ہے کہ فاتحین نے جب غنیم پر غلبہ حاصل کر لیا ہے تو بہ استثناء چند جن کو وہ مستوجب سزا سمجھتے تھے انھوں نے نہایت دریا دلی کے ساتھ رعایا کی ایک کثیر جماعت کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے۔"

"آپ نے اس سے بالکل مختلف اصول پر عمل کیا ہے چنانچہ مورد الطاف و کرم بنانے کے لئے آپ نے صرف چند افراد کو منتخب کر لیا ہے۔ اور اس ملک کے کثیر باشندوں کو وہ صدمہ پہنچایا ہے، جو ان کی نظروں میں سخت سے سخت سزا کے برابر ہے۔"

"ایسے ملک میں جہاں کی تمام آبادی کسی ناانصافی کے احساس کی بنا پر بالکل دشمن بن گئی ہو تند دستی سے ایک عرصے تک حکومت قائم نہیں رہ سکتی، اور اگر اس طرح حکومت کو برقرار بھی رکھا جا سکتا ہے تو یہ کوئی خوش گوار و پسندیدہ مقصد نہیں۔"

اس سرزنش کا لفظ لفظ اگرچہ منصفانہ تھا لیکن لارڈ کیننگ کے حق میں جس نے اس آفت عظیم میں جیسی آج تک ہندوستان میں انگریزی حکومت پر کبھی نازل نہیں ہوئی تھی مسلسل جاں فشانی کا بار سنگیں اُٹھانے کے علاوہ اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور فتحیاب ہوا تھا مزید برآں جس نے اپنے ہم وطنوں کے خونخوار جذبات کی روک تھام کی تھی اور دشمنوں کے حال پر عفو و کرم کیا تھا یہ سرزنش صرف ایک ایسی غلطی پر جو زیادہ تر اس کے اعلان اودھ کے منشا میں نہیں بلکہ الفاظ میں تھی بڑی سختی تھی۔

لارڈ ایلنبرو کی سرزنش ایک اہم معاملہ تھا کیونکہ ایلنبرو برطانوی کابینہ

کارکن تھا اور اس کے اظہار ناپسندیدگی سے جس پر برطانوی وزارت کو بھی علانیہ اتفاق رائے تھا بذریعۂ تار برقی لارڈ کیننگ کو اطلاع دینے سے لارڈ کیننگ کے اقتدار کی ایسے موقع پر سبکی ہوتی تھی جبکہ اس کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی سخت ضرورت تھی۔ خود انگریزوں نے بھی یہی محسوس کیا اور وہ یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے کہ شہنشاہی ہند کے نجات دہندہ پر برطانوی کابینہ نے اس طرح کا الزام لگایا تھا۔ آخر کار لارڈ ایلنبرو کو کابینہ سے استعفا دینا پڑا جس سے یہ مشکل رفع ہوگئی۔

ہندوستان میں بھی ذمہ دار اصحاب فکر اور اہل الرائے نے لارڈ کیننگ کی اس غلطی کو محسوس کیا تھا۔ اودھ کے چیف کمشنر وقت سر جیمز آؤٹرم نے لارڈ کیننگ کو اس اعلان میں اس فقرے کے اضافہ کرنے کی صلاح دی تھی کہ حکومت ان تعلقداران اودھ کے دعاوی کو نظر عنایت سے دیکھے گی۔ جو فوری اطاعت قبول کرلیں گے۔ پنجاب کے چیف کمشنر وقت سر جان لارنس نے بیان کیا تھا کہ دو لوگوں سے یہ کہنا کہ ان کی تمام اراضی اور املاک قرق کرلی گئی ہے اور انفعال و ندامت کا اب کوئی موقع نہیں رہا درحقیقت ان کے دلوں میں ایسی مایوسی پیدا کردینا ہے کہ ان کی حالت "مرتا کیا نہ کرتا" کی سی بن جائے۔" لارڈ ایلنبرو کی سرزنش سے یقیناً یہ تو ہوا کہ اس غلطی کی پوری اصلاح کردی گئی۔ اودھ میں لوگوں کا حق مالکانہ تسلیم کرلیا گیا۔ جن تعلقداروں نے اطاعت قبول کرلی ان کو ان کی اراضی واپس دیدی گئی۔ فطری رہنمایان قوم کی حیثیت عوام کے برابر کردینے کی ۱۸۴۹ء میں پنجاب میں ۱۸۵۶ء میں اودھ میں جو غلط کوشش کی گئی تھی اس کا پھر اعادہ نہیں کیا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں باضابطہ بندوبست اراضی شروع کیا گیا جو ۱۸۷۸ء میں ختم ہوا اور اس بندوبست کی میعاد تیس سالہ تھی۔

اودھ کے کاشتکاروں کا اسی طرح تحفظ حقوق کرنا جس طرح لارڈ کیننگ نے بنگالے کے کاشتکاروں کے حقوق کے لئے کیا تھا ایسی بات تھی جس کو سر جان لارنس نے گویا اپنے لئے اٹھا رکھا تھا۔ پہلے بندوبست کے زمانے ہی میں وہ پہلا قانون لگان اودھ "(قانون نمبر ۱۹ ۱۸۶۸ء)" نافذ ہوا۔ جدید حقوق پیدا کئے بغیر اور اسامیان قابض کو تسلیم کئے بغیر اس سے غیر مالکانہ اسامیوں کے حقوق اراضی کا

تعین کر دیا گیا اور اُن کی اراضی مقبوضہ پر بجز حکم عدالت کے لگان میں اضافہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔

شمالی مغربی ممالک

پچھلے باب میں ہم نے بیان کیا ہے کہ کس طریقے پر رابرٹ مارٹنز برڈ کی زیر ہدایت شمالی مغربی ممالک کا بندوبست عمل میں آیا تھا۔ ٹامسن نے "مالگزاری کے عہدہ داروں کے لئے ہدایات" نامی رسالہ کیسا شائع کیا تھا اور کس طرح ۱۸۵۵ء میں لارڈ ڈلہوزی نے اپنے آخری فیصلے کی رو سے مطالبۂ سرکار میں تخفیف کر کے اس کو لگان کا نصف قرار دیا تھا۔ زمانۂ مابعد میں صرف ایک ہی اہم "تغیر" اصلاحات اراضی کے ضمن میں عمل میں آیا اور وہ لارڈ نارتھ برک کے زیر نظم ونسق "قانون مالگزاری" (قانون ۱۹ ۱۸۷۳ء) کا نفاذ تھا۔ اس قانون کی رو سے پچاس سے زیادہ سابقہ دستور العملوں اور قوانین میں ایسی ترمیم و تنسیخ ہوی کہ کوئی قانونی پیچیدگی نہیں رہی۔ اسی قانون کی شرائط کے موافق تجدید بندوبست بھی عمل میں آئی قدیم طریقوں کے بجائے نئے طریقے پر پیمائش شروع کی گئی جس میں ایک خاص پیمانے پر اراضی کے نقشے مرتب کئے گئے۔ عہدہ داران بندوبست نے مقامی تحقیقات کے بعد ہر جاگیر کے لگان پر نظر ثانی کر کے لگان کی تصحیح کی اور مقررہ لگان کے ۴۵ اور ۵۵ فی صدی کے درمیان مطالبۂ سرکار متعین کر دیا۔

قارئین خود ان تغیرات کی اہمیت محسوس کر سکتے ہیں۔ محصول اراضی لگانے کا سابقہ طریقہ جس پر برڈ اور ٹامسن کاربند تھے یہ تھا کہ اس میں جمع سے تفصیل کی طرف رجوع کرتے تھے یعنی پہلے کسی حلقے کی مالگزاری کا بہ حیثیت مجموعی تعین کر دیا جاتا تھا اور اس کے بعد یہ رقم ان سب مواضعات پر تقسیم کر دی جاتی تھی جو اس حلقے میں واقع تھے۔ مگر اب ان قواعد کی رو سے جن کو قانون ۱۹ بابتہ ۱۸۷۳ء کے تحت منضبط کیا گیا تھا ایک نیا طریقہ جاری کیا گیا جس میں تفصیل سے جمع کی طرف رجوع کرتے تھے یعنی تحقیقات کے بعد ہر جاگیر کے لگان کی تصحیح کر کے ایک رقم مقرر کر دی جاتی

تھی اور اس طرح جاگیرداروں کے لگان پر نظر ثانی کے بعد سرکاری مالگزاری کی جو رقم مشخص کردی جاتی تھی وہی اس حلقے کی مجموعی جمع تھی۔ بہ الفاظ دیگر قدیم نظام میں جو مطالبۂ مالگزاری مقرر کیا جاتا تھا وہ قیاس پر مبنی تھا مگر جدید نظام میں مطالبۂ مالگزاری لگان کی نظر ثانی پر مبنی تھا۔

باایں ہمہ وہ طریقہ جس سے حقیقی لگان مشخص کیا جاتا تھا اصولاً غلط اور عملاً موجب سختی تھا۔ اگر زمیندار کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بڑا نرم دل واقع ہوا ہے تو اس کا امکان تھا کہ عہدہ دار بند وبست اس کے لگان پر نظر ثانی کرکے ۱۰۰۰ پونڈ کے لگان کو ۱۲۰۰ پونڈ کردے اور سرکاری مالگزاری بھی اسپر ۶۰۰ پونڈ مقرر کردے۔ ایسی کارروائیوں سے نرم دل زمیندار بھی سختی کرنا سیکھ جاتے تھے اور جہاں تک ہوسکے لگان میں اضافہ کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوجاتا تھا حالانکہ انگریزوں کے نظم ونسق کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس طرح کی زیادہ ستانی وقوع ہی میں نہ آنے پائے۔

"نصف لگان کے قاعدے" کی خلاف ورزی کی ایک اور صورت پیدا ہوگئی۔ جب لارڈ میو کے ۱۸۷۰ء کے منصوبۂ تضعیف مرکزیت کی رو سے ابواب کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو لارڈ ڈلہوزی کی حکومت نے "نصف لگان کا قاعدہ" اس صاف وصریح مقصد سے مقرر کردیا تھا کہ مالکان اراضی کو ان کی جاگیری آمدنی کا نصف ملے اور سرکار کو بطور مالگزاری اس کا نصف ملے لیکن ۱۸۷۱ء میں جب جاگیرداروں پر علاوہ مالگزاری کے محصول اراضی کا ۱۰ فیصدی بشکل ابواب عائد کرنے کی اجازت دی گئی تو "نصف لگان کا قاعدہ" ٹوٹ گیا اس نئے منصوبے سے دراصل محصول اراضی ہی میں اضافہ ہوا اور وہ حد باقی نہ رہی جو لارڈ ڈلہوزی نے مقرر کی تھی۔ اس کے علاوہ اس سے اراضی پر جو مطالبۂ سرکار تھا اس میں اضافہ کرنے کا صوبوں کی حکومتوں کو غیر محدود اختیار حاصل ہوگیا۔ ۱۸۷۱ء میں ہندوستان کے تمام صوبوں پر ابواب کی تعداد میں اضافے ہونے سے ایک آفت نازل ہوی۔

پنجاب

پنجاب کے کاشتکاروں کے تحفظ حقوق کی سرجان لارنس نے بڑی دلیرانہ

کوشش کی تھی جس میں اس کو کامیابی بھی ہوئی تجدید بندوبست کا جب وقت آیا تو متعدد اشخاص جنھوں نے ۱۸۵۳ء کے بندوبست کے وقت بہ حیثیت زمیندار اپنا نام سرکاری کھاتے میں درج نہیں کرایا تھا زمیندار ہونے کا دعویٰ کرنے لگے اگر اس وقت ان کو زمیندار تسلیم کرلیا جاتا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کے تحت کی آسامیوں کی حیثیت اسامیِ غیر دخیل کار کی ہو جاتی اور یہ تخمینہ کیا گیا تھا کہ صرف ضلع امرت سر کے ۶۰۰۰۰ خاندانوں میں ۴۶۰۰۰ خاندانوں کی حیثیت اس سے گھٹ جاتی تھی اس لئے کاشتکاروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے مد قانون اسامیاں" کا مسودہ پیش کیا گیا جس پر ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شملے میں بہت بڑی بحث ہوئی۔ سر ہنری مین نے ایک یادگار تقریر میں اس قانون کی پرزور تائید کی اور سر جان لارنس کی خواہش یہی تھی کہ کسی حال یہ نافذ ہو جائے۔ مخالفوں کو ایسی شکست ہوئی کہ اُن کی کمریں ٹوٹ گئیں اور وہ قانون اسٹامپ" (قانون ۲۷ بابتہ ۱۸۶۸ء) کی رو سے ایک طرف زمینداروں کے حقوق کو تسلیم کرلیا گیا اور دوسری طرف کاشتکاروں کو مذلت سے بچالیا گیا۔

"اس قانون کی رُو سے ان اسامیوں کی جن کو حق قبضہ حاصل تھا ایک باضابطہ حیثیت مقرر کردی گئی۔ خاص خاص حالات کے بہ استثناء، عام طور پر وہ اضافۂ لگان سے بھی محفوظ ہو گئے۔ حقیت ارضی کو دوسروں پر منتقل کرنے کا ان کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ اسامی اپنی اراضی میں کس قسم کی اصلاح کرسکتے تھے اور انکو ان اصلاحوں کا کیا معاوضہ ملنا چاہئے ان امور کا تعین کردیا گیا۔ یہ گویا ان امور کی پیش بندی تھی جو بعد کو آئرلینڈ میں تصفیہ طلب بنگئے تھے۔"

صرف اتنا اور عرض کرنا ضروری ہے کہ "قانون اسامیاں" کے نفاذ سے تین سال بعد لارڈ میو کے عہد حکومت میں "قانون مالگزاری پنجاب" (قانون ۳۳ بابتہ ۱۸۷۱ء) نافذ ہوا اور اس کے تحت جو قواعد منضبط ہوئے انھیں کے موافق پنجاب میں یکے بعد دیگر بندوبست عمل میں آئے۔

ہم نے اس باب میں ان قوانین پر مختصر سا تبصرہ کیا ہے جو لارڈ کیننگ اور اس کے جانشینوں نے شمالی ہند کے کاشتکاروں کے تحفظ حقوق کے لئے نافذ

کیے تھے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت نے ان سے زیادہ مفید و کارآمد قوانین کبھی نافذ نہیں کیے۔ منتظمین وقت کی یہ خواہش نہ تھی کہ صاحب اراضی طبقے کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ برخلاف اس کے ان کے حقوق کا منتظمین وقت لحاظ کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کے تحفظ حقوق کا بھی انھیں خیال تھا جو مالکان اراضی کے تحت زمین کی کاشت کرتے تھے۔ کیننگ اور لارنس نے سچ پوچھئے تو ہندوستانی اسامیوں کو نئے حقوق عطا نہیں کیے یا کوئی جدت پیدا نہیں کی۔ برخلاف اس کے انھوں نے صرف ان حقوق میں اصلاح کی۔ ان کی قانونی تعریفات بھی کیں اور ان کو قانون کی شکل میں منضبط کر دیا کیونکہ ہندوستانی کاشتکار سیکڑوں ہزاروں سال سے رسم و رواج ملک کے موافق ان حقوق سے بہرہ ور رہے تھے۔ اس زمانے کے قوانین کی جن میں بڑوں کا احترام اور چھوٹوں اور کمزوروں کی حفاظت ملحوظ رکھی گئی تھی اور جو ہندوستان کے بن لکھے قدیم رسم و رواج پر مبنی تھے تفصیل بیان کرنے سے اہل ہند کی تاریخ لکھنے والے کو بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ ایسے دانشمندانہ اور مفید قوانین کے نفاذ کا سہرہ اول تو لارڈ کیننگ کے سر ہے جس نے سب سے پہلے بنگالے کے کاشتکاروں کا تحفظ حقوق کیا تھا دوم جان لارنس کے سر ہے جس نے بعد کو پنجاب اور اودھ کے کاشتکاروں کا تحفظ حقوق اسی صورت سے کیا۔ ۱۸۵۷ء کے تاریک زمانے میں برطانوی شہنشاہی ہند کو بچانے میں ان آدمیوں نے جو بہادرانہ خدمات انجام دینے تھے ان کا ہر مورخ کو اعتراف ہے لیکن ہر مورخ میں یہ فروتنی نہیں ہے کہ وہ ان خدمات کا بھی ذکر کرے جو ان دونوں نے شمالی ہند کے بے زبان کسانوں کے اغراض کی حفاظت اور ان کے فلاح و بہبود کی خاطر نہایت استقلال کے ساتھ انجام دئے تھے۔ اہل ہند کے معاشی حالات کی تاریخ لکھنے والے ہی کو یہ خاص اعزاز و حق حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے ان دو زبردست ترین منتظمین مملکت کی اس غیر معروف کارگزاری کا پرزور الفاظ میں مکمل اعتراف کرے۔

ان سرآوردہ حکمرانوں نے جس طرح شمالی ہند میں کسانوں پر زمینداروں کے مطالبات کی ایک حد قائم کر دی تھی اسی طرح ہمت کر کے زمینداروں پر سرکاری

مطالبات کی بھی ایک حد مقرر کردی کیونکہ ان کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ اگر ہر تجدید بندوبست پر ملک کی حکومت بھی مطالبۂ مالگزاری میں مسلسل اضافہ کرنے کی خواہاں ہو تو پھر اس زرعی ملک میں دوامی خوش حالی۔ اجتماع دولت اور اصلاح حال کے لئے معقول وجہ تحریک کیا خاک ہوگی۔ کیننگ اور لارنس نے مطالبات میں اضافے کو اس لئے محدود کر دیا تھا کہ اس سے رعایا خوش حال رہے اور رعایا کی عام خوش حالی کے ساتھ ساتھ سرکاری محاصل میں بھی توفیر ہو۔ کیننگ اور لارنس دونوں ناکامی ہوئی کیونکہ آنے والی نسلوں کے مدبروں میں کوتاہ نظری پھیلی ہوئی تھی اور قوم کے ساتھ ان کا کوئی رشتۂ ارتباط قائم نہ تھا اور جب شہنشاہی بالکل محفوظ تھی اور کسی غنیم کا ڈر نہ تھا تو یہ لوگ قوم کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان مباحث کا قصہ نہایت افسوس ناک ہے جو بعد کے باب میں بیان ہوگا۔

چوتھا باب

ہندوستان کے لیے دوامی بندوبست کی تجویز

سنہ ۱۸۳۷ء سے اس وقت تک ایسا شدید قحط شمالی ہند میں کبھی نہیں پڑا تھا جیسا سنہ ۱۸۶۰ء میں پڑا۔ اس کا اثر ۲۵۰۰۰ مربع میل کے رقبہ کے اس سرے سے اس سرے تک ایک کروڑ بیس لاکھ کی آبادی پر پھیلا ہوا تھا۔ دہلی۔ آگرے۔ الہ آباد اور دوسرے شہر و بلاد پر ایک مصیبت نازل ہوئی تھی۔ حکومت نے ان سب تندرست عورتوں اور مردوں کو جو کام کرنے کے قابل تھے امدادی کاموں پر لگادیا۔ اور اپاہج یا سن رسیدہ لوگوں کی جو کام کرنے کے قابل نہ تھے خیرات عامہ سے امداد کی جاتی تھی سنہ ۱۸۳۷ء کے قحط کے مقابل اس قحط میں حیوانوں کا اتلاف کم ہوا۔

آخر کار جب یہ آفت سر سے ٹلی تو لارڈ کیننگ نے کرنل بیرڈ اسمتھ کو ان امور کی تحقیقات و دریافت کرنے پر مقرر کیا کہ اس قحط کے اسباب کیا تھے اور کہاں تک اسکا اثر پھیلا تھا اس کام کے لئے کرنل بیرڈ اسمتھ سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی فتح کے وقت بیرڈ اسمتھ بہ حیثیت چیف انجنیر خاص امتیاز حاصل کر چکا تھا لیکن در اصل اس کی شہرت کا انحصار شمالی ہند کے ان ذرائع آبپاشی پر

تھا جن سے نہ صرف رقبۂ کاشت میں اضافہ ہو گیا تھا بلکہ رعایا کے کھانے کے لئے غلّے کی پیداوار میں بھی توفیر ہوئی تھی چنانچہ حسب معمول مستعدی اور سرگرمی سے اس نے اس جدید کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ قحط زدہ خطوں کے حالات کی مکمل تحقیقات کر لنے کے بعد اس نے مئی اور اگست ۱۸۶۱ء میں تین رپورٹیں پیش کیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے وہ چند امور واقعہ دریافت کئے تھے جو ہندوستان کے ہر قحط پر صادق آتے تھے۔

اول اس نے صاف طور پر بتایا تھا کہ ملک میں قحط پڑنے کا سبب غلہ و اجناس کی قلت نہ تھی بلکہ فاقہ کش اور بھوکوں مرنے والوں کو اشیائے خورد و نوش میسر نہیں ہوتے تھے۔ دوم اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ قوم کی عام قوتِ تحمل کا انحصار زیادہ تر ان کے نظام اراضی ہی پر تھا۔

"اس سے بڑھ کر کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قحط کے وقوع میں آنے کو تعین مطالبۂ مالگزاری کے ساتھ کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے۔ یا جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں امور باہم دیگر متعلق نہیں ہیں حقیقت یہ ہے کہ بہ مقابل سڑکوں اور نہروں کے لئے ذرائع امداد کے اگرچہ یہ بھی بیشک اہم ہیں مطالبۂ مالگزاری سے قحط کا تعلق قریب تر کا ہے۔ کیونکہ رعایا کی روز مرہ زندگی اور ان کے عروج و زوال۔ نزول و افلاس سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ جب فطرت کے اقتضاء سے امساک باراں اور خشک سالی نمودار ہوتی ہے تو پھر کوئی بہتر سے بہتر بند و بست بھی انسانی دماغ اختراع کیوں نہ کرے اس سے نہ آسمان پر بادل اُمنڈ لتے ہیں اور نہ زمین بارش سے تر ہو سکتی ہے لیکن خشک سالی اور اس کے نتائج خواہ کچھ ہی کیوں نہوں لوگوں میں ان فنا کن اثرات کے مدافعت کی قابلیت اسی تناسب پر بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اسی ہندسی تناسب پر ہوگی جس تناسب پر ان کا نظام بند و بست جس کے زیر اثر وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں اور نشو و نما پاتے ہیں مکمل بن گیا ہو۔"

باحتیاط تمام پوری چھان بین کر لنے کے بعد ۱۸۳۷ء کے قحط اور ۱۸۶۰ء کے قحط کا باہمی مقابلہ کرنے سے کرنل بیرڈ اسمتھ کو اس مذکورۃ الصدر امر کا حق الیقین

ہوگیا تھا۔ مساوی رقبے پر ان دونوں قحطوں کا اثر پڑا تھا لیکن بعد کے قحط سے زیادہ آبادی متاثر ہوئی تھی اور ۱۸۶۱ء میں دوسرے حالات بھی بدتر تھے۔ باایں ہمہ ۱۸۶۱ء میں اتنی جانیں تلف نہیں ہوئیں جتنی ۱۸۳۳ء میں ہوئی تھیں کیونکہ ۱۸۳۳ء سے شمالی ہند میں جس نظام اراضی کی ترویج کی گئی تھی وہ پہلے نظام سے بے انتہا بہتر تھا۔

"۶۱-۱۸۶۰ء میں جن اسباب سے شمالی ہند کا معاشرتی شیرازہ ایسا مستحکم ہوگیا تھا کہ امساک باراں اور قحط کے شکنجے میں پھنس لینے کے بعد بھی ملک کو ان صدموں کی تاب لانے میں مقابل ۳۸-۱۸۳۷ء کے کم زحمت و تکلیف اُٹھانی پڑی تھی ان میں سب سے زیادہ اہم سبب زرعی ملک کی آسان نقد پذیری اور انتقال ملکیت کی سہولت کہی جاسکتی ہے اور یہ دراصل اراضی پر طویل میعاد تک مطالبۂ سرکار نیز انفرادی حقوق کا جنھیں موجودہ بندوبست کی ابتداء سے کامل طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے بہ احتیاط تمام تعین کردینے کا لازمی نتیجہ ہے"

آئندہ قحط کے بدترین سے بدترین اثرات سے ملک کے محفوظ رکھنے اور عام رعایا کی خوش حالی سے محاصل سرکار میں اضافہ ہونے کی غرض سے کرنل بیرڈ اسمتھ نے شمالی ہند کے سابقہ اور موجودہ حالات کی بہ احتیاط تمام تحقیقات کرنے کے بعد جو اعداد اور معلومات فراہم کئے تھے ان کے لحاظ سے وہاں کے لئے دوامی بندوبست مالگزاری کی سفارش کی تھی۔

"ایک حد تک صحیح اصول پر کاربند رہنے سے عام طور پر جو فائدہ ہوا ہے اس سے قدم اور آگے بڑھانے کی ہمت ہوتی ہے اور اس فعل کے جواز کی بھی ایک صورت نکل آتی ہے۔ آپ کے غور کے لئے نہایت مؤدبانہ طریقے پر میں سب سے پہلی اور سب سے اہم اصلاحی تجویز یہ پیش کرتا ہوں کہ اراضی پر مطالبۂ سرکار کا ہمیشہ کے لئے تعین کردینا مناسب ہے کیونکہ میرا راسخ عقیدہ یہ ہے کہ اس سے سرکار اور رعایا دونوں کے اغراض کو روزافزوں تقویت حاصل ہوگی"

"یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اگر مطالبۂ سرکار کا دوامی تعین کردیا جائے تو اس رعایت سے سرکار کو محاصل کا بڑی حد تک ایثار کرنا ہوگا لیکن یہ قابل ملاحظہ ہے کہ صرف ایک صورت حال کے بہ استثناء جس کے متعلق علحدہ عرض کیا جائیگا

سرکار نے حال میں جتنی تدبیریں اختیار کی تھیں ان کا نتیجہ بالکل اس کے برعکس ہی نکلا اور یہ ثابت ہوگیا کہ مطالبۂ مالگزاری میں عام اضافے کے بجائے عام تخفیف ہی سے سرکاری اغراض بہتر طریقے پر پورے ہو سکتے ہیں اگر اس طرح دولت جمع ہونے لگے تو اس کے فواید سے ساری زمین بہرہ ور ہوگی اور اس طبقے کی خوش حالی میں بھی اضافہ ہونے کی بنا پر جو ہمیشہ دیسی معاشرت کی روح رواں ہے اور جس کا استحکام اور کمزوری معاشرتی شیرازے کا استحکام اور کمزوری ہے نہ صرف تجارت داخلہ و خارجہ اور عام متول میں اضافہ ہوگا بلکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائیگا قوم وملت بھی زیادہ قوی ہوتی جائیگی اور ایک ایسی آفت کی جواب زیر غور ہے کسی جماعت کے تاب نہ لانے کا خدشہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا جائیگا۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس تجویز سے کم سے کم ایک حد تک مذکورہ توقعات پوری ہوتی ہیں تو پھر یہ مفروضہ نا واجبی معلوم ہوتا ہے کہ ایک ذہین اور طاقتور حکومت ان عام فوایہ سے خود بہرہ ور نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ خوش حالی سے مستفید ہونے کے سب سے کم ناپسندیدہ اور سب سے زیادہ موثر ذریعوں کی طرف خود بخود ایسی حکومت کا ذہن منتقل ہوگا اور ان ذرائع کی آزمائش اور کامیابی بھی اس کے مقدور میں ہوگی۔ اس لیے میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اس میں سرکار کو اثیار سے کام لینا نہیں پڑے گا بلکہ اس کے برخلاف اس طرح مزید غیر سرکاری ملکیت کے پیدا کر لنے سے جو مطالبۂ مالگزاری کے دوامی تعین کا لازمی نتیجہ ہوگا سرکار کے ذرائع آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔"

کرنل بیرڈ اسمتھ نے سب سے پہلے جو اصلاحی تجویز پیش کی وہ یہی تھی اور اس کے علاوہ اس نے ذرائع آبپاشی اور ذرائع آمد ورفت وغیرہ کی تکمیل و توسیع کی بھی صلاح دی۔ اس کے بعد لارڈ کیننگ نے بیرڈ اسمتھ کی اس رپورٹ کو تمام صوبوں کی حکومتوں کے پاس ان کے غور و خوض کے لیے بھیجدیا۔

پنجاب کی رپورٹ

شمال ہند میں حکومت پنجاب ہی ایک ایسی حکومت تھی جس نے دوامی بندو بست

کی فوری ترویج میں اس لیے تامل ظاہر کیا تھا کہ اس صوبے کو انگریزوں کے زیر انتظام آئے ابھی بارہ سال نہیں ہوئے تھے اور کئی اضلاع میں ابھی کاشت بہت زبوں حالت میں تھی۔ وہاں کے لفٹنٹ گورنر نے لکھا تھا کہ:

"پنجاب کا آدھا رقبہ بھی زیر کاشت نہیں ہے وہاں بڑے بڑے خطے تقریباً غیر آباد ہیں۔ ذرائع آمد و رفت بالکل ناقص اور عام طور پر ذرائع آمدنی سرکار ابھی نامکمل ہی ہیں۔ اس لیے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک ایسے صوبے میں جہاں اوسط درجے کی زرعی ترقی ہو چکی ہو آئندہ لگان میں کسی طرح کا بھی اضافہ کرنے کے حق سے سرکار کا دست بردار ہو جانا بڑی دانائی کی بات ہے ہم موجودہ وصول باقی کو ایک ایسے صوبے میں جس کی حالت ترقی یافتہ صوبے کی سی نہیں بجالہ قائم رکھنا ہی بڑی عاقبت اندیشی خیال کرتے ہیں۔"

"اس موضوع پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنے کے بعد پنجاب کی حد تک تو لفٹنٹ گورنر کا یہی خیال ہے کہ اگر پنجاب جیسے ملک میں بھی جہاں کاشت کی حالت بہت ہی زبوں ہے اور جس کے محاصل سے فوج کے مصارف تمام و کمال نہیں ادا ہوتے اور جہاں دیوانی ادارے بھی کسی بہت بڑے شائستہ اور ترقی یافتہ ملک کے مناسب حال نہیں بلکہ بالکل معمولی ہیں علانیہ یہ کہہ دینا کہ محصول مالگزاری میں آئندہ کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا جائیگا بڑی فراست سمجھی جاتی ہے تو بایں ہمہ تقسیم دولت کی موجودہ اور آئندہ کی غیر مساوات اس درجے بڑھی ہوئی اور عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کہ بندوبست کے ساتھ ساتھ اس کو بھی دوامی کر دینا لازم آتا ہے اور یہ کسی صورت سے مناسب نہیں۔"

شمالی مغربی ممالک کی رپورٹ

شمالی ہند ساٹھ سال سے انگریزوں کے زیر حکمرانی تھا اور ان اضلاع میں جہاں کاشت خوب ہوتی تھی دوامی بندوبست کی ترویج کے مسئلے پر سبھی کا اتفاق رائے تھا۔

ولیم میور نے جو اس وقت مجلس مالگزاری کا رکن کبیر تھا اور بعد کو اس صوبے کا لفٹنٹ گورنر اور پھر وزیر مال ہند ہوا۔ دوامی بندوبست کے فوائد کا حسب ذیل چھ عنوان کے تحت خلاصہ کیا ہے :-

(۱) میعادی تجدید بندوبست کے مصارف کی بچت۔

(۲) تجدید بندوبست کی زحمتوں سے رعایا کو نجات۔

(۳) ہر عارضی بندوبست کے ختم پر جاگیروں کا ناقدری سے محفوظ رہنا۔

(۴) اصلاح اور صرفِ اصل کی معقول وجہ تحریک اس طرح پیدا ہونے سے خوشحالی کا پیدا ہونا۔

(۵) ملک اراضی کی توفیر مالیت۔

(۶) رعایا میں قناعت اور اطمینان قلب کا پیدا ہونا۔

آریسٹی مجلس مالگزاری کے رکن صغیر کی رائے میں اس تجویز سے سرکار کا کوئی مالی نقصان نہیں ہوتا تھا۔

"میری رائے یہ ہے کہ آئندہ تجدید بندوبست پر موجودہ مطالبۂ سرکار میں اضافہ کرنے کے بعد بھی مالگزاری کی رقم اتنی زیادہ نہیں ہو سکتی جتنی زیادہ ذرائع آمدنی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ بتدریج ترقی کرنے سے ہو سکتی ہے بشرطیکہ حقیت اراضی سہل ترین کر دی جائے۔ اور اس کا ثبات مستیقن ہو جائے۔

ان آراء سے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے شمالی مغربی ممالک کے لفٹنٹ گورنر نے غور و خوض کے بعد ایک طول طویل یادداشت میں دوامی بندوبست کر دینے کی تجویز پیش کی تھی۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ شمالی مغربی ممالک میں بتدریج دبہ احتیاط تمام بندوبست مالگزاری کو مراعات مداومت کا حامل بنانے سے عام طور پر وہ فوائد حاصل ہوں گے جن کو کرنل بیرڈ اسمتھ نیز مسٹر میور نے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ طویل المیعاد بندوبست کے نتیجے کا لحاظ کرتے ہوئے بلا خوف و خطر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مطالبۂ سرکار کو دواماً محدود کر دینے سے اراضی کی شکل میں مشغول سرمایہ بہت زیادہ ہونے لگے گا۔ زرعی طبقات کی دولت میں بھی اضافہ ہوگا۔ کسانوں کی خوشحالی

بڑھ جائے گی اور قوم میں نیا زور پیدا ہو جائیگا۔ اراضی کی قیمت بھی زیادہ ہو جائیگی اور کاشت کی توسیع اور پیداوار کی توفیر سے جو منافع ہوگا اس کا کوئی حصہ بطور حق سرکار لینے سے اگر حکومت دست کش ہو جائے تو اس آئندہ نقصان کی تلافی کلیتہً نہیں تو کم از کم جزاً عام طور پر ملک کی توفیر دولت اور ازدیاد خوش حالی سے ہو جائیگی"

"علاوہ برآں اس کے ذیلی فواید کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے مثلاً لوگوں کو ہر طرح کی زحمتوں اور استحصال بیجا سے جو درحقیقت وقتاً فوقتاً تجدید بندوبست کے لازم وملزوم ہیں نجابت حاصل ہونا۔ ان مصارف کثیر سے بچنا جو ہر تجدید بندوبست پر سرکار پر لاحق ہوتے ہیں مالکان اراضی کو ہر تجدید بندوبست کے وقت عارضی طور پر اپنے املاک کی فرسودہ حالت بنا دینے کا کوئی موقع نہ دینا۔ غرض مذکورالصدر سب امور سرکار اور رعایا دونوں کے حق میں بارسنگیں ہیں اور کم وبیش شدت سے ان دونوں پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ اگر سرکاری محاصل میں دوامی خسارے کی کوئی صورت پیدا کئے بغیر ان خرابیوں کو دور کیا جا سکتا ہے تو کوئی ہوشیار شخص ایسا نہ ہوگا جو اس کی ذرا بھی مخالفت کرے"

"دوسرے خیال میں اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ مطالبۂ سرکار کا دوامی تعین کرنا بڑی سیاسی فراست ودانائی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بہار اور بنارس کے چند اضلاع خصوصاً غازی پور میں جہاں دوامی بندوبست قائم ہے ۵۷ء کی بغاوت ان صوبوں کے ان دوسرے اقطاع کے مقابل جہاں صرف عارضی بندوبست ہی ہے کسی حال کم عالمگیر یا کم ارادی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن ان جذبات کا ظہور چند ایسے جوش دلانے اور ابھار نے والے اسباب وعلل کا نتیجہ تھا جن کا اثر سریع الزوال اور عارضی تھا اور اس سے یہ عقیدہ کسی حال کمزور نہیں ہوتا کہ اراضی پر مطالبۂ سرکار کی ایک حد مطلق مقرر کر دینے سے رعیت کو اطمینان کلی حاصل ہو جائیگا اور اگر کسی بات سے رعیت کو سرکار کے ساتھ عقیدت وخلوص پیدا ہو سکتا ہے اور ملک کے اغراض کی بہترین طریقے پر تکمیل کرنے کی خواہش سرکار کے دل نشین ہونے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو بس وہ یہی ایک بات ہے"

"لیکن میری رائے میں دوامی بندوبست کی ترویج چند استثنیات وقیود

وشرائط کے ساتھ ہونی چاہئے اور اس تجویز کو انجام پر پہنچانے کے لیے چند سال کی مہلت درکار ہے۔ تعجیل ایک ایسے اہم معاملے میں بالکل نادرست ہے کیونکہ یہ سرکار اور رعایا دونوں کے حق میں باعث مضرت ہے۔"

لفٹنٹ گورنر جی۔ ایف۔ اڈمنسٹن نے "جو مستثنیات و قیود و شرائط" مقرر کئے تھے وہ حسب ذیل تھے:۔ یہ کہ دوامی بندوبست سے پہلے موجودہ بندوبست پر نظر ثانی کر لی جائے۔ یہ کہ اس تجویز سے بعض اضلاع جن کی حالت جنگل کی سی ہے یا جن کی رفتار ترقی بہت سست ہے کئی سال تک مستثنیٰ کر دئیے جائیں۔ یہ کہ "ہر میعاد بندوبست کے ختم پر مالگزاری میں آئندہ اضافہ سے سرکار کے دست بردار ہو جانے پر جو نقصان ہوگا اس کی تلافی کے لیے پن کی شرح میں اضافہ کیا جائے۔"

بنگالہ کی رپورٹ

سیسل بیڈن لفٹنٹ گورنر بنگالہ نے گورنر جنرل کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے پہلے ہی اس تجویز کی تائید کی تھی کر بہ حیثیت لفٹنٹ گورنر اس نے اپنی سابقہ رائے کی ایک علحدہ مراسلے میں توثیق کی۔

"اگرچہ فی الحقیقت مجلس کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرکار اور کسی شخص کے مابین جس سے بندوبست کیا جاسکتا ہے تشخیص مالگزاری ایک بالکل سیدھا سادہ معاہدہ ہے اور یہ دوامی ہو کہ عارضی اس کے جواز کے لیے کسی خاص قانون کی ضرورت نہیں پھر بھی بنگالے کے جنوبی صوبوں کے متعدد پرگنوں میں تشخیص مالگزاری کے متعلق ہمیشہ کے لیے ایک موثق اصول کا قانوناً مقرر کر دینا جیسا سنہ ۱۷۹۳ء میں کیا گیا تھا لفٹنٹ گورنر کی رائے میں بیشک درست ہوگا۔"

وزیر مال کی رائے

سر بارٹل فریر جو اس وقت گورنر جنرل کی کونسل کا رکن تھا۔ اس نے بھی اس تجویز

کی تائید کی۔ لیکن جس نے سب سے زیادہ اہم تائید کی وہ خود لارڈ کیننگ کی کونسل کا وزیر مال سیموئل لینگ تھا۔ انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ جو ہر ماہر فن مالیات کی قابل تعریف فطری خصوصیت ہوتی ہے اس نے یہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا کہ دوامی بندوبست سے آئندہ مالگزاری کا جو نقصان ہوگا اس کی تلافی دیگر ذرائع سے توفیر آمدنی وقوع میں آنے کے باعث ہو جائیگی لیکن دوسرے اعلےٰ غور طلب امور کی بنا پر اس نے اس تجویز کی تائید کی جس کو اسی کے پُر زور الفاظ سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا :-

"بہ حیثیت حکومت ہمارا وجود اس لیے نہیں کہ ملک سے اس کے انتہائی مقدور کے برابر ہم محاصل وصول کرتے رہیں۔ یا رعایا کے ایک جم غفیر کو کسان اسامیوں کی حیثیت سے ایک پدری حکومت کے تحت ہر جگہ یکساں اور مساوی الحیثیت بنا رکھیں خواہ یہ حالت ایک حد تک مسرت خیز و قناعت افزا ہی کیوں نہ ہو۔"

"اگر ہم دوامی بندوبست کر دیں جیسی مسٹر ہیڈن کی تجویز ہے تو ہم ایک ایسے معاشرتی نظام کا سنگ بنیاد رکھیں گے جس کا انتظام یوں بہ آسانی نہ ہو سکیگا۔ مگر جس میں متعدد اور مختلف تمدن و ترقی کے عناصر پہلے سے زیادہ موجود ہونگے۔ اس معاشرتی نظام میں کئی مدارج ہونگے مثلاً دیسی رؤسا جن کے زیر قبضہ اراضی کے بڑے بڑے خطے ہونگے ان کے بعد شرفا جن کی جاگیریں ہوں گی۔ خود مختار زمیندار۔ اپنی اراضی کی خود کاشت کرنے والے چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی۔ طویل المیعاد پٹہ رکھنے والے بڑے بڑے اسامی جو ہنرمند اور سرمایہ دار ہونگے۔ چھوٹے چھوٹے پٹہ دار اسامی، غیر دخیل کار اور سب سے آخر روزانہ کے مزدور۔"

"بعض اضلاع میں ایک طبقے کے لوگ زیادہ ہونگے بعض میں دوسرے طبقے کے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ایسے مقام کے مقابل جہاں حکومت ہی سب کچھ ہو یہاں زحمت و تکلیف، غیر مساوات اور تصادم بہت زیادہ ہوگا مگر ساتھ ہی ساتھ زندہ دلی۔ حرکت اور ترقی بھی بہت زیادہ نمایاں رہیگی۔

"اگر انگلستان میں سرکار نے ان سب زمینوں کے جو پہلے ورپہلے خانہ جنگیوں میں لطور تاوان آگئیں یا کلیسا سے چھین کر ضبط کر لی گئیں صرف معاف شدہ محصول اراضی کو اپنے لیے مختص کر لیا ہوتا تو پھر بلا کسی مزید محصول کے حکومت کے کاروبار میں اس سے بہت کچھ مدد ملتی مگر کیا انگلستان پھر وہی ملک ہوتا جو آج نظر آتا ہے؟"

"اگر مشرق سے ہم کو کچھ سروکار ہے تو یہی کہ ہم مقبول عام قدیم وضع کی مشرقی مطلق العنانی[1] کے بجائے کوئی اچھی چیز اختراع کریں اور ایک بڑی خود مختار اور خرد مند قوم بننے کا ہندوستان کو کم سے کم موقع ہی دیں"

"محاصل پر اس کا کیا اثر پڑیگا اس کا مجھ کو مطلق خدشہ نہیں"

"ممکن ہے یہ صحیح ہو کہ کم سے کم آئندہ بیس یا تیس[2] سال تک گو لوگوں کے محاصل میں اضافہ ہونا ہے لیکن ہمیں اس قدر محاصل وصول نہ ہوگا جس قدر اس حالت میں ہوتا کہ اضافہ ہمیں کو ملتا"

"لیکن آئندہ معقول مقدار میں محاصل کے وصول ہوتے رہنے کا کچھ اندیشہ نہیں بشرطیکہ ہمارے بندوبست اراضی میں چند امور ملحوظ رہیں۔ مجھ کو اس کا کسی صورت سے یقین نہیں کہ حکومت کے حقیقی مقاصد کی تکمیل کے لیے جتنے محاصل

---

[1] ہندوستان میں مشرقی مطلق العنانی کے نقائص اور خرابیاں کچھ ہی سہی وہ ہر وقت طبقات کے مراتب کا لحاظ کرتی تھی اور دیہی جماعتوں۔ زمینداروں۔ پالی گاروں۔ جاگیرداروں میراث داروں۔ سرداروں اور تعلقداروں کی پرورش کا ہمیشہ خیال رکھتی تھی۔

[2] یادداشت مورخہ ۷ اپریل ۱۸۶۲ء۔ بیرڈ اسمتھ نے لکھا تھا کہ "بعض وقت تمسخر کے طور پر اور بعض وقت متانت و سنجیدگی کے ساتھ یہ کہا جاتا تھا کہ ہندوستان کے خزانے کے پُر ہونے کا لازمی نتیجہ جنگ ہی ہوتا ہے" لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح اور حقیقت سے قریب تر ہوگا کہ بے انداز محصولات سے محاصل میں فاضلات ہونے کا یقینی نتیجہ مزید فوجی مصارف کا عائد ہونا، ہندوستان پر ناواجبی بار کا ڈالنا اور ہندوستان سے اور زیادہ معاشی بدررو کا جاری رہنا ہی ہوتا ہے۔

کی ضرورت ہے اس سے زیادہ ملک کی آمدنی میں سے سرکار کا اپنے صرف کے لیے مختص کر لینا یا بہ آسانی اس سے بڑھ کر زر وصول کرنا بھی کوئی پسندیدہ بات ہے۔"

سر جان لارنس کی یادداشت

ممالک متوسط۔ مدراس اور بمبئی سے یہ اور دوسری رپورٹیں وزیر ہند کے ملاحظے میں پیش ہوئیں۔ سر چارلس وُڈ نے اس سوال نیز محصول اراضی کے مسئلہ انفکاک پر جو گزشتہ چند سال سے حکومت کے زیر غور تھا نہایت توجہ اور احتیاط کے ساتھ غور کیا۔ موخرالذکر مسئلہ تو وہیں ختم کر دیا گیا لیکن مقدم الذکر یعنے دوامی بندوبست کے مسئلے پر ٹھنڈے دل سے نہایت قابلانہ بحث مباحث ہوئے۔

سر جان لارنس جو اس وقت وزیر ہند کی کونسل کا رکن تھا انفکاک مالگزاری کی حکمت عملی کا مخالف تھا مگر اس نے بھی دوامی بندوبست کی تجویز کی زور دار تائید کی۔

"میں دوامی بندوبست کی اس لیے سفارش کرتا ہوں کہ مجھ کو یہ باور کرایا گیا ہے کہ چند سال سے ملک نے بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن مطالبۂ سرکار اگر محدود کر دیا جائے تو ذرائع تمول میں اس سے بڑھ کر ترقی کا امکان ہے۔ اس تجویز سے لوگوں کو اندرون ملک شغل زر کرنے کی اور زیادہ ترغیب ہوگی اور خود مالگزاری بھی زیادہ محفوظ ہو جائیگی کیونکہ وقتاً فوقتاً نزول آفات پر مالگزاری کا ہمیشہ خسارہ ہوتا رہا ہے اگرچہ یہ نقصان کم و بیش عارضی نوعیت ہی کا ہوتا ہے۔ یہ بھی نہایت ہی پسندیدہ بات ہے کہ موجودہ زمینداروں اور کسان مالکوں کو ان کی اراضی سے بے دخل کئے بغیر ایک ایسے متوسط طبقے کے جس کا تعلق اراضی سے ہو نشو و نما کے لیے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ ان طبقوں میں جو ایسے نادار ہیں کہ ظاہری حالت بھی ثقہ نہیں رکھ سکتے اکثر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھیں فہم و فراست۔ جوش و جرأت اور معاشرتی اثر و اقتدار حاصل ہے۔ اس لیے موجودہ صورت حال کی اصلاح اس طرح نہیں ہو سکتی کہ صرف چند اشخاص کو غیر مشترک فوائد عظیم پہنچائے جائیں اور

وہ بھی قوم کے ماتحتی افراد کو بالخصوص محروم کرکے۔ جس بات کی درحقیقت ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں جو دانا و ہوشمند۔ کفایت شعار اور باہمت ہوں ان کو اپنے ان اوصاف سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے تاکہ ان کی حالت درست ہو جائے اور اس کا بہترین طریقہ بیشک یہی ہے کہ اراضی پر مطالبۂ سرکار محدود کردیا جائے جب ایسے لوگ صاحب جائداد بنجائینگے اور خوب خوشحال رہینگے تو سرکار کی طرف بھی ان کے خیالات یقیناً اچھے رہیں گے اور اپنے وسیع اقتدار کو سرکار کی حمایت کے کام میں ضرور لائیں گے۔ یوں تو اہل ہند پر قومی اور مذہبی جذبات کا بڑا اثر ہے لیکن حُب وطن کا اس سے بھی بڑھ کر اثر ہے۔ چنانچہ شمالی ہند کے ہزاروں بلکہ لکھوکھا باشندے جو ہندوستان کے اقوام میں سب سے زیادہ جنگ جو اور سپاہی منش ہیں ان اجداد کی اولاد ہیں جنھوں نے اپنی سرزمین کو بچانے کے لیے مذہب تک کو ترک کردیا تھا۔ مزارعین ملک کے دراصل ہاتھ پاؤں ہیں اور ان کی قناعت پر انگریزی حکمرانی کے آئندہ قیام کا بڑی حد تک انحصار ہے۔ اگر وہ خوشحال رہیں اور پھر فوج کم تعداد میں بھی رکھی جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

سر چارلس وڈ کا مراسلہ

وزیر ہند نے ان خیالات اور دلائل پر نہایت خلوص و گرم جوشی کے ساتھ اپنا اتفاق رائے ۹ر جولائی ۱۸۶۲ء کے یادگار مراسلے میں ظاہر کیا جس سے ہم ذیل کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"ملکۂ معظمہ کی حکومت کو دوامی بندوبست کے سیاسی فوائد کے متعلق ذرا بھی شک نہیں مالکان اراضی پر مطالبۂ سرکار کا دوامی تعین کردینے سے ملکیت اراضی کا پورا پورا تحفظ ہو جائیگا بلکہ یوں کہئے کہ یہ حقیقت از سر نو پیدا ہوگی اور اس سے رعایا کے دلوں میں بھی حکومت کی طرف سے جو اس برکت کا باعث ہے اور جس کے وجود کے ساتھ اس برکت کا وجود بھی دواماً وابستہ ہے محبت و خلوص عقیدت و وفاداری کے جذبات پیدا ہونگے اور اگر یہ جذبات ان میں پہلے سے موجود ہیں تو اور مزید قوی و مستحکم ہو جائینگے۔"

"یہ بھی بہت ہی مناسب ہے کہ کسان مالکوں اور قابضوں کو اراضی سے بے دخل کئے بغیر ایک متوسط طبقے کے تدریجی نشوونما کے لیے جس کا تعلق اراضی سے ہو ہر طرح کی سہولتیں پیدا کی جائیں۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں میں جن میں فرداً فرداً دیکھیں تو افلاس پھیلا ہوا ہے۔ ایسے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں جن کو فہم فراست کارہائے عامہ میں جوش وجراءت اور معاشرتی اثر واقتدار بہت کچھ حاصل ہے اس لیے اراضی پر مطالبۂ سرکار کی ایک حد مقرر کردینے سے ہوشیار، کفایت شعار اور حوصلہ مند اشخاص کو اپنے اوصاف سے متمتع ہوکر اپنی حالت سدھار لینے کا موقع ملجائیگا۔ جب ایسے لوگ اپنے لیے املاک پیدا کرلیں گے اور اپنے آپ کو متمول حالت میں دیکھینگے تو یقیناً ان کے دلوں میں ایسی حکومت کے ساتھ خوش اعتقادی پیدا ہوجائیگی جس کے زیر سایہ وہ رہتے ہیں زراعت پیشہ طبقات (جو آبادی کا جز کثیر ہیں) کی قناعت پر حکومت کے قیام کا زیادہ تر انحصار ہے۔ اگر یہ طبقات خوشحال ہیں تو دوسرے طبقات یا جماعتوں کی اتفاقی سرکشی کچھ ایسی موجب خطر نہیں ہوسکتی اور پھر افواج اور ان کے مصارف میں بھی حسب ضرورت تخفیف کی جاسکتی ہے۔

"ملکۂ معظمہ کی حکومت کو ذرا بھی شبہ نہیں کہ دوامی بندوبست سے عام اصلاح وترقی کی رفتار میں اور سرعت پیدا ہوجائیگی۔ ملکیت اراضی پیدا کرنے سے ملک کی روز افزوں دولت کے لیے ایک مقبول عام شغل زر کا ذریعہ پیدا ہوجائیگا اور سب طبقات اس تجویز سے مستفید ہونگے۔ زرعی آبادی پر اس کا وہی اثر ہوگا جیسا کرنل بیرڈ اسمتھ نے محولۂ صدر اپنی قابلانہ یادداشت میں بیان کیا ہے یعنی اس سے رعیت کی معاشرتی حالت ارفع واعلیٰ بنجائے گی جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ لوگ نہ صرف حوادث زمانہ کے مقابلے میں کامیاب رہینگے بلکہ معمولی اوقات میں بغیر کسی مشکل کے مختلف اشکال میں مزید محصولات برداشت کرسکیں گے۔ ملکیت کا احساس یا بہ الفاظ دیگر اگر اس بات کا تیقن ہوجائے کہ جو محنت اور سرمایہ لوگ اپنی اراضی میں لگائینگے اس کا ثمرہ انھیں کو ملیگا تو پھر یقیناً ان کے سب قویٰ اراضی کو ترقی پر پہنچانے میں صرف ہونے لگیں گے۔ ملکۂ معظمہ کی حکومت کو پوری توقع ہے کہ اگر لوگ تانع رہ کر اپنی اصلاح حال کے لیے ہر وقت کوشاں رہیں تو کسی مشکل کے بغیر دوسری صورتوں سے وہ محاصل

سرکار ہیں اس قدر اضافہ کر سکتے ہیں کہ آئندہ کے اضافۂ مالگزاری سے دست بردار ہونے کے نقصان کی تلافی سے بھی بڑھ جائے۔"

"ان غور طلب امور پر نظر غائر ڈالنے کے بعد ملکۂ معظمہ کی حکومت کی یہ رائے ہے کہ اس تجویز سے نہ صرف ان لوگوں کے لیے جن کا اراضی سے براہ راست تعلق ہے بلکہ عام طور پر ایک بڑی جماعت کے لیے فوائد عظیم کی واجبی طور پر توقع کیجا سکتی ہے تو ان کے حصول میں آئندہ نقصان اٹھانے کے خطرے میں پڑنا بھی بالکل جائز اور درست ہے۔ یہ کہ صحیح حکمت عملی کا اقتضا یہی ہے کہ ان سب اضلاع میں دوامی بندوبست کر دیا جائے جہاں کے حالات یا تو سر دست ایسے ہیں یا آئندہ ایسے ہونے کی توقع ہے کہ وہاں دوامی بندوبست شروع کر لینے کے لیے کوئی امر مانع نہیں۔ اس سے ہندوستان کے ذرائع آمدنی میں جلد ترقی ہوگی اور اس ملک میں ملکۂ معظمہ کے ہر طبقے کی رعایا کی فلاح و بہبود اور قناعت کی صورت بھی پیدا ہو جائیگی۔"

رعایا کی رائے یہ ہے کہ قابضان اراضی کو حق انفکاک لگان عطا کر کے اس پیچیدہ طریقے سے وہی نتیجہ پیدا کرنیکی بہ نسبت دوامی بندوبست کا سیدھا طریقہ ہی بہتر ہے۔ ان کا یہ عقیدہ نہیں کہ قابضان اراضی کو اپنی ملک کو ترقی دینے کے لیے روپیہ صرف کرنے کی ترغیب کے طور پر مالگزاری کا حق انفکاک بھی حاصل ہونا ضروری ہے بلکہ ان کے قوٰے اور سرمایے سے حتی المقدور کام لینے کے لیے جس چیز کی ان کو حقیقی ضرورت ہے وہ اپنی اپنی جاگیروں میں ہر قسم کے مطالبات سرکاری تو ادا کر لینے سے ان کا مستثنیٰ ہو جانا نہیں بلکہ ان کے واجب الادا رقوم کی مقدار ہمیشہ کے لیے متوسط اور غیر تغیر پذیر مقرر کر دینا ہی ہے چنانچہ بنگالے میں جہاں زمینداروں کے ساتھ دوامی بندوبست ستر سال قبل کیا گیا تھا اور جس کے بعد بندوبست کے طریق کار میں بھول چوک ہونے سے کسانوں کی حالت گری ہوئی سی ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود جب سے اب تک ملک کے تمول و خوشحالی میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے۔ ذیلی قابضان اراضی کے حقوق و اغراض کے متعلق ہماری موجودہ معلومات کے لحاظ سے ایسی غلطیاں اب وقوع میں نہیں آسکتیں۔"

"بنابرآں ملکۂ معظمہ کی حکومت نے تہیہ کر لیا ہے کہ انفکاک مالگزاری کا

اختیار انھیں مقدمات تک محدود رہیگا جن کا مذکور الصدر فقرۂ (۲۶) میں حوالہ دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تمام ہندوستان کے لیے دوامی بند وبست بھی منظور کرلیا ہے۔ پھر بھی یہ تصفیہ طلب ہے کہ اس تجویز کے نفاذ کے لیے موجودہ زمانے میں کن کن اضلاع کی حالت فی الواقع اس کی مستحق ہے"

سرچارلس وڈاور ارل دے گرے

جب سرجان لارنس بہ حیثیت وائسرائے ہندوستان آیا تو اس نے اپنے حسب معمول مستعدی کے ساتھ اراضی کے اس مسئلے کو تازہ کیا۔ اور مارچ ۱۸۶۴ء میں اس پر ایک یادداشت مرتب کی جس میں عام فہم الفاظ میں اس نے شمالی ہند اور اودھ و پنجاب میں دوامی بند وبست کی ترویج کے متعلق اپنی تجویز بیان کی۔

۲۴ مارچ ۱۸۶۵ء میں وزیر ہند سرچارلس وڈ نے اپنا جواب لکھا جس میں اس نے اضلاع ہند کو تین اقسام پر منقسم کیا:۔

(۱) وہ اضلاع جہاں زراعت کی حالت نہایت زبون و پست تھی۔

(۲) وہ اضلاع جہاں کاشت تو واجبی سی تھی لیکن وہ اور طرح ترقی یافتہ اور بالکل مکمل تھے۔

(۳) وہ اضلاع جہاں جاگیری اراضی کی کاشت واجبی سی تھی اور جاگیرداروں کی عام حالت بھی بہت کچھ ناقص تھی۔

اس نے یہ تصفیہ کیا کہ دو قسم کے اضلاع میں تو دوامی بند وبست کی فوری ترویج ہونی چاہیے مگر ایک قسم کے اضلاع کی حد تک اس سے انکار کر دینا چاہیئے۔ تیسری قسم کے اضلاع کے متعلق اس نے بیان کیا تھا کہ ملکۂ معظمہ کی حکومت "اس بات پر آمادہ ہے کہ ان تمام جاگیروں پر جہاں حقیقی کاشت جملہ رقبۂ کاشت یعنے رقبۂ مالگزاری کی اسّی فی صدی ثابت ہوتی ہے نظر ثانی کر لنے کے بعد وہاں دوامی بند وبست فوری کر لنے کی اجازت دیدی جائے" اور جن جاگیروں میں اس

پیمانے پر کاشت نہیں ہوتی ہے وہ ان کا بندوبست معمولی طریقے پر سی سالہ میعاد کے لئے مقرر کردیا جائے"

۲۴ اگست ۱۸۶۵ء میں وائسرائے نے باجلاس کونسل اپنی تمام اس مراسلت کو جو ذرائع آبپاشی کے سلسلے میں دوامی بندوبست کے مسئلے پر اس کے اور شمالی مغربی ممالک کی حکومت کے درمیان چلی تھی وزیر ہند کی خدمت میں پیش کردیا۔

۱۷ مارچ ۱۸۶۶ء میں وزیر ہند ارل دے گرے اینڈ رپن نے اپنا جواب قلمبند کیا جس میں اس نے شمالی مغربی ممالک میں دوامی بندوبست کرنے کے جو ہدایات حکومت ہند نے وہاں کے لفٹننٹ گورنر کے نام جاری کئے تھے ان پر اظہار پسندیدگی کیا اور صلاح دی کہ نہروں کے ذریعہ آبپاشی کرنے کا حسب ذیل قاعدہ مقرر کرنا مناسب ہوگا:۔

"یہ قاعدہ مقرر کردینا مناسب ہے کہ کسی ایسی جاگیر میں جہاں کا اثاثہ اگر موجودہ تجویز کے موافق نہروں سے پوری آبپاشی وہاں ہو جاتی تو عہدہ داران بندوبست و آبپاشی دونوں کی رائے میں موجودہ اثاثے سے ۲۰ فی صدی سے کچھ زیادہ ہوتا دوامی بندوبست نہ کیا جائے"

سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ

۲۳ مارچ ۱۸۶۷ء میں وزیر ہند سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ نے دوامی بندوبست کی ترویج کے متعلق ملکۂ معظمہ کی حکومت کے فیصلے کی توثیق کردی اور لکھا کہ "مالکان اراضی کے اغراض انگریزی حکومت کے قیام و ثبات کے ساتھ وابستہ کردینے کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے" ملکۂ معظمہ کی حکومت مالگزاری کے اضافے کی توقع سے بطور ایثار دست بردار ہونے پر آمادہ ہے۔ اس نے ترقی نایافتہ خطوں اور جاگیروں میں دوامی بندوبست پر ذیل کے دو قاعدے مقرر کرکے قیود لگادئیے۔

"اول اس جاگیر میں دوامی بندوبست نہیں کیا جائیگا جہاں حقیقی کاشت

جملہ رقبۂ کاشت بیسے رقبہ مالگزاری کی ۸۰ فی صدی سے کم ہو،،

"دوم۔ اس جاگیر میں دوامی بندوبست نہیں کیا جائیگا۔ جہاں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی رائے میں آئندہ بیس۲۰ سال کے اندر اندر نہروں سے آبپاشی شروع کردیجائیگی جس سے جاگیر کے موجودہ اثاثے میں ۲۰ فی صدی کا اضافہ ہونے کا امکان ہے،،

اس تجویز کی آخری نامنظوری

یہ معلوم کرنے کے لیے تحقیقات شروع کردی گئی کہ شمالی ہند کے کن کن اضلاع میں سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ کے شرائط کے موافق دوامی بندوبست کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں بعض ایسے مقامات کی اطلاع ملی تھی جہاں ان شرائط کے موافق دوامی بندوبست کرنے سے سرکار کو آئندہ نقصان ہوتا تھا۔ یہ کوئی نیا استدلال نہ تھا کیونکہ سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ کو پہلے ہی سے یہ معلوم تھا اور اس لئے ملکۂ معظمہ کی حکومت کا غور و خوض کے بعد یہ آخری فیصلہ سنا دیا تھا کہ "مالکان اراضی کے اغراض انگریزی حکومت کے قیام و ثبات کے ساتھ وابستہ کرنے کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے ملکۂ معظمہ کی حکومت مالگزاری کے اضافہ کی توقع سے بطور ایثار دست بردار ہونے پر آمادہ تھی"۔ لیکن جتنا جتنا امن کا زمانہ گزرتا گیا ویسے ویسے ایثار کرنے کی خواہش بھی کمزور ہوتی گئی اور ۱۸۶۷ء میں جن وجوہ کی پیش بینی کرلنے کے بعد ان کو نظر انداز کردیا گیا تھا ۱۸۶۹ء میں وہی وجوہ نہایت معتبر اور قابل التفات ہوگئے چنانچہ ۱۸۶۷ء میں ان ۲ دو قواعد کے علاوہ ایک تیسری۳ شرط بھی لگادی گئی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس وقت تک دوامی بندوبست ملتوی رکھنا چاہیے جب تک زمین کی مالیت میں اضافہ ہوتا رہے۔

روپیہ کی فرسودگی سے ایک اور مشکل اس وقت درپیش ہوی۔ اس کی بھی سر چارلس وڈ نے پیش بینی کی تھی لیکن واقف کاروں کی نظروں میں ۱۸۶۰ء کے دور کی ابتدا میں جیسی یہ مشکل پیش آئی تھی اس سے کہیں زیادہ جب ۱۸۷۰ء کے

دور کی ابتدا ہیں تھی اس لئے اس وقت دوامی بندوبست کا خیال ترک کردیا گیا۔

انجام کار آخری فیصلہ صادر ہوا۔ وزیر ہند نے اپنے مراسلہ نشان مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۸۳ء میں لارڈ کیننگ کی بیس سال قبل کی تجویز کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ گویا اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ اس مراسلہ میں تحریر تھا کہ "مجھ کو جناب والا کی حکومت سے اتفاق ہے کہ جو حکمت عملی ۱۸۶۲ء میں مقرر کی گئی تھی اس کو باضابطہ طور پر اب ترک کردینا ہی مناسب ہے۔"

قصۂ مذکور کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں دوامی بندوبست کی تجویز کو آخری دفعہ نامنظور کرلینے کی وجہ اثنائے تحقیقات میں کسی نئی بات کا معلوم کرنا نہ تھا بلکہ حکومت کی حکمت عملی کے اصل منشا میں تغیر ہوگیا تھا۔ اس تجویز کا پہلا منشا تو یہ تھا کہ قوم کی مادی حالت کو ترقی دیجائے۔ لارڈ لارنس کے الفاظ میں "اراضی کی شکل میں شغل زر کے لئے لوگوں کو ہمت دلائی جائے۔" "ہندوستان میں ایک متوسط طبقہ کا بتدریج نشو ونما کیا جائے۔ اجتماع دولت اور ذرائع تمول کو فروغ دینے کا رعایا کو موقع دیا جائے جن سے حوادث زمانہ امساک باران وخشک سالی وعام مصیبت وآفت میں رعایا کو بہت بڑی مدد ملے۔ ان نیک نیت مقاصد کو منتظمین مملکت کی نئی نسل نے بالکل ہی نظر انداز کردیا۔ سکھوں کی جنگ اور غدر کے سالہائے مابعد میں ملکۂ معظمہ کی حکومت سر سٹیفرڈ نارتھ کوٹ کے الفاظ میں "مالکان اراضی کے اغراض انگریزوں کی حکومت کے قیام وثبات کے ساتھ وابستہ کردینے کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے" مالگزاری کے اضافہ کی توقع سے بطور ایثار دست بردار ہونیکی خواہاں تھی۔ لیکن اسکے بعد کئی سال امن کے ساتھ گزر گئے اور ملکۂ معظمہ کی حکومت کے ساتھ اہل ہند کی عقیدت ووفاداری سے اس خواہش کو تقویت ہونیکے بجائے اُس کو تضعیف ہوگئی اسکے علاوہ ۱۸۸۳ء میں ربع صدی کے امن وامان کے بعد ایثار کرنا کچھ ایسا ضروری بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا جبکہ ایک قوم کی وفاداری کی ایسی بدتر جزا ملی ہو یا کسی قوم کی امن پسندی کے باعث وہ برکت صاف طور پر اس سے واپس لے لی گئی ہو جسکا وعدہ مصائب کے نازک وقت میں اس سے کیا گیا تھا۔ ایک حکومت کیلئے قوم کو ایسا سبق پڑھانا اور ایک قوم کے لیے ایسا سبق سیکھنا بہت ہی برا ہے۔

پانچواں باب

ممالک متوسط میں بندوبست اراضی

ملک کا وہ وسیع خطہ جو ممالکِ متوسط ہند کے نام سے مشہور ہے تقریباً نوے ہزار مربع میل کا رقبہ اور نوے لاکھ سے زیادہ آبادی رکھتا ہے۔ مرہٹوں کی آخری جنگ میں جو ۱۸۱۷ء میں وقوع میں آئی راجہ ناگپور کے لشکر نے سیتا بلدی پر انگریزی فوج پر حملہ کیا لیکن کئی جانوں کے نقصان کے ساتھ راجہ کے لشکر کو ہزیمت ہوئی۔ راجہ نے اپنی باغی فوج سے بالکل بے تعلقی ظاہر کی اور انگریزوں کو ساگر اور نربدا یہ دونوں علداریاں تفویض کر کے (اپنی) دوستی کا استحکام کیا اس طرح ۱۸۱۸ء میں ساگر اور نربدا کی علداریاں انگریزوں کے زیرحکمرانی آئیں۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۴۹ء میں سنبھلپور کے راجہ کے لاولد فوت ہونے پر اس علاقے کا الحاق کر لیا اور ۱۸۵۳ء میں ناگپور کے راجہ کی وفات پر اس کے متبنیٰ کے حقوق کو نظرانداز کر کے ناگپور کا بھی الحاق کر لیا۔ ان تمام مذکورہ علداریوں کو بہ استثنائے سنبھلپور لارڈ کیننگ نے نومبر ۱۸۶۱ء میں ایک ہی نظم ونسق کے تحت کر دیا اور اس وقت سے ان کا نام ممالک متوسط ہو گیا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں سنبھلپور بھی ان میں شامل کر دیا گیا۔ یہاں

ان علیحدہ علمداریوں کے ابتدائی نظم ونسق کے متعلق یعنے سنہ ۱۸۶۱ء اور سنہ ۱۸۶۲ء میں انکے باہمی متحدہ ہونے سے قبل کی حالت کے متعلق کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ساگرا ور نربدا کی علمداریاں

سنہ ۱۸۱۸ء میں جب ساگر اور نربدا کی علمداریاں پہلی دفعہ انگریزوں کے زیر حکمرانی آئیں تو اوّل اُن کو حکومت ہند کے براہ راست تحت میں رکھا گیا مگر بعد کو شمال مغربی ممالک کے لفٹننٹ گورنر کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ پھر سنہ ۱۸۴۲ء میں ان ممالک کو ایک وکیل سلطنت کے تحت کر دیا گیا جو حکومت ہند کو براہ راست جواب دہ تھا لیکن زمانۂ مابعد میں ان ممالک کی حکومت دوبارہ شمال مغربی ممالک کے لفٹننٹ گورنر پر منتقل کر دی گئی اور سنہ ۱۸۶۱ء کے اتحاد ممالک (یا صوبجات) تک یہی حالت برقرار رہی۔

ساگر اور نربدا کی علمداریوں کا ابتدائی نظم ونسق کامیاب نہ رہا۔ انگریز منتظمین سے یہاں وہی غلطی سرزد ہوئی جو ان سے مدراس وغیرہ میں سرزد ہوئی تھی۔ اراضی پر سنگین محصول لگا دیا اور ایک ناممکن الوصول رقم مالگزاری کا مطالبہ ہونے لگا۔ رعایا مفلس و نادار بن گئی اور ملک کی ترقی موقوف ہو گئی۔ بعد کو جب اس غلطی کا انکشاف ہوا تو نہایت پرزور الفاظ میں اس کو برا ٹھیرایا گیا۔

اضلاع ہوشنگ آباد و سیونی۔ سنہ ۱۸۲۱ء میں سب سے پہلے جو پنج سالہ بندوبست ہوشنگ آباد و سیونی میں کیا گیا وہ "غالباً سب بندوبست سے بدترین تھا"۔ میجر مکفرسن کو ایک غیر آباد ملک اور مفلس و پست ہمت رعایا کے ساتھ سابقہ تھا۔ اس کو ان پانچ سال میں اس قدر ترقی و اصلاح کی توقع تھی جو پچاس سال میں بھی نہیں ہو سکتی تھی .... بہت جلد ظاہر ہو گیا کہ محصول اراضی کے تعین میں بہت کچھ مبالغے سے کام لیا گیا تھا اور وہ وصول ہی نہیں ہو سکتا تھا .... پھر بھی میجر مکفرسن نے ہوشنگ آباد کی رعایا کو کوڑے لگا کر اور سیونی کی رعایا کو درّے اور تازیانے کی سزا دینے سے بھی دریغ نہ کیا"۔

۱۸۲۱ء میں جتنے رقبے پر میجر مکفرسن نے ۱۰۳۵۹ پونڈ مالگزاری مقرر کردی تھی اسی رقبے پر زمانہ سابقہ میں مرہٹوں کی حکومت نے صرف ۲۲۰۷ پونڈ مالگزاری مشخص کی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں ایک اور پنج سالہ بندوبست کیا گیا اور مالگزاری مزید اضافے کے بعد ۱۳۰۰۷ پونڈ مقرر کردی گئی جو مرہٹوں کے مطالبے سے ہفت گونہ زیادہ تھی۔ مطالبے کی اتنی کثیر رقم کبھی وصول نہیں ہوسکتی تھی اس لئے بہت سی معافیات کرنی پڑیں" لیکن معافیات کافی نہیں ہوئی تھیں اور ہر صورت سے محاصل وصول کرنے کی کوشش ہو رہی تھی چنانچہ ان بے رحمیوں اور اذیتوں کی یاد زمینداروں کے دلوں میں آج تک بھی تازہ ہے"۔

تیسرے پنج سالہ بندوبست میں بھی حق رسی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۳۶ء میں بست سالہ بندوبست کسی قدر تخفیف جمع کے ساتھ عمل میں آیا مگر پھر بھی یہ جمع مرہٹوں کے مطالبے سے تقریباً سہ چند زیادہ تھی۔

ضلع نرسنگ پور۔ پہلے پندرہ سال تک نرسنگ پور میں جو کارروائی ہوئی وہ ایسی ہی نامناسب تھی جیسی سیونی اور ہوشنگ آباد میں ہوئی تھی۔ "یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہمارے نظم ونسق کے ابتدائی پندرہ سال اسی مسلسل جدوجہد میں گزرے تھے کہ زرعی جماعت کو تقویت دی جائے تاکہ مطالبۂ مالگزاری کے ناقابل برداشت دباؤ سے اس جماعت میں کہیں انتشار پیدا نہ ہو جائے۔ ہمارے اوائل کے بندوبست مرہٹوں کے آخری زمانے کی جمع پر مبنی تھے حالانکہ اس جمع میں مرہٹوں کے غیر معمولی وقتی آزمائش کے مصارف کا بار گراں بھی شامل تھا۔ اسی وجہ سے جب ہمارے عہدہ داروں نے ایسی غیر صحیح جمع پر بندوبست کے مبنی ہونے کی پروا نہ کرکے وصول میں سختی شروع کردی تو سب شیرازہ بکھر گیا اور جمع کی نامناسبت اس سے ظاہر ہونے لگی کہ متعدد گاؤں رعیت فرار ہو جانے سے بے چراغ ہو گئے"۔

پہلی جمع ۶۶۷۶۹ پونڈ تھی۔ اس کا نتیجہ بُرا نکلا اور "مالگزار" تباہ حال ہو گئے۔ رعیت کو کثیر معافیات دینی پڑیں۔ ۱۸۱۳ء اور ۱۸۲۳ء کے سہ سالہ بندوبست کے وقت جمع میں بڑی تخفیف بھی کرنی پڑی۔ ۱۸۳۶ء کے بست سالہ بندوبست میں تو ۱۳۳۱۵ پونڈ کی تخفیف عمل میں آئی۔

ضلع داموہ ۔ اس ضلع میں بدنصیبی سے ۱۸۳۵ء میں جو بست[20] سالہ بندوبست کیا گیا اس میں بمقابلہ سابقہ قلیل المیعاد بندوبستوں کے جمع میں اضافہ کر دیا گیا چنانچہ یہ جمع ۳۰۱۴۱ پونڈ مقرر کر دی گئی " اس بندوبست پر کئی " مالگزار" اپنے پٹوں سے دست بردار ہو گئے اور صرف مصمم تدابیر اختیار کرنے سے یہ مشکلات رفع ہوئی .... یہاں اراضی کی یہ حیثیت ملک کچھ قدر نہیں رہی تھی بیسیوں گاؤں سالہا سال سے خالصہ کے زیر انتظام تھے "۔

ضلع ساگر ۔ اس ضلع میں بھی قلیل المیعاد بندوبستوں کے بعد جب طویل المیعاد بندوبست عمل میں آیا تو اس وقت جمع میں کوئی کمی نہیں کی گئی ۔

" مطالبۂ سرکار رعایا پر وہ بارسنگین ہے کہ اس سے حوصلے پست ہو گئے ہیں اور اصلاح و ترقی کی ذرہ برابر بھی اب کوشش نہیں کی جاتی ۔ میں نے بذات خود اس کا اطمینان کر لیا ہے کہ مطالبۂ سرکار بعض گاؤں میں خام لگان سے بھی زیادہ ہے ۔

" لوگوں نے اس درجے ہمت ہار دی ہے کہ بعض مثالیں ایسی بھی تھیں جہاں آبائی حق مالکانہ رکھنے والے حقیقی مالکان اراضی نے قصبات پر حقوق مالکانہ کسی شرط پر بھی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا ۔

" ضلع کے اس حصے میں اس گوشے سے اس گوشے تک جو مصیبت و آفت بپا ہے وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے ۔ بالخصوص وہموفی میں اور بینیکا پٹنے کے کچھ حصے میں ۔

" ان خطوں کا معائنہ کرنے کے بعد میرے دل پر جو اثر ہوا وہ یہ تھا کہ گویا ان پرگنوں کی ساری آبادی یکایک تہ خاک ہو گئی ہے کیونکہ یہ ایسا سنسان ویرانہ نظر آتا تھا جہاں انسان تو انسان پرندہ تک پر نہیں مارتا تھا "۔

" انگریزوں کی نصف صدی تک حکمرانی کے بعد ساگر کی جو صورت حال ہوئی اس کو حکومت ہند نے پرزور لفظوں میں بالکل ناموم قرار دیا ۔ اور لکھا کہ " ۱۸۳۴ء میں بھی بست[21] سالہ بندوبست کی جمع مبنی بر اعتدال نہیں سمجھی جا سکتی تھی اور اس سے اتنے فوائد حاصل نہیں ہوئے تھے ۔ جتنے اس عملداری کے اور

اضلاع میں ہوئے تھے۔ ہر شخص کے لگان میں بہت بڑی تخفیف کی گئی جس سے مجموعی جمع میں بھی تخفیف ہوگئی۔ یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ حکومت وقتاً تخفیف کی ضرورت کی طرف اصرار کے ساتھ توجہ دلاتی رہی لیکن مقامی حکام نے تعمیل احکام میں بڑی کوتاہی کی اور مراعات بھی کیں تو بہت ہی خفیف۔ لگان میں تخفیف اگر بروقت کردی جاتی تو اغلب تھا کہ اس ضلع کی حالت پہلی سی پھر ہو جاتی۔"

وزیر ہند نے لندن سے لکھا تھا کہ "ہندوستان کے اس حصے سے سابق میں جتنی رپورٹیں وصول ہوئی ہیں انمیں سب سے زیادہ اس رپورٹ سے بے انتہا جمع مقرر کردینے کی وہ سب خرابیاں ظاہر ہوتی ہیں جو اس ضلع کے انگریزوں کے زیر حکومت آنے کی تاریخ سے آج تک وہاں رونما ہوئی ہیں۔"

انگریزی حکمرانی کے ابتدائی دہ سالہ دور میں ساگر اور نربدا کی عملداریوں کی جو حالت تھی وہ مذکورالصدر اقتباسات سے خوب ظاہر ہوتی ہے۔ اوائل میں قلیل المیعاد بندوبست اور سنگین جمع کا قاعدہ پڑ گیا تھا اور رابرٹ مارٹنز برڈ ہی جو شمالی ہند کے بندوبست اراضی کا بانی مشہور ہے پہلا شخص تھا جس نے ۱۸۳۴ء میں طویل المیعاد بندوبست کی ترویج پر اصرار کیا اور ایک زوردار رپورٹ ان عملداریوں کی افسوسناک حالت پر جو "مسلسل بے انتہا محاصل کو عارضی وسائل سے سنبھال رکھنے کے لئے مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھی" لکھ کر پیش کی۔

رابرٹ مارٹنز برڈ کی عام رپورٹ۔ برڈ نے لکھا تھا کہ "کہا جاتا ہے کہ بے انتہا دغابازی اور تخمین شروع ہوگئی ہے اور کاشتکاروں کو شاذ ہی ان محاصل سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے جن سے حکومت نے ان کی خاطر دست بردار ہونا قبول کر لیا تھا بلکہ الٹے ان کاشتکاروں کو اپنے حتی المقدور لگان ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اس طرح کی بداخلتی بھی شروع کردی گئی ہے کہ لوگوں کا اعتبار بھی جاتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اراضی سے اپنا سرمایہ ہٹا لیا۔ بقالوں کے گوداموں کو کھول کر زبردستی ان میں سے

اناج نکال لیا جاتا ہے اور تقاویوں کو اُس کی قیمت ادا کیے بغیر کاشتکاروں کو بیج کے لئے دیدیا جاتا ہے اور بعد کو اس لوٹے ہوئے اناج کو انھیں واپس دلانے میں اُن کی کچھ مدد بھی نہیں کی جاتی۔

"بیان کیا گیا تھا کہ اناج یوں لوٹ کر اُن کاشتکاروں کو دیا گیا تھا جنکی امداد کرنے سے ساہوکاروں نے ان کی پچھلی دغابازیوں اور وعدہ خلافیوں کے تجربے کے بعد صاف انکار کر دیا تھا۔ اگر اصلدار زراعت پیشہ لوگوں کے خلاف حکم قرقی حاصل کریں بھی تو نہ مزارعین کو قید کیا جا سکتا تھا اور نہ ان کے مویشی فروخت کیے جا سکتے تھے کیونکہ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس طرح عدالت کے حکم کی تعمیل کرنے سے اراضی بے کاشت پڑی رہے گی۔ اس نظام کی ذرا ذرا سی تفصیل یہاں بیان کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اتنا کہدینا کافی ہے کہ خود دیسیوں نے جو کچھ کھلا کھلا بیان کیا تھا اور جس سے یورپی عہدہ دار بھی انکار نہیں کر سکتے تھے اس سے بخوبی ثابت ہوتا تھا کہ ایک بے اندازہ سنگین جمع کو کسی حال قائم رکھنے کی بے سود توقع اور تفصیلی انتظام کرنے کا عملی تجربہ اور مہارت رکھنے کے غلط خیال کی بناء پر لوگوں کے ذاتی معاملات اور خانگی انتظام میں شرارت سے مداخلت کرنے کا ایک نظام قائم کیا گیا تھا جو عام طور پر پھیلا ہوا تھا"۔

اس رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد حکومت ہند کے زیر حکم ان عملداریوں میں لسنت سالہ بندوبست عمل میں آیا مگر قارئین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اس طویل المیعاد بندوبست سے بعض اضلاع میں تو تخفیف جمع ہوئی تھی جس سے رعایا کے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہوا تھا لیکن بعض اضلاع میں ایسا نہیں ہوا کیونکہ مقامی عہدہ داروں کا مطمح نظر و اصول کار یہی تھا کہ جس قدر رقم مالگزاری اراضی سے وصول ہو سکتی تھی وہ وصول کی جائے۔ ۱۸۶۱ء تک جب کہ ممالک متوسط کا جدید نظم و نسق قائم ہوا اس طویل المیعاد بندوبست کو بونہیں قائم رہنے دیا گیا۔

ریاست ناگپور

یہ ریاست بھونسلہ خاندان کے مرہٹہ حکمرانوں کے زیرنگین ۱۷۴۳ء سے

۱۸۵۳ء تک یعنے نو سال سے کچھ زیادہ رہی تھی۔ لیکن اسی دور میں راجہ کی کمسنی کے زمانہ میں یہ ریاست ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۰ء تک یعنے بارہ سال انگریز عہدہ داروں کے بھی زیر انتظام رہی۔ انگریز منتظمین نے یہ غلطی کی کہ مالگزاری کے اضافے کو اپنے نظم ونسق کے بہتر اور کارفرما ہونے کی علامت سمجھ لیا۔ بارہ سال کی مدت میں اس ریاست کی مالگزاری میں بہت کچھ اضافہ کر دیا گیا۔ اور چندا نامی ایک ضلع میں تو جمع دوچند ہو گئی تھی۔ راجہ کے سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد جب اس ریاست کی زمام حکومت راجہ کے ہاتھ میں دیدی گئی تو اس وقت وہاں کی مالگزاری ۲۳۰۰۰۰ پونڈ ہو گئی تھی۔ راجہ کا نظم ونسق ایسا زور دار و زبردست نہ تھا جیسا انگریزوں کا تھا اور یہ معلوم کرنے سے ہمیں اطمینان سا ہوتا ہے کہ ۱۸۵۳ء میں راجہ کی وفات تک مالگزاری کی رقم گھٹکر ۲۲۴۱۷۰ پونڈ رہ گئی تھی۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے اس ریاست کا الحاق کر لیا۔

اس نو ملحقہ ریاست میں ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۱ء تک یعنے ابتدائی آٹھ سال تک نظم ونسق کچھ کامیاب نہیں رہا۔ قلیل المیعاد بندوبست سے نہ رعایا کی خوشحالی اور نہ سرکار کی مالگزاری میں کچھ اضافہ ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں اس ریاست کو دوسرے ملحقہ اضلاع میں شامل کر کے ممالک متوسط قایم کیے گئے۔

ریاست سنبھلپور

صدیوں سے اس ریاست پر چوہان راجپوتوں کے ایک شاہی خاندان کی حکومت تھی۔ چوہان راجپوت وہ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی فتح ہند سے قبل ہندوستان کے کئی اقطاع پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ ایک مختصر سے وقفے کے بعد ۱۸۱۷ء میں انگریزوں کے زیر اثر چوہان شاہی خاندان کے ایک رکن کو اس ریاست کی گدی واپس دے دی گئی تھی اور اس ریاست پر حکومت بنگالہ کی باضابطہ نگرانی قائم کر دی گئی تھی۔ اس ریاست کی مالگزاری تقریباً ۱۰۰۰۰ پونڈ تھی۔

آخری راجہ کے لاولد فوت ہو جانے پر لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۴۹ء میں اس

ریاست کا الحاق کر لیا اور ۱۸۶۲ء تک یہ ریاست حکومت بنگالہ کے زیر انتظام رہی چنانچہ جب ۱۸۶۱ء میں ممالک متوسط کے لئے ایک علیحدہ نظم و نسق قائم کیا گیا تو اس وقت سنبھالپور ان ممالک میں شامل نہ تھا بلکہ بنگالے ہی کے زیر تسلط تھا۔ آخر کار ۱۸۶۲ء میں جب یہ ریاست ممالک متوسط میں شامل کر دی گئی تو اس کے بعد سے چند سال تک ایک دعوی دار ریاست کی وجہ سے وہاں ہنگامہ بپا رہا۔ اسی لئے ممالک متوسط میں ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۷ء میں بڑے پیمانے پر جو بندوبست ہوئے ان میں ضلع سنبھالپور شامل نہ تھا اور آج تک بھی وہاں کا نظام اراضی ممالک متوسط کے اور اقطاع سے بالکل مختلف ہے۔

ممالکِ متوسط کا قیام

۲؍نومبر ۱۸۶۱ء میں لارڈ کیننگ نے ممالک متوسط کے نظم و نسق کے قیام کی تحریک قلمبند کی جس سے دو ایک اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:-

"صوبۂ ناگپور اور ساگر و نربدا کی عملداریوں کے انتظامات کا مسئلہ گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے اب تک زیر غور رہا اور اب یہ تحریک منظور کی جاتی ہے کہ ایک ہی مرکزی اقتدار کے تحت ان مختلف ریاستوں کو لایا جائے کیونکہ اس کا وقت آگیا ہے۔"

"چونکہ گورنر جنرل اور اس کی کونسل کی یہ رائے ہے کہ (۱) ساگر و نربدا کی عملداریوں کا انتظام آئندہ سے شمالی مغربی ممالک کے ملحقات کی طرح رہنا نامناسب ہے اور ان کے لئے ایک علیحدہ نظم و نسق مستقل نوعیت کا قائم کرنا ضروری ہے اور (۲) ان عملداریوں کو صوبۂ ناگپور میں شامل کر کے ان سب کو ایک ہی مقامی حکومت کے زیر انتظام کر دینے سے ذرائع تمول کی ترقی اور اس رقبے کے ارتقا کے لئے بہت ہی مفید ہو گا اس لئے یہ تحریک منظور کی جاتی ہے کہ صوبۂ ناگپور اور ساگر و نربدا کی عملداریوں کے لئے ایک علیحدہ چیف کمشنری قائم کی جائے جس کا لقب ممالک متوسط کی چیف کمشنری ہو۔"

اپریل ۱۸۶۲ء میں ممالک متوسط میں ضلع سنبھالپور شامل کر دیا گیا اور مئی ۱۸۶۴ء میں ضلع نمار اور مئی ۱۸۶۵ء میں بیجراگوگڑھ بھی۔

کرنل اپلیئٹ نامی ایک نہایت ہی مسن اور از کار رفتہ شخص کا اس چیف کمشنری پر پہلی دفعہ تقرر کیا گیا لیکن اس کے رخصت پر جانے کے بعد اس کو اس خدمت سے ہٹا کر رچرڈ ٹمپل کا اس پر تقرر کیا گیا اور ٹمپل نے ۱۸۶۶ء تک اس صوبے پر حکومت کی۔ سر رچرڈ ٹمپل نے شمالی ہند کے مشہور منتظم مالگزاری اور حکمران مسمی ٹامسن کے تحت ابتدا میں کام سیکھا تھا۔ جلیس نظم ونسق اور لارنس کے تحت بھی پنجاب میں خدمت بجالائی تھی اور اب اس کو موقع ملا کہ اس جدید طور پر قائم کیے ہوئے صوبے میں آپ کو ایک قابل اور ہمدرد حکمران ثابت کر کے شہرت پیدا کرے۔ زمانہ بھی اس کے موافق تھا۔ ملکہ کی حکمرانی کے ابتدائی دس سال تک ہندوستان کے ساتھ قدر شناسانہ ہی نہیں بلکہ فیاضانہ برتاؤ کرنے کی متقدر اشخاص کو خواہش تھی اور کیننگ اور لارنس اور سر چارلس وڈ اور سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ کے سے لوگ رعایا کی مادی حالت کی اصلاح اور برطانوی حکومت کی طرف سے ان میں عقیدت و خلوص پیدا کرنے پر زور ڈال رہے تھے۔

بندوبست دوامی کی تجویز

جس زمانے میں مسٹر ٹمپل اپنی نئی خدمت پر مامور تھا کرنل بیرڈ اسمتھ کے دوامی بندوبست مالگزاری کی تجویز جس کا ذکر پچھلے باب میں کیا گیا ہے غور کے لئے مسٹر ٹمپل کے ملاحظہ میں پیش ہوئی۔ یہ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رچرڈ ٹمپل نے اس تجویز کی دل سے تائید کی اور اس نے حکومت ہند کو جو جواب دیا چونکہ وہ بہت طویل نہیں اس لئے من وعن یہاں نقل کر دیا جاتا ہے۔

"آپ کے مراسلہ نشان ۳۰۳۰ مورخہ ۷ / اکتوبر ۱۸۶۱ء اور ایک بعد کے مراسلہ نشان ۱۴۷۴ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۶۲ء کا (جس میں دوامی بندوبست مالگزاری کے مسئلے پر کرنل بیرڈ اسمتھ نے اپنی قحط کی رپورٹ کے (۶۲) فقرے سے

(۲۰۰) فقرے تک بحث کی ہے نیز جن مقامات میں بندوبست فی الوقت اس نوعیت کے ہیں کہ وہ دوامی نہیں کیے جا سکتے وہاں طویل المیعاد بندوبست کرنے کے لیے قانونی منظوری حاصل کرنے کی ضرورت پر چیف کمشنر کے قایم مقام کی رائے دریافت کی گئی تھی اب تک کوئی جواب ادا نہو سکا۔ یہ مسئلہ بہت اہم تھا اور حال میں ان ممالک کے نظم و نسق میں جو تغیرات کیے گئے تھے ان میں مصروف رہنے کی وجہ سے میں اس مسئلے پر جیسی چاہیئے ویسی توجہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اب چیف کمشنر کے قایم مقام نے ممالک متوسط میں مشمولہ اضلاع کے خاص حالات کے لحاظ سے اس مسئلے پر خوب غور و خوض کر لیا ہے اور اپنی رائے پیش کرنے پر تیار رہے اس لیے حسب ذیل رپورٹ پیش کرنے کی اس نے مجھ سے خواہش کی ہے۔

”۲۔ سب سے پہلے چیف کمشنر کے قایم مقام کا یہ کہنا ہے کہ یہ بیان کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اور مقامات کی طرح یہاں بھی دوامی بندوبست کا اثر صرف مالگزاری ہی پر پڑے گا اور مالگزاری کی رقم ہمیشہ کے لئے متشخص کردی جائے گی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اراضی پر براہ راست جو مطالبۂ سرکار ہوتا ہے اس کی مستقل اور دوامی ایک حد مقرر کردی جائے گی۔ اس سے لوگوں کی ملکیت اراضی اور ان کے اساسی حقوق پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ملکیت اور حقیت کی بلا قید و شرط ایک ناقابل تغیر شکل علیحدہ مقررہ کردی جائے گی خواہ محصول اراضی کی ایک ہی رقم ہمیشہ کے لئے مقررہ کردی جائے یا نہ کردی جائے۔ البتہ ایسی ملکیت اور حقیت کی قدر و قیمت بندوبست کے لحاظ سے کہ وہ قلیل یا طویل المیعاد یا دوامی ہے کم و بیش ہو گی لیکن ہر حالت میں ملکیت اور حقیت کی اصل نوعیت اور حقیقت یکساں رہے گی اور اس میں سر مو فرق نہو گا۔

”۳۔ مذکور الصدر معنی میں دوامی بندوبست کا اصل اصول دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی صادق آتا ہے۔ مزارعین کی حرفت۔ فراخ حوصلگی اور بر خود اعتماد کرنے اور اجتماع دولت نیز سرمایہ سے کام لینے غرض ان سب امور میں اس سے ایک نئی حرکت پیدا ہو جائے گی جس کا فی الحال پورا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں مالگزاری کی ایک واجبی رقم مقرر کردی جائے گی وہاں

دوامی بندوبست کو رعایا بہت بڑی برکت سمجھے گی۔ ایک طرف تو بیشک سرکار مالگزاری
میں آئندہ اضافہ کرنے کے حق سے دست بردار ہو کر اس حد تک نقصان گوارا کرلیگی
مگر دوسری طرف محاصل کے جملہ شعبہ جات میں بہ سرعت نہ سہی تو بہ تدریج توفیر
ہونے سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ محاصل کے ان شعبہ جات کا انحصار
رعایا کے عام طبقات میں خوش حالی اور تموّل پھیلنے ہی پر ہے اور خوشحالی و تمول
پھیلانے کا بہترین ذریعہ بمقابل کسی اور مختص تدبیر کے دوامی بندوبست ہی ہے۔ اس
سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مالگزاری کے بہ استثناء محاصل سرکاری کی دوسری مدّات میں
دوامی بندوبست سے اضافہ ہو جائے گا۔ ان ممالک میں ایک ثلث سے زیادہ
آمدنی مالگزاری کو چھوڑ کر دوسرے محصولات کی وصولات سے ہوتی ہے اور
ایک مالگزاری ہی اپنے حال پر قائم رہے تو کیا دوسرے محصولات میں تو اضافہ
ہو گا۔ محاصل سرکاری کے نقطۂ نظر سے ایک ایسی تدبیر کی کامیابی کے متعلق کچھ خدشہ
نہیں جس کے اختیار کرنے سے صرف مالگزاری ہی محدود رہے گی مگر دوسرے سب
محصولات میں تو اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ ان
ممالک میں اس سرے سے اس سرے تک زر کی قیمت گھٹتی جائے گی اور پیداوار
کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس طرح مزارعین کو تھوڑے ہی عرصے
کے بعد پیداوار کے معاوضے میں اس قدر ملنے لگے گا کہ اس سے پہلے ان کو کبھی نہیں
ملا تھا ساتھ ہی ساتھ محنت کی اجرت بھی زیادہ ہو جائے گی جس سے سرکاری
مصارف میں بہت کچھ اضافہ ہو جائے گا۔ تمام تنخواہوں میں یا کم سے کم مواجب
اہل عملہ کی تنخواہوں میں بتدریج اضافہ کیا جائے گا اور تعمیرات عامّہ کے کاموں
کی لاگت بھی بہت بڑھ جائے گی بادی النظر میں مصارف کی بیشی کی توقع رکھ کر
مالگزاری کو جو حکومت کا سب سے بڑا ذریعۂ آمدنی ہے محدود کر دینا خطرناک
معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ گھاٹ پار اترنے کے لئے دوسرے محصولات
کے اضافے پر بھروسہ رکھنا کافی ہے۔ دوامی بندوبست سے بالکل قطع نظر کر کے
کرنل ایلیٹ اور مسٹر ٹمپل نے اپنی مشترکہ رپورٹ میں بیان کیا تھا کہ "بجائے
محاصل اراضی کے متفرق محصولات ہی سے توفیر ذرائع آمدنی کی آئندہ توقع

کی جاسکتی ہے"۔

۹۴۔ بنا براں دوامی بندوبست جہاں تک بھی کیا جاسکتا ہے ایک تو وہ رعایا کے حق میں مفید ہوگا اور دوسرے خود سرکار کے حق میں بھی سودمند ہوگا۔ تصفیہ کے لئے اب یہ سوالات رہتے ہیں کہ دوامی بندوبست کس حد تک کیا جاسکتا ہے؟ اور کب کیا جاسکتا ہے؟ یہ بھی ہمیشہ کے لئے ملحوظ رہے کہ ان ممالک میں ریلوں، سڑکوں اور جہازرانی سے یقیناً تغیرات عظیم پیدا ہو سکتے ہیں لیکن آبپاشی سے اس قلیل کے نتائج یہاں مرتب ہونے کی توقع نہیں۔ آیندہ کی یہ امیدیں یہاں بھی کم وبیش وہی ہیں جو ہندوستان کے دوسرے سب اقطاع میں ہیں۔ اس لئے اگر مادی اصلاح وترقی کی توقعات دوامی بندوبست کی مراعات عطا کرنے کے کہیں اور مانع نہیں تو یہاں بھی نہیں ہو سکتیں۔ جہاں تک ریلوے، سڑکوں اور جہازرانی کا تعلق ہے ممالک متوسط بھی دوامی بندوبست کے فوائد سے مستفید ہونے کے اتنے ہی مستحق ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے ممالک ہیں۔ علاوہ ازاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان ممالک میں بہت سی قابل کاشت اراضی افتادہ ہے اور اگرچہ یہ صورتِ حال کم وبیش سب جگہ موجود ہے مگر یہاں خاص طور پر یہ بہت زیادہ ہے۔ نہ صرف قابل کاشت اراضی کے ایسے وسیع خطے افتادہ حالت میں موجود ہیں جن کے لوگ دعویدار بھی ہیں مگر ان کا دعویٰ ایک مشکوک استحقاق کی بناء پر گول مول اور بے سروپا معلوم ہوتا ہے بلکہ اکثر جاگیروں اور گاؤں کے اندرون حدود بھی قابل کاشت وسیع اراضی افتادہ اور کس مپرسی میں پڑی ہوئی ہے۔ اگرچہ افتادہ اراضی کو کام میں لانے کے لئے دوامی بندوبست میں جو وجہ ترغیب موجود ہے وہ اس کی نہایت ہی مفید صورت ہے بااین ہمہ سرکار کے حق میں انصاف یہی ہے کہ ان مراعات کو اعتدال کی حد تک ہی رکھا جائے۔ یہ درست ہے کہ جس جاگیر میں دوامی بندوبست ہو چکا ہے اس میں توسیع کاشت کے لئے افتادہ اراضی کی ایک واجبی گنجائش چھوڑ دینی چاہیئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ ایک ایسی جاگیر میں دوامی بندوبست کر دیا جائے جس میں ایک بہت وسیع یا غیر محدود بنجر رقبہ بھی شامل ہو جس کو قابل کاشت بنانے کا مالک اراضی کو سر دست